عصمت چغتائی نمبر
منتخب افسانے اور مکمل
ضدّی
6/-

شاہکار افسانہ نمبر

پاکستان کے مایہ ناز افسانہ نگاروں کی تازہ، توانا، تابناک کہانیاں جو وطنِ عزیز کی خوشبو پوری انسانیت تک پہنچا سکتی ہے۔ قافلہ ڈائجسٹ کا "شاہکار افسانہ نمبر" ۱۵ر مارچ کو آرہا ہے۔ جس شمارے میں اتنے بڑے ادیب یکجا ہو رہے ہوں، وہ خصوصی اور یادگار شمارہ کیوں نہ ہوگا۔

آغا بابر	رحمان شاہ عزیز	محمد منشا یاد
احمد ہمیش	رخسانہ صولت	مرزا حامد بیگ
احمد ندیم قاسمی	رشید امجد	مسعود مفتی
احمد داؤد	رضیہ فصیح احمد	مسعود اشعر
اختر جمال	سلیم اختر	مشتاق قمر
اسد محمد خان	سائرہ ہاشمی	مظہر الاسلام
اسلم سراج الدین	سید قاسم محمود	ممتاز مفتی
انور سجاد	صادق حسین	منصور قیصر
انتظار حسین	ضیا بٹ	میرزا ادیب
تصدق حسین خسرو	طاہر نقوی	نجم الحسین رضوی
خالدہ حسین	فریدہ حفیظ	یونس جاوید
ذکا الرحمٰن	فردوس حیدر	مرتبہ : محمد منشا یاد

قافلہ ڈائجسٹ پندرہ مارچ کو پیش کر رہا ہے

افسانوی تحریک

مکتبہ شاہکار نے مختصر افسانے کی ترویج کے لیے ایک جامع تحریک کا پروگرام بنایا ہے جس کے تحت "قافلہ" کا ایک شمارہ اس مقصد کے لیے وقف کیا جا رہا ہے۔ دُنیا کی ہر زبان کے مانے ہوئے مندرجہ ذیل ادیبوں کے شاہکار افسانوں پر ہر ماہ ایک ایک خصوصی نمبر، اداراتی سہولت کے مطابق، شائع ہوتا رہے گا۔ قارئین کرام بھی اس تحریک کی کامیابی میں ہمارا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ آپ کو ان ادیبوں کی جو کہانیاں خاص طور پر پسند ہیں، اُن کی سفارش کر سکتے ہیں۔ ان کی شخصیت کے بارے میں دلچسپ واقعات کہیں پڑھے ہوں، تو وہ پورے حوالے کے ساتھ ہمیں بھیج سکتے ہیں۔ جو آپ کے نام کے ساتھ شائع ہوں گے اور جس خاص نمبر میں یہ طبع ہوں گے، وہ آپ کو اعزازاً ارسال کیا جائے گا۔

- احمد ندیم قاسمی
- اشفاق احمد
- امرتا پریتم
- انتظار حسین
- او۔ ہنری
- ای ایم فارسٹر
- اے حمید
- ایڈگر ایلن پو
- اینی کیتھرین پورٹر
- بلونت سنگھ
- تھامس مان
- ٹالسٹائی
- ٹرومن کیپوٹے
- جان سٹین بیک
- جیک لنڈن
- جیلانی بانو
- جیمس جوائس
- منشی پریم چند

- چیخوف
- حیات اللہ انصاری
- خدیجہ مستور
- ڈی ایچ لارنس
- راجندر سنگھ بیدی
- رام لعل
- رفیق حسین
- ساکی
- سٹیفن کرین
- سجاد حیدر یلدرم
- سعادت حسن منٹو
- سکاٹ فٹزجیرالڈ
- سمرسٹ ماہم
- شفیق الرحمٰن
- شوکت صدیقی
- عزیز احمد
- عصمت چغتائی
- علی عباس حسینی

- غلام عباس
- قدرت اللہ شہاب
- قرۃ العین حیدر
- کافکا
- کرشن چندر
- کیتھرین مینسفیلڈ
- گورکی
- مارک ٹوین
- مسعود مفتی
- ممتاز شیریں
- ممتاز مفتی
- موپاساں
- واجدہ تبسم
- والٹر ڈی لامیئر
- ولیم فاکنر
- ہاجرہ مسرور
- ہمنگوے
- ہنری جیمس

دُنیا کی بڑی بڑی زبانوں کے شاہکار افسانوں پر بھی الگ الگ خصوصی نمبر مرتب کئے جا رہے ہیں۔

مُدیر : سیّد قاسم محمود
نائب مُدیر : محمّد اکرام
آرٹسٹ : تنویر احسن

نمبر ۲۳ - یکم مارچ - ۱۹۸۰ء

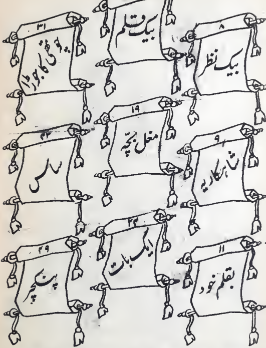

سید قاسم محمود نے باہتمام سید ریاض حسین المجید پرنٹرز لاہور سے طبع کرا کے مکتبۂ کاروانی لاہور سے شائع کیا۔

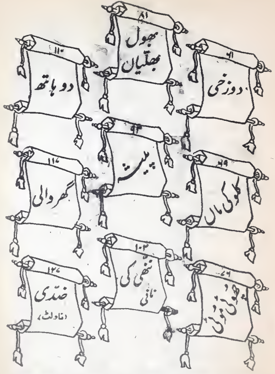

مکتبۂ شاہکار۔ گلشن کالونی، پوسٹ بکس ۴۷۵، لاہور۔ ٹیلیفون [illegible]

بیک نظر

پیدائش: ۲۱ اگست ۱۹۱۵ء بمقام: آگرہ (یوپی، بھارت) خاندانی نام: عصمت خانم چغتائی

والد: مرزا قسیم بیگ چغتائی والدہ: نصرت خانم چغتائی بھائی: مرزا عظیم بیگ چغتائی

تعلیم: بی اے، بی ایڈ (مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) ملازمت: ہیڈ مسٹریس، اسلامیہ ہائی سکول، بریلی ۱۹۳۶ء

پہلی مطبوعہ تحریر: ڈرامہ "فسادی" مطبوعہ رسالہ "ساقی" دہلی جنوری ۱۹۳۹ء

پہلی مطبوعہ کہانی: "نیرا یا گیندا" مطبوعہ رسالہ "ساقی" دہلی مئی ۱۹۳۹ء

پہلا ناول: ضدی مطبوعہ ۱۹۴۱ء (معاوضہ صرف ایک سو روپیہ) پہلی فلم: "چھیڑ چھاڑ" پروڈیوسر کے آصف ۱۹۴۳ء

تصانیف

افسانوی مجموعے:

کلیاں، چوٹیں، ایک بات، چھوئی موئی، دو ہاتھ، دوزخ، شیطان، کنواری۔

ناول:

ضدی، ٹیڑھی لکیر، معصومہ، سودائی (ضدی کے نام سے یہی ناول فلمایا گیا)، جنگلی کبوتر، دل کی دنیا، عجیب آدمی، باندی، تین اناڑی اور نقلی راجکمار (بچوں کے لیے ناول)، ایک قطرۂ خون (واقعہ کربلا پر عصمت آپا کا ایک ناول)، کاغذی ہے پیرہن (آپ بیتی)

به شکریہ حنا۔ لاہور

شاہکاریہ

"قافلہ" کی موجودہ شکل وصورت، قدوقامت سائز اور ادارتی پالیسی کو عام طور پر پسند کیا گیا ہے۔ افسانوی تحریک کے خیال کو سراہا گیا ہے لیکن ہمارے بعض قارئین نے کچھ تنقیدی حواشی بھی لکھے ہیں۔ ایک اعتراض تو وہی قدیم ہے جو ہمارے نام اور کام کے ساتھ وابستہ چلا آرہا ہے کہ افسانوی تحریک اس وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب مستقل مزاجی اور پائیداری کے ساتھ اس پر عملدرآمد کیا جائے۔ "معشوقوں کی طرح بدل جانا اور ایک اچھے کام کو ادھورا چھوڑ دینا"۔۔۔ ہمارا وصفِ خاص شمار ہونے لگا ہے۔ اگر یہ شیوہ ترک کردیا جائے تو افسانوی تحریک کامیاب ہوسکتی ہے ورنہ نہیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ نہیں بدلیں گے بابا نہیں بدلیں گے اور دنیا کے تو بڑے افسانہ نگاروں پر خاص نمبر شائع کرنے کا جو پروگرام اب بنایا ہے اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دم لیں گے۔

دوسرا اعتراض بھی خاصا وزنی ہے: "منٹو نمبر" دیکھ کر جو ہمارا احساس تھا، وہی تقریباً سب کا احساس تھا۔ یہ کہ تشنگی رہ جاتی اور منٹو کے کئی نمائندہ افسانے اس میں شامل نہیں ہو سکے اس کی وجہ ضخامت کی قید اور قیمت کی ارزانی ہے۔ قارئین کا یہ مشورہ یقیناً درست ہے کہ ہر افسانہ نگار اور ادیب کے ساتھ انصاف ہونا چاہئیے اس مقصد کے لیے ضخامت اور قیمت میں اضافہ ایک معمول کی بات ہے جو ناگوار نہ ہوگی۔

پس آئندہ شمارے یعنی شاہکار افسانہ نمبر کے بعد "قافلہ" کے جتنے بھی ماہوار خصوصی نمبر شائع ہوں گے ان کی قیمت دس روپے ہوگی اور ضخامت میں بھی اسی قدر اضافہ کیا جائے گا۔ آئندہ شمارہ "شاہکار افسانہ نمبر" ہوگا جو دورِ جدید کے ممتاز افسانہ

نگار، محمد منشایاد نے مرتب کیا ہے وہ اس سے پہلے شاہکار کے لیے "۱۹۷۷ء کے شاہکار افسانے" مرتب کر چکے ہیں جو کافی مقبول ہوا تھا۔

"شاہکار افسانہ نمبر" میں ۱۹۷۹ء کی بہترین پاکستانی کہانیاں یکجا ہو گئی ہیں۔ اس خاص نمبر میں پاکستان کے تمام بڑے اور نئے افسانہ نگاروں کی چونتیس پینتیس کہانیاں شامل ہیں۔ یہ طبعزاد نئی تازہ تخلیقات جو پاکستانی زندگی کی ترجمان و عکاس ہیں تراجم پر ہر لحاظ سے فوقیت رکھتی ہیں۔

"عصمت چغتائی نمبر" کے بارے میں اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس شخصیت کی منتخب کہانیوں کا مجموعہ ہے جس نے افسانہ نگاری کے فن میں دائمی اور ابدی اضافہ کیا ہے۔ اردو افسانے کی تاریخ عصمت چغتائی کے بغیر ادھوری اور نامکمل ہے۔

اس نمبر میں عصمت کی نمائندہ کہانیوں کے علاوہ معروف نقادوں کی تنقیدی آراء اور شخصی خاکے بھی کہانیوں میں رنگ بھرتے نظر آتے ہیں۔

آپکا

سید قاسم محمود

بقلم خود

عورت ایک محکوم، بے بس اور مجبور مخلوق ہے یا اس آپ بیتی کی مصنفہ کی طرح آزاد، خود مختار اور بے باک۔

سمجھ میں نہیں آتا اپنے متاثر ہونے کا الزام کس کے سر تھوپ دوں۔ ددھیال والوں کا خیال تھا کہ میں پورم پور اپنی ننھیال والوں پر گئی ہوں۔ نگوڑے، نیسخ پتلی دال کھانے والے، مگر ننھیال والوں کو یقین تھا کہ میں سو فی صد ددھیال والوں پر پڑی ہوں۔ وہی اپنی پھوپھی جیسا تیہا اور گز بھر کی زبان۔ چنگیز خاں کی اولاد سے اور کیا امید کی جا سکتی ہے۔

لیکن اگر کوئی میری اماں سے پوچھتا کہ بیٹی کو کیا ہو گیا تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں، "نہ ددھیال کا قصور نہ ننھیال کا۔ یہ سب نصیب کا پھیر ہے۔"

ایسی صورت میں کس کا نام لے دوں۔ وہ بیج جس سے میری ہستی وجود میں آئی قطعی ٹیڑھا میڑھا نہ تھا۔ ضرور پالنے پوسنے میں کہیں بھول چوک ہو گی۔

مگر مجھے بذاتِ خود اس ماحول سے کوئی شکایت نہیں جہاں میری تراش خراش ہوئی۔ کچر پچر بچوں کے جم غفیر میں ایک پیادہ سپاہی کی طرح تربیت پائی، نہ لاڈ ہوئے نہ نخرے، نہ کبھی تعویذ گنڈے بندھے نہ نظر اتاری گئی، نہ کبھی خود کو کسی کی زندگی کا اہم حصہ محسوس کیا۔

بہنیں چونکہ بڑی نکل گئیں اس لیے بھائیوں کی صف میں جگہ ملی۔ کھیل کود کا زمانہ انھیں کے ساتھ گلی ڈنڈا، فٹ بال اور ہاکی کھیل کر گزرا۔ پڑھائی بھی ان کے ساتھ ہوئی۔ سچ پوچھیے تو اصل مجرم میرے بھائی ہی تھے جن کی صحبت نے مجھے ان ہی کی طرح آزادی سے سوچنے پر مجبور کیا۔ وہ شرم و حیا جو عام طور پر درمیانے طبقے کی لڑکیوں میں لازمی صفت سمجھی جاتی ہے۔ پنپ نہ سکی۔ چھوٹی سی عمر سے دوپٹہ اوڑھنا، جھک کر سلام کرنا، شادی بیاہ کے ذکر پر شرمانے کی عادت بھائیوں نے چھیڑ چھیڑ کر پڑنے ہی نہ دی۔ سوائے عظیم بھائی کے سب ہی گھر میں چاق و چوبند تھے۔ کنبے کا کنبہ حد درجہ بذلہ سنج اور باتونی۔ آپس میں پھبتیاں چلتیں، نئے نئے جملے تراشے جاتے، ایک دوسرے کی دھجیاں اڑائی جاتیں، بچے بچے کی زبان پر رکھی تھی۔

ابا پنشن لے کر آگرہ کے موروثی گھر میں رہنے لگے۔ کھلی ہوا میں اڑنے کے بعد ایک دم سے نہایت بوسیدہ ماحول کی گھٹن سے واسطہ پڑا۔ کہاں فٹ بال

اور گلی ڈنڈا اور کہاں آگرہ محلہ پنجہ شاہی کی بوسیدہ گلیاں اور گھٹی ہوئی گلیوں میں پلنے والی جھکی جھکی نیم مدقوق لڑکیاں جو اپنے دل کی دھڑکن سے سہم جائیں میری ان لڑکیوں سے بالکل نہ بنتی اور ان بڑھیوں سے بھی ٹھن گئی جو مجھے پنجوں پر تلانچیں بھرتا دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتیں۔

"توبہ بوا، منجھو کی لونڈیا ہے کہ موا بجار، توبہ توبہ۔"

اور میری اماں جان نصرت خانم، جنھیں لوگ پیار میں نجھو کہتے تھے، شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتیں۔

اور آگرہ کی ان گلیوں میں پہلی بار مجھے اپنے لڑکی ہونے کا صدمہ ہوا۔ عورت خدا نے کیوں پیدا کی۔ اس مری پٹی، مجبور و محکوم ہستی کی کیا ضرورت تھی، دھوبن روز رات کو پٹتی تھی۔ جمعدارنی کے آئے دن جوتے پڑا کرتے تھے۔ پاس پڑوس کی تمام عورتیں آئے دن اپنے شوہروں سے جوتے کھایا کرتی تھیں اور میں خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگتی، "اے اللہ پاک مجھے لڑکا بنا دے کہ میں بھی چھت پر پتنگ اڑانے پر نہ پٹوں، گلیوں میں کبڈی کھیل سکوں اور آزادی سے بندروں کے پیچھے بھاگتی پھروں مگر آگرہ میں گندی گلیاں ہی نہ تھیں، ان گلیوں میں سارے دور اور قریب کے رشتہ دار بھی رہتے تھے جن سے اماں لرزا کرتیں۔ جب تک دوسرے شہروں میں رہے آزاد رہے۔ اپنے کنبے میں آکر تو جیسے بیڑیاں پڑ گئیں۔

مگر مجھے آگرہ کی ان شرمیلی دبلی لڑکیوں سے مجبوراً بہناپا جوڑنا پڑا اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ ظاہر میں بھولی نظر آنے والی لڑکیاں بڑی چلتا پرزہ ہیں۔ چپ چپ گروہ گل کھلائے جاتے ہیں کہ الہی توبہ۔ بڑھیوں کو چٹکیوں میں اُلّو بنا کر گلی کے لونڈوں سے خوب خوب پینگیں بڑھتی ہیں۔ مجھے اس دوغلی زندگی سے بڑی کراہت آئی۔

آگرہ کی مکروہ فضا سے جلد ہی پیچھا چھوٹ گیا اور ہم لوگ علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ اماں کو بھی کچھ خاندان والوں سے وحشت سی ہوتی تھی۔ علی گڑھ کی کھلی ہوا میں پھر ہماری پرانی زندگی لوٹ آئی ..... وہی بجوس کے بنگلے، ڈگی کا کنارہ اور ہرے بھرے کھیت، اور ان کھیتوں میں ککڑیاں کھیرے چرانا، پیڑوں پر چڑھنا اور پھر مجھے اپنے لڑکی ہونے کا غم نہ رہا۔ بلکہ لڑکی ہونے کے کچھ فائدے نظر آنے لگے۔ مثلاً ابا کا حکم تھا کہ لڑکیوں کی چوٹی نہ کھینچی جائے، اور نہ ان کی بالیوں میں انگلی ڈال کر جھٹکے دیئے جائیں۔ لڑکیاں اگر ماریں تو سرکار سے شکایت کی جائے۔ مناسب سزا دی جائے گی۔ لڑکیاں کہاں بس خاک رہی لڑکی تھی، جس کی شکایتیں ابا حضور کے دربار میں آئے دن پیش کی جاتیں۔ مگر بھائی اتنے بدنام ہو چکے تھے کر عموماً ہمیں سزا نہ ملتی، الٹے وہی ڈانٹ دیئے جاتے۔

علی گڑھ آکر عظیم بھائی کے وجود کا احساس دن بدن بڑھنے لگا۔ خدا جانے انھیں مجھ سے کیوں ایک دم دلچسپی پیدا ہو گئی۔ مجھے تو بڑے بھائی نسیم ہمیشہ سے اچھے لگتے تھے، ان سے مار کھانے میں بھی مزا آتا تھا، کیونکہ وہ پیسے اور مٹھائیاں بھی تو دیتے تھے۔ عظیم بھائی نہ پیسے دیتے تھے۔ نہ چیتیں مارتے تھے۔ بڑی سنجیدگی سے بات کرتے۔

اور پھر انہوں نے مجھے تاریخ اور انگریزی پڑھانا شروع کی۔ یہ یاد نہیں رہا کہ ابتدا کیسے ہوئی مگر اتنا یاد ہے کہ شام کو جب وہ کام سے تھکے ہارے آتے تھے تو اپنے برآمدے میں پلنگ پر لیٹ جاتے تھے اور مجھ سے کہتے زور زور سے پڑھو۔ پھر ترجمہ

درست کرتے، املا لکھواتے، اس کے بعد باتیں کیا کرتے۔ یاد نہیں کیا باتیں ہوتیں جن سے ابتدا ہوئی۔ بعد میں تو حدیث و قرآن کے بارے میں بتایا کرتے تھے ان کا پڑھانے کا طریقہ عجیب تھا۔ کوئی ناول دیتے کہ اس کا ترجمہ کر ڈالو۔ انگریزی سے اردو میں اور اردو سے انگریزی میں، دس دس صفحے ترجمہ کروا ڈالتے۔ ناولوں کا ترجمہ کرنے میں کئی فائدے ہوتے تھے۔ ایک تو یہ کہ پوری ناول کا ترجمہ کرنے سے پہلے ناول ختم کرنا پڑتی تھی، اور اسی زمانہ سے مجھے شدت سے ناولیں پڑھنے کا چکر پڑ گیا ساری ساری رات ناولیں کہانیاں پڑھا کرتی۔ مگر اس زمانے میں میں نے جتنی ناولیں پڑھیں خاک پلے نہیں پڑا لہٰذا پھر پڑھنا پڑیں۔ ہارڈی وہ پہلا ناولسٹ تھا جسے میں نے بقول عظیم بھائی گھول کر پی لیا۔

اس زمانے میں عظیم بھائی نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں بالکل اُن کی آواز بازگشت بن گئی۔

"منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔"

جب میں بولتی تو سب چڑاتے کہ میں نہیں عظیم بھائی بول رہے ہیں، اور عظیم بھائی نے بھی میری ناسمجھی سے فائدہ اٹھایا۔ وہ بات جو وہ خود نہ کہہ پاتے بڑی ہوشیاری سے میرے کان میں ڈال دیتے اور میں جھٹ سے کہہ دیتی۔ اس دور میں بقول خاندان والوں کے انہوں نے مجھے خوب بھڑکایا۔ میری طبیعت جو پہلے ہی خودسر اور ضدی تھی ان کی شہ پا کر اور بھی قابو سے باہر ہو گئی۔

وہ ان دنوں قانون پڑھ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک کارخانے میں نوکری بھی کر رہے تھے، مضمون بھی لکھا کرتے تھے۔ اس قدر محنت کرنے کے بعد وہ رات کو مجھے کئی گھنٹے پڑھایا کرتے۔ کبھی انھیں حرارت ہوتی، کبھی سینے میں درد ہوتا، ہاتھ پیر اینٹھتے، ان کی بیوی بیٹی ان کی چھاتی سینکا کرتی اور وہ مجھے پڑھایا کرتے۔ انہوں نے کبھی مجھ سے سر یا پیر دبانے کو نہیں کہا اور بیماری میں کبھی ان کا کوئی کام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بڑے بھائی جو تھے اس لیے مجھے پڑھانا ان کا فرض تھا۔ ایک دفعہ ان کو بڑی شدت کا کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ دو گھنٹے ہو گئے اور چند صفحے کا ترجمہ ختم نہ ہو پایا۔ مجھے جھلاہٹ آنے لگی۔

"ہم نہیں پڑھتے آپ سے، آپ اتنا کھانستے ہیں۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"بیوقوف کہیں کی، کیا ہم جان بوجھ کر کھانس رہے ہیں۔" انہوں نے ہنس کر کہا اور وعدہ کیا کہ اب نہیں کھانسیں گے۔

پتہ نہیں انھیں میرے مستقبل سے کیوں دلچسپی ہو گئی تھی۔ میٹرک کرنے پر اس قدر خوش ہوئے کہ اپنے بیٹے کے پیدا ہونے پر بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ چھٹیوں میں انہوں نے مجھے اپنے گھر بلا لیا چونکہ اب وہ جودھ پور میں وکالت کرنے لگے تھے۔ ان دنوں انھوں نے مجھے قرآن کا ترجمہ اور حدیث پڑھنے میں مدد دی۔ اور شاید کیا یقینی طور پر ان کے افسانے پڑھ پڑھ کر خود بھی چھپا کر لکھنا شروع کر دیا۔ جب اسمٰعیل، مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کے افسانے پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا گویا یہ سب کچھ میرے ہی اوپر بیت رہی ہے، اور پھر میں نے خود کو افسانے کی ہیروئن تصور کر کے نہایت چٹ پٹے قسم کے واقعات لکھنا شروع کیے۔

مثلاً میں بہت خوب صورت ہوں، بالکل حجاب اسمٰعیل کی ہیروئن کی طرح سنہری بال، نیلی آنکھیں۔۔ قرمزی رنگ کا بادہ اوڑھے نیم دراز ہوں۔ ہیرو

آتا ہے...... میرا پہلا ہیرو ہمیشہ ڈاکٹر ہوتا تھا، شاید اس لیے کہ اس زمانے میں ڈاکٹر ہی ایسا غیر مرد ہوتا تھا جو گھر میں آکر نبض ٹٹول سکتا تھا۔ یہ ڈاکٹر لازمی طور پر بہت حسین ہوتا تھا۔ رات بھر میرے سرہانے بیٹھا رہتا تھا۔ میری حالت خراب ہونے پر زار و قطار روتا، بے تابانہ مجھے چومتا اور میری حسین موت پر دھاڑیں مار کر روتا اور عموماً خودکشی کر لیتا۔ کیا مزے دار ہوا کرتی تھیں یہ کہانیاں انھیں لکھنے میں اتنا ہی لطف آتا تھا جیسا چٹ پٹی کہانیاں پڑھنے میں آتا تھا۔ جیسے رومانی ناول میں جب ہیرو ہیروئن کے لبوں کا بوسہ لیتا ہے تو پڑھنے والے کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ یہی حال لکھنے میں بھی ہوتا ہے۔ عموماً ایسی کہانیاں لکھ کر میں نے فوراً پھاڑ ڈالیں کیوں کہ مجھے معلوم تھا، وہ گندی ہیں اور اگر کسی نے پڑھ لیں تو وہ جوتا کاری ہو گی کہ بس۔

مگر نہ جانے کیوں پھر لکھ کر دوبارہ تبارہ پڑھنے میں لطف آتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے میں نے نہیں کسی اور نے لکھی ہیں اور واقعی وہ میری تصنیف نہ تھی اور نہ میرا اندازِ تحریر تھیں بلکہ وہ ان کہانیوں کا نچوڑ تھیں جو مجھے بہکا چکی تھیں۔

ایسی کہانیوں کا میرے سرہانے انبار جمع ہو گیا اور وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔

ایک دن شمیم جو عمر میں مجھ سے سال ڈیڑھ سال بڑے ہیں، میرے پلنگ پر لیٹ گئے۔ سرہانے کاغذ سرسرائے تو نکال کر پڑھنے لگے۔

آہاہا..... بھئی کسی نے کیا گندی گندی باتیں لکھی ہیں، توبہ توبہ!

شمیم نے زور زور سے پڑھنا شروع کیا...

"ڈاکٹر جمیل نے اپنا سفید براق ہاتھ میرے سینے پر رکھا اور میرے گلابی ہونٹ"

میں پاس ہی غسل خانے میں نہا رہی تھی، سر میں بیسن ڈال چکی تھی، افوہ بیان نہیں کر سکتی کیا حالت ہوئی...... یا خدا اگر ایک سطر اور آگے پڑھ لی تو پھر ڈوب مرنے کے سوا کہیں ٹھکانا نہ رہے گا۔

ہیبت زدہ ہو کر میں نے غسل خانہ ہی سے وہ زور زور کی چیخیں ماریں کہ سارا گھر ہل گیا۔ لوگ سمجھے شاید موری سے سانپ نکل آیا اور مجھے ڈس لیا۔ شمیم بیچارہ کاغذ پھینک پھانک کر میری جان کی خیر منانے لگا۔ میں نے الٹے سیدھے کپڑے پہنے اور باہر نکل کر شمیم کا منہ نوچ ڈالا۔ وہ بیچارا ہونق منہ پھاڑ کر رہ گیا۔ آگے اسے پڑھنے کا ہوش ہی نہ رہا، وہ خود میری زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ میں نے اسی وقت سارا پلندہ جلا کر خاک کر دیا۔ شمیم نے بہت کہنے کی کوشش کی کہ میں نے نہایت گندی کہانیاں لکھی تھیں مگر میں نے جھٹلا دیا کہ ترجمہ تھا۔ وہ بیچارہ پہلے درجے کا جھوٹا مشہور تھا۔ اس لئے کسی نے بھی نوٹس نہ لیا۔

اب بھی اس خیال سے کوفت ہوتی ہے کہ اگر بجائے شمیم کے کوئی دوسرا بھائی پڑھ لیتا تو واقعی قیامت آ جاتی۔ بس اس دن سے میں نے توبہ کی کہ اول تو ایسی بے ہودہ کہانیاں لکھوں گی نہیں۔ جو اگر لکھیں بھی تو فوراً پھاڑ ڈالوں گی۔ حالاں کہ اب اگر غور کرتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ ان کہانیوں میں تو کچھ بھی نہ تھا سوائے اوپری چوما چاٹی کے جو مجھے نہایت پھس پھسی لگنے لگی تھی۔

پھر کئی سال کچھ نہیں لکھا۔ بی اے کے بعد دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ چار سال میں انسان کتنا بڑا ہو

جاتا ہے۔ میٹرک کے بعد چار سال میں نے نصاب کی کتابیں مجبوراً پڑھیں، یونانی ڈراما اور شیکسپیئر سے لے کر ابسن اور برنارڈ شا تک بہت کچھ پڑھ ڈالا۔ برنارڈ شا نے میرا دل مٹھی میں لے لیا۔ میں نے اپنا پہلا مضمون یا ڈرامہ "فسادی" برنارڈ شا سے حد درجہ متاثر ہو کر لکھا۔ مواد میں نے اپنے ارد گرد سے لیا اور اینٹ گارا برنارڈ شا سے......

بی اے کلاس میں میری ہم جماعت عذرا حیدر مجھے برنارڈ شا کہہ کر خوب چڑایا کرتی۔ اس لئے میں نے فوراً برنارڈ شا کے شکنجے سے نکل کر کہانیاں لکھنا شروع کیں۔

اور زندگی کے اس دور میں مجھے ایک طوفانی ہستی سے ملنے کا موقع ملا جس کے وجود نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ روشن آنکھوں اور مسکراتے، شگفتہ چہرے والی رشیدہ آپا سے کون ایسا تھا کہ ایک دفعہ مل کر متاثر نہ ہو جائے۔

پہلی دفعہ میں نے انہیں نہ جانے کون سے جلسے میں دیکھا تھا۔ بیگم بھوپال صدارت کی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ یکہ گاڑیوں سے جاڑے میں بیویاں موٹے دوشالے اور کوٹ ڈانٹے پنڈال کے اندر سوں سوں کر رہی تھیں اور رشیدہ آپا بغیر آستین کے بلاؤز پہنے دھواں دھار کچھ کہہ رہی تھیں۔ ان کے سیاہ بھونرا اور گھونگھریالے بال ہوا میں اڑ رہے تھے کیونکہ تقریر شروع کرنے سے پہلے انھوں نے سامنے کی

سمجھ بوجھ کی باتیں

شاہد احمد دہلوی اور عصمت چغتائی لاہور میں میاں ایم اسلم (مشہور ناول نویس) کے ہاں ٹھہرے۔ سلام و دعا بھی ٹھیک سے نہ ہوئی تھی کہ میاں صاحب نے عصمت کو جھاڑنا شروع کیا۔ اُن کی عریاں نگاری پر برسنے لگے۔ عصمت پر بھی بھوت سوار ہو گیا۔ شاہد صاحب نے بہت روکا، مگر عصمت الجھ پڑی۔

"اور آپ نے جو 'گناہ کی راتوں' میں اتنے گندے گندے جملے لکھے ہیں۔ باقاعدہ سیکس ایکٹ کی تفصیل بتائی ہے صرف چٹخارے کے لیے۔"

"میری اور بات ہے۔ میں مرد ہوں۔"

"تو اس میں میرا کیا قصور؟"

"کیا مطلب؟" میاں صاحب غصے سے سرخ ہو گئے۔

"مطلب یہ کہ آپ کو خدا نے مرد بنایا، اس میں میرا کوئی دخل نہیں اور مجھے عورت بنایا، اس میں آپ کا کوئی دخل نہیں۔ مجھ سے آپ جو چاہتے ہیں، وہ سب لکھنے کا حق آپ نے نہیں مانگا۔ نہ میں آزادی سے لکھنے کا حق آپ سے مانگنے کی ضرورت سمجھتی ہوں؟"

"آپ ایک شریف مسلمان خاندان کی تعلیم یافتہ لڑکی ہیں۔"

"اور آپ بھی تعلیم یافتہ ہیں اور شریف مسلمان خاندان سے ہیں؟"

"آپ مردوں کی برابری کرنا چاہتی ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ کلاس میں زیادہ سے زیادہ نمبر پانے کی کوشش کرتی تھی اور اکثر لڑکوں سے زیادہ نمبر لے جاتی تھی۔"

"آپ کو مذہبی تعلیم نہیں ملی؟"

"اسے اسلم صاحب! میں نے بہشتی زیور پڑھا۔ اس میں ایسی کھلی کھلی باتیں لکھی ہیں۔ جب بچپن میں میں نے وہ باتیں پڑھیں تو میرے دل کو دھکا سا لگا۔ وہ باتیں گندی لگیں۔ پھر جب میں نے بی اے کے بعد پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ باتیں گندی نہیں۔ بڑی سمجھ بوجھ کی باتیں ہیں جو ہر ذی ہوش انسان کو معلوم ہونی چاہئیں۔ ویسے لوگ تو نفسیات اور ڈاکٹروں کے کورس میں جو کتابیں ہیں، انھیں بھی گندا کہہ دیتے ہیں۔"

کھڑکی کھول دی تھی۔ بیویاں بڑبڑا رہی تھیں ان کے کٹے ہوئے بالوں پر بغیر آستین کی بلاؤز پر اور کھلی ہوئی کھڑکی سے آتی ہوئی برفیلی ہوا پر، مگر ان کی تقریر بھی شاید کچھ کم دھاردار نہیں تھی۔ کیونکہ تقریر کے بعد انھیں بیگم بھوپال نے خوب ڈانٹا۔ اسی دن ان کی بے باکی کا تہلکہ مچ گیا تھا اور میں نے بے سمجھے بوجھے ان کے ہر لفظ کو موتی سمجھ کر چن لیا تھا۔

۳۸ میں رشیدہ آپا انگاروں والی رشیدہ جہاں بن چکی تھیں۔ اب ان کی سلگتی ہوئی باتیں پلے بھی پڑنے لگی تھیں۔

اور پھر وہ میرا حسین ڈاکٹر ہیرو دہشتی انگلیاں، تاریکی کے شگوفے اور قرمزی لبادے چور ہوگئے۔ مٹی سے بنی ہوئی رشیدہ آپا نے سنگِ مرمر کے سارے بت منہدم کر دیئے۔

زندگی ننگی ہم سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ ان سے گھنٹوں باتیں کر کے بھی جی سیر نہ ہوتا، جی چاہتا انھیں کھا جاؤں، کیا کروں، جو رشیدہ آپا سے مل چکے ہیں انھیں اچھی طرح جانتے ہیں، اگر وہ میری کہانیوں کی ہیروئن سے ملیں تو دونوں جڑواں بہنیں نظر آئیں۔ کیونکہ انجانے طور پر میں نے رشیدہ آپا ہی کو اٹھا کر افسانوں کے طاقچے میں بٹھا دیا کہ میرے تصور کی دنیا کی ہیروئن صرف وہی ہوسکتی تھیں۔ مگر جب غور سے اپنی کہانیوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے صرف ان کی بے باکی اور صاف گوئی کو گرفت میں لے لیا۔ ان کی بھرپور سیمابی شخصیت میرے قابو میں نہ آئی۔ مجھے روتی بسورتی، حرام کے بچے جنتی، ماتم کرتی نسوانیت سے ہمیشہ سے نفرت تھی۔ خواہ مخواہ کی وفاداری وہ جملہ خوبیاں جو مشرقی عورت کا زیور سمجھی جاتی ہیں مجھے لعنت معلوم ہوتی ہیں جذباتیت سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔ عشق تتلی وہ آگ نہیں جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔ عشق میں محبوب کی جان کا لاگو ہوجانا، خودکشی کرنا، واویلا کرنا میرے مذہب میں جائز نہیں۔ عشق مقوی دل و دماغ ہے نہ کہ جی کا روگ۔

یہ سب میں نے رشید آپا سے سیکھا اور مجھے یقین ہوگیا کہ رشیدہ آپا جیسی لڑکی سو لڑکیوں پر بھاری پڑ سکتی ہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد سوائے فسادات کے اور کچھ ذہن میں باقی نہ رہا، ملک بکھرا دنیا بکھری اور اس کے ساتھ کتنی ہی حسین و نازک قدریں چور چور ہوگئیں۔ مقصدی ادب کے نعرے نے اور زیادہ گڑبڑا دیا۔ کیوں لکھیں، اور کیا لکھیں؟ کے مخمصے میں پڑ کر اور بھی راستہ گم ہوگیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے بہت کچھ دیا اور بہت کچھ مٹا دیا۔ کتنے نئے ساتھی ملے، اور پرانے بچھڑ گئے۔ اور پھر ؎

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا.....

انجمن کے پرخچے اڑ گئے، بمبئی گروپ جس کی طرف لوگوں کی نظریں اٹھا کرتی تھیں، فلموں میں غرق ہوگیا۔ ظاہر ہے صرف رسالوں کے لئے لکھ کر روزی نہیں کمائی جاسکتی۔ نہ ناولیں اور افسانوں کے مجموعوں سے بمبئی کا خرچ چل سکتا ہے۔ فلم ہی ایک ایسی لائن ہے جہاں اگر ہاتھ لگ جائے تو قلم چلا کر روٹی کا سہارا ہوسکتا ہے۔

فلموں کے لئے لکھتے وقت معلوم ہوا کہ یہاں نہ بے باکی کی دھونس چلتی ہے نہ صاف گوئی کام آتی ہے۔ یہاں تو وہ ہر چیز جا بجے جو چیر پھاڑ کر دولت لائے۔ یہاں ایک خاص بندھی ہوئی لکیر کے مطابق چلنا ہوگا لہٰذا چلنے والے چلے اور ناک کے بل چلے۔

خاصات کے بارے میں تجربہ سنی سنائی سے آگے نہ بڑھ پایا" دھانی بانکیں" اور "جڑیں" سے زیادہ نہ محسوس کر پائی اور نہ لکھ پائی، مگر ان دو مضامین کو لکھتے وقت میرے دل نے بڑے زور کی قلابازی لگائی۔ اس وقت تک میں نے جتنی کہانیاں لکھی تھیں' ان میں ماں باپ یا تو تھے ہی نہیں اگر تھے تو نہایت فضول سی شے۔ انھیں نظر انداز کرکے ہی میری دانست میں ان پر فتح پائی جاسکتی تھی۔ والدین سڑک کا روڑا ہی تو ہیں جو اولاد کے راستہ میں رکاوٹوں کے سوا کچھ نہیں پیدا کرتے "ٹیڑھی لکیر" اب تک میرے دماغ میں بسا ہوا تھا۔ لیکن یہ دو مضمون لکھتے وقت میں نے اپنی ماں کو دیکھا۔

سب انہیں اکیلا چھوڑ کر پاکستان جاچکے تھے۔ میں ان سے ملنے جودھ پور گئی۔ اماں ہمارے ذاتی مکان کے سامنے ایک مختصر سے کمرے میں منتقل ہوگئی تھیں بھلا اپنا وسیع مکان رفیوجیوں کے قبضے میں تھا۔

میں پہنچی تو ڈھنڈار اجڑے ہوئے کمرے میں میری اماں بیٹھی تھیں۔ اماں کو ہم لوگوں کو چومنے چاٹنے کی کبھی فرصت نہ ملی مجھے نہیں یاد اس سے پہلے کبھی انھوں نے محبت کا اظہار کیا ہو۔ مگر اس وقت مجھے دیکھ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اپنے قیام کے زمانے میں بار بار میں نے دیکھا وہ خاموش کھڑکی سے اپنے گھر کو تک رہی ہیں۔ جہاں بھرے پرے خاندان کے ساتھ ہم سب ہنسی خوشی رہتے تھے۔ بچے قلانچیں بھرتے تھے۔ لڑائیاں ہوتی تھیں ملاپ ہوتے تھے۔

میں نے ان کی عمر کی طرف دیکھا' اس اکیلے پن کو دیکھا ہوتے تارے دس بچے پیدا کرکے بھی وہ اکیلی تھیں۔

میرے دل میں پیار کا طوفان ابل پڑا۔ مامتا جاگ اٹھی' میں نے اپنی ماں کی طرف دیکھا پھر اپنی بچی کی طرف دیکھا اور ان دو ہستیوں کے بیچ میں — خود کو جکڑا ہوا پایا۔ اپنی ماں کو دیکھ کر مجھے پہلی دفعہ ساری دنیا کی بڑھیوں پر پیار آنے لگا۔ جو دنیا کو لاتی ہیں' مر مر کر جنم دیتی ہیں' انھیں پالتی پوستی ہیں' جو پھر ان پر نچھاور کرتی ہیں نہ ان سے اسٹامپ لکھاتی ہیں نہ پکے" کاغذ پر رسید۔ اب اگر اولاد ان کے بڑھاپے کا خیال کرلے تو قرضدار ہے جو اپنے بال بچوں کے خرچے سے کچھ نہ بچے تو مجبور ہے۔ پرانے زمانے میں بڑے بوڑھوں کو لوگ بیکار جنس سمجھ کر زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ یہ سنسان بڑھاپا کس قدر مہیب شے ہے۔

اور یہ بھی اتفاق ہی تھا جو میری اپنی ماں سے ملاقات ہوگئی اور کچھ سوئے ہوئے تار جاگ اٹھے ابھی کتنے تار ہیں جو مردہ' خاموش' سوئے پڑے ہیں' کون جانے کون سے نئے مضراب اور پیدا ہوں گے جن کی چوٹ سے بہت سی نیندیں ٹوٹیں گی' ٹھہرے ہوئے پانی پر کائی جم جاتی ہے۔ ایک ننھا سا کنکر سطح پر گرتا ہے...... کائی چھٹ جاتی ہے..... جگمگاتی دنیا کا عکس پانی کی سطح پر لو دینے لگتا ہے' انسان ایک قدم آگے بڑھاتا ہے۔

بمبئی
عصمت چغتائی
۲ر جنوری ۷۰ء ۱۹

عصمت — بیگ قلم

ضدی، بٹیرے، سعادت مند بہو، مارے خلوص کے بات بات پر میاں سے لڑنے والی بیوی، ماں تا ظاہر نہ ہونے دینے والی ماں اور یہ ہیں عصمت۔ جنہیں لوگ عصمت چغتائی کے نام سے بھی جانتے ہیں اور عصمت شاہد لطیف کے نام سے بھی۔ عصمت نہ خوبصورتوں میں شمار ہو سکتی ہیں نہ بدصورتوں میں۔ درمیانے درجے کا دوہرا ڈیل ڈول، طویل القامت اور متناسب الاعضا۔ عام طور پر بیمار رہنے اور علاج نہ کرنے کی قائل۔ کھلتا ہوا گیہواں رنگ جو اب بمبئی میں رہتے رہتے زیادہ سنولا گیا ہے۔ موتی کی لڑی سے دانت جو پان کھاتے رہنے کے باوصف کتھے چونے کا اثر قبول نہیں کرتے۔ پتلے پتلے ہونٹ، مختصر سی ناک اور بھرے بھرے رخسار۔ جتنے سلجھے ہوئے خیالات، سر پر اتنے ہی الجھے ہوئے بال، متجسس آنکھیں اور آنکھوں پر سونے کے فریم کی محدب شیشوں کی عینک۔ مجموعی طور پر چہرے سے متانت اور طباعی کے آثار نمایاں۔ ہنس مکھ اور تند مزاج۔ لکھنے پڑھنے میں جتنی بے باک، بات چیت میں اتنی ہی محتاط۔ بقول بڑی بوڑھیوں کے پہننے اوڑھنے سے اچھی معلوم ہو سکتی ہے، لیکن عام طور پر صرف تن ڈھانکنے کے لیے کپڑے پہنتی ہیں۔ آرائش یا زیبائش کے خیال سے نہیں۔ گھٹنے پلتے اور بناؤ سنگھار سے کتراتی ہیں۔ کبھی کبھی غرارہ یا شلوار پہنتی ہیں لیکن اُن کا من بھاتا لباس ساڑھی ہے۔ بھڑکیلا اور قیمتی لباس نہ خود پہنتی نہ دوسروں کو پہنتے دیکھ سکیں۔ کھانے پینے کی شوقین کم اور کھانے پکانے کی زیادہ۔ گھر گرہستی کے کاموں میں اتنا انہماک برتتی ہیں کہ آپ ان کے گھر جائیے تو کچھ نہ کچھ سیتا پروتا ہی پائیے۔ لیکن اس کے باوجود کبھی انہیں سڑک پر یا کسی اور پبلک مقام پر ہاتھ میں اُون کے گولے یا سلائیاں لئے نہیں دیکھا گیا۔ مطالعہ کرتے آج تک نہیں پکڑی جا سکیں۔ انہیں کتابیں پڑھنے کا کم اور زندگیاں پڑھنے کا زیادہ شوق ہے۔ جہالت سے نفرت کرتی ہیں لیکن جاہل اور مفلوک الحال عورتوں میں گھس گھس کر بیٹھنے اور ان کے رنڈرونے سننے اور ان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنے کا جنون ہے۔ حتی امکان ان کی مدد بھی کرتی ہیں اور موجودہ معاشرے کی غلط قسم کی بندشوں سے انہیں آزاد کرانے کی کوشش کرتی ہیں ...... اگر آپ کسی موضوع پر بحث چھیڑ بیٹھیں تو پھر جب تک آپ کو قائل نہ کرلیں یا خود قائل نہ ہو جائیں بحث ختم نہیں کرتیں ..... شاعروں سے زیادہ نثر نگاروں سے بحث کرنا پسند کرتی ہیں ..... اپنی تحریروں کا معاوضہ خود طلب نہیں کرتیں، ہاں اگر کوئی معاوضہ دینے پر اتر ہی آئے تو پھر اس پر کبھی کبھی ناراض بھی ہو لیتی ہیں اور جز بز ہو کر کم ہی معاوضہ قبول کر لیتی ہیں۔ پیسہ جب آتا ہے تو پانی کی طرح بہاتی ہیں۔ نہیں ہوتا تو غم غلط کرنے کو افسانے اور ناول لکھتی ہیں۔ جب لکھنے بیٹھ جاتی ہیں تو بے تکان اور قلم برداشتہ لکھتی چلی جاتی ہیں۔ بالعموم ایک نشست میں ایک افسانہ یا کسی ناول کا ایک مکمل باب لکھ کر دم لیتی ہیں۔ کبھی اپنے لکھے پر نظر ثانی نہیں کرتیں۔ ایک دفعہ کوئی لفظ یا فقرہ لکھ کر بہت کم قلم زد کرتی ہیں۔"

اخلاق احمد دہلوی

مُغل بچّہ

وہ مرتے مر گیے مگر مغلیہ شہنشاہیت کی ضد کو برقرار رکھا۔

فتح پور سیکری کے سنسان کھنڈروں میں گوری دادی کا مکان پرانے سوکھے زخم کی طرح کھٹکتا تھا۔ گلیا اینٹ کا دو منزلہ گھٹا گھٹا سا مکان ایک مار کھائے روٹھے ہوئے بچے کی طرح لگتا تھا۔ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا وقت کا بھونچال اس کی ڈھٹائی سے عاجز آکر آگے بڑھ گیا اور شاہی شان و شوکت پر ٹوٹ پڑا۔

گوری دادی سفید جھک چاندنی بچھے تخت پر سفید بے داغ کپڑوں میں ایک سنگِ مرمر کا مقبرہ معلوم ہوتی تھیں۔ سفید ڈھیروں بال، بے خون کی سفید دھوئی ہوئی ململ جیسی جلد، ہلکی کرنجی آنکھیں جن پر سفیدی رینگ آئی تھی پہلی نظر میں سفید لگتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر آنکھیں چکا چوند ہو جاتی تھیں جیسے لسی ہوئی چاندنی کا غبار اُن کے گرد معلق ہو۔

نہ جانے کب سے جیے جا رہی تھیں۔ لوگ اُن کی عمر سو سے اُوپر بتاتے تھے۔ کھلی کھلی گم سُم بے نور آنکھوں سے وہ اتنے سال کیا دیکھتی رہی تھیں۔ کیا سوچتی رہی تھیں کیسے جیتی رہی تھیں۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں وہ میری اماں کے چچا دادا سے بیاہی تو گئی تھیں مگر انہوں نے دلہن کا گھونگٹ بھی نہ اٹھایا۔ کنوارپن کی ایک صدی انہوں نے انہی کھنڈروں میں بتائی تھی۔ جتنی گوری بی سفید تھیں اتنے ہی اُن کے دولہا سیاہ بھٹ تھے۔ اتنے کالے کہ اُن کے آگے چراغ بجھے!

گوری بی بجھ کر بھی دھواں دیتی رہیں۔

سرِ شام کھانا کھا کر جھولیوں میں سوکھا میوہ بھر کے ہم بچے لحافوں میں دُبک کر بیٹھ جاتے اور پرانی زندگی کی ورق گردانی شروع ہو جاتی بار بار سن کر بھی جی نہ بھرتا۔ اور بدا کر گوری بی اور کالے میاں کی کہانی دہرائی جاتی۔ بیچارے کی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے کہ اتنی گوری گوری دُلہن کا گھونگٹ بھی نہ اٹھایا۔

امّاں سال کے سال پورا لاؤ لشکر لے کر میکے پر دھاوا بول دیتیں۔ بچوں کی عید ہو جاتی فتح پور سیکری کے پر اسرار شاہی کھنڈروں میں آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے جب شام پڑ جاتی تو کھوئی کھوئی سہمی فضا سے ڈر لگنے لگتا۔ ہر کونے سے سائے لپکتے۔ دل دھک دھک کرنے لگتے۔

"کالے میاں آ گئے" ہم ایک دوسرے کو ڈراتے گرتے پڑتے بھاگتے اور گلیا اینٹ کے دو منزلہ مکان کی آغوش میں دبک جاتے۔ کالے میاں ہر اندھیرے کونے میں بھوت کی طرح چھپے محسوس ہوتے۔ بہت سے بچے مرنے کے بعد حضرت سلیم چشتی کی درگاہ پر ماتھا رگڑا۔ تب گوری بی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک گوری بی بڑی ضدی تھیں۔ بات بات پر اٹوائی کھٹوائی لے کے پڑ جاتیں۔ بھوک ہڑتال کر دیتیں گھر

میں کھانہ پکتا، کوئی منہ، نہ جھنا نہ بچوں کا توں، اٹھوا کر مسجد میں بھجوا دیا جاتا گوری بی نہ کہا تیں تو اماں باوا کیسے نوالہ توڑتے۔

بات اتنی سی تھی کہ جب منگنی ہوئی تو لوگوں نے مذاق میں چھینٹے کیے۔

"گوری دلہن کالا دولہا۔"

مگر مغل بچے مذاق کے عادی نہیں ہوتے۔ سولہ سترہ برس کے کالے میاں اندر ہی اندر گھٹتے رہے۔ جل کر مرنڈا ہوتے رہے۔

"دلہن میلی ہو جائے گی خبردار یہ کالے کالے ہاتھ نہ لگانا۔"

"بڑے نازوں کی پالی ہے تمہاری تو پرچھائیں پڑی تو کالی ہو جائے گی۔"

"بڑا تیہا ہے ساری عمر جوتیاں اٹھوائے گی۔"

انگریزوں نے جب مغل شاہی کا انتم سنسکار کیا تو سب سے بری مغل بچوں پر بیتی کہ وہی زیادہ عہدے سنبھالے بیٹھے تھے۔ جاہ جاگیر چھن جانے کے بعد لاکھ کے گھر دیکھتے دیکھتے خاک ہو گئے۔ بڑی بڑی ڈھنڈار حویلیوں میں مغل بچے بھی پرانے سامان کی طرح جا پڑے۔ بھونچکے سے رہ گئے جیسے کسی نے پیروں تلے سے تختہ کھینچ لیا۔

تب ہی مغل بچے اپنے غرور اور خودداری کی تار تار چادر میں سمٹ کر اپنے اندر ہی اندر گھستے چلے گئے۔ مغل بچے اپنے محور سے کچھ کھسکے ہوئے ہوتے ہیں۔ کمرے مغل کی یہی پہچان ہے کہ اس کے دماغ کے دو چار پیچ ڈھیلے یا ضرورت سے زیادہ تنگ ہوتے ہیں۔ عرش سے فرش کی طرف لڑھکے تو ذہنی توازن ڈگمگا گئے۔ زندگی کی قدریں خلط ملط ہو گئیں۔ منطق سے زیادہ جذبات سے کام لینے لگے۔

انگریز کی چاکری لعنت اور محنت مزدوری کسرِ شان۔ جو کچھ ڈانا تہ بچا اسے بیچ بیچ کر کھاتے رہے۔ ہمارے ابا کے چچا روپیہ پیسہ کی جگہ بچی کے جہیز کے پلنگ کے پایوں سے چاندی کا پتر اکھیڑے جاتے تھے۔ زیور اور برتنوں کے بعد ٹکے جوڑے نوچ نوچ کر کھاتے۔ پان دان کی کلھیاں الگ بٹے سے کچل کر ٹکڑا ٹکڑا بیچیں اور کھائیں۔ گھر کے مرد دن بھر پلنگ کی ادوائین توڑتے۔ شام کو پرانی گھسی اچکن پہنی اور شطرنج پچیسی کھیلنے نکل گئے۔ گھر کی بیویاں چھپ چھپ کر سلائی کر لیتیں۔ چار پیسوں سے چولہا جل جاتا۔ یا محلے کے بچوں کو قرآن پڑھا دیتیں تو کچھ نذرانہ مل جاتا۔

کالے میاں نے دوستوں کی چھیڑ خانی کو جی کا گھاؤ بنا لیا۔ جیسے موت کی گھڑی نہیں ٹلتی ویسے ہی ماں باپ کی طے کی ہوئی شادی نہ ٹلی۔ کالے میاں سر جھکا کے دولہا بن گئے۔ کسی سرپھری نے عین آرسی مصحف کے وقت اور چھیڑ دیا۔

"خبردار جو دلہن کو ہاتھ لگایا، کالی ہو جائے گی۔"

مغل بچہ چوٹ کھائے ناگ کی طرح پلٹا۔ اس نے بہن کا آنچل نوچا اور باہر چلا گیا۔

ہنسی میں کھسی ہو گئی۔ ایک ماتم برپا ہو گیا۔ مردان خانہ میں اس ٹرہ بجڑی کی خبر ہنسی میں اڑا دی گئی بغیر آرسی مصحف کے رخصت ایک قیامت تھی۔

"بخدا میں اس کا غرور چکنا چور کر دوں گا۔ کسی ایسے ویسے سے نہیں مغل بچہ سے واسطہ ہے؟" کالے میاں پھنکارے

کالے میاں شہتیر کی طرح پوری مسہری پر دراز تھے دلہن ایک کونے میں گٹھری بنی کانپ رہی تھی۔ بارہ برس کی بچی کی بساط ہی کیا؟

"گھونگٹ اٹھاؤ" کالے میاں ڈکرائے۔

دلہن اور گٹھری مڑی ہو گئی۔

"ہم کہتے ہیں گھونگٹ اٹھاؤ" کہتی کے بل اٹھ کر بیٹھے۔ سہیلیوں نے تو کہا تھا۔ دولہا ہاتھ جوڑے گا پیر پڑے گا پر خبردار جو گھونگٹ کو ہاتھ لگانے دیا۔ دلہن جتنی زیادہ مدافعت کرے اتنی ہی زیادہ پارسا ہو۔

"دیکھو جی تم نوابزادی ہو گی اپنے گھر کی۔ ہماری تو پیر کی جوتی ہو۔ گھونگٹ اٹھاؤ، ہم تمہارے باپ کے نوکر نہیں۔"

دلہن پر جیسے فالج گر گیا۔

زندگی کا مقصد

عصمت کو افسانوں میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے کسی پہاڑ یا دریا کے بیان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی زندگی کا پہاڑ ہے اور یہی گھر کا دریا جو عمر کی جڑ کاٹتا جاتا ہے اور زندگی کی کہانی پلاٹ اور موقع محل ترتیب دیتی چلی جاتی ہے اور انہیں میں انداز بدل بدل کر گھومتے رہنا اور دوسروں کو اپنی طرف کھینچتے رہنا یہی عصمت کے قلم، فکر و فن اور زندگی کا مقصد ہے۔ دلچسپ باتیں کرنا اور ان سے حظ اٹھانا ایک فن ہے اور جب تک عصمت کی طرح کوئی یہ فن حاصل نہ کرے، ایسے بے کیف مصائب و آلام سے آلودہ سماجی نظام کی کشمکشوں کو ہنسی کھیل کر سننے، سمجھنے اور بیان کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر محمد عقیل

کالے میاں چیتے کی طرح لپک کر اٹھے جوتیاں اٹھا کر بغل میں دبائیں اور کھڑکی سے پائیں باغ میں کود گئے۔ صبح کی گاڑی سے وہ جودھپور روانہ ہو گئے۔

گھر میں سناٹا پڑا تھا۔ ایک اکا بی جو دلہن کے ساتھ آئی تھیں جاگ رہی تھیں۔ کان دلہن کی چیخوں کی طرف لگے تھے۔ جب دلہن کے کمرے سے چوں بھی نہ آئی تو اُن کے تو پیروں کا دم نکلنے لگا ہے ہے کیسی بے حیا لڑکی ہے۔ لڑکی جتنی معصوم اور کنواری ہوگی اتنا ہی زیادہ دوند مچائے گی۔ کیا کچھ کالے میاں میں کھوٹ ہے۔ جی چاہا کوئیاں میں کود کے قصہ پاک کریں۔ چپکے سے کمرے میں جھانکا تو جی سن سے ہو گیا۔ دلہن جیسی کی تیسی دھری تھی اور دولہا غائب!

بڑے غیر دلچسپ قسم کے ہنگامے ہوئے تلواریں کھنچیں بڑی مشکل سے دلہن نے جو بیتی تھی کہہ سنائی۔ اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ خاندان میں دو پارٹیاں بن گئیں، ایک کالے میاں کی۔ دوسری گوری بی کی طرف دار۔

"وہ آخر خدائے مجازی ہے۔ اُس کا حکم نہ ماننا گناہ ہے" ایک پارٹی بھی سوچ تی تھی۔

"کہیں کسی دلہن نے خود گھونگٹ اٹھایا ہے؟" دوسری پارٹی کی دلیل تھی۔

کالے میاں کو جودھپور سے بلوا کر دلہن کا گھونگٹ اٹھوانے کی ساری کوششیں ناکام گئیں۔ وہ وہاں گھوڑ سواروں میں بھرتی ہو گئے اور بیوی کو نان نفقہ بھیجتے رہے جو گوری بی کی اماں سمدھن کے منہ پر مار آتیں۔

گوری بی کلی سے پھول بن گئیں۔ ہر اٹھواڑے ہاتھ پیر میں مہندی رچاتی رہیں اور بندھے ٹکے ڈوپٹے اوڑھتی رہیں اور جیتی رہیں۔

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ باوا کی مرن گھڑی آ پہنچی۔ کالے میاں کو خبر گئی تو نہ جانے کس موڈ میں تھے کہ بھاگے آئے۔ باوا موت کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ بیٹھے۔ کالے میاں کو طلب کیا دلہن کا گھونگٹ اٹھانے کی بار پھر پھول پر سکوٹ ہوئی۔

کالے میاں نے سر جھکا دیا۔ مگر شرط وہی رہی کہ حشر ہو جائے مگر گھونگٹ تو دلہن کو اپنے ہاتھوں اٹھانا پڑے گا:
"قبلہ و کعبہ میں قسم کھا چکا ہوں میرا سر قلم کر دیجیے مگر قسم نہیں توڑ سکتا۔"

منچلے بچوں کی تلواریں زنگھیا چکی تھیں۔ آپس کی مقدمہ بازیوں نے سارا لطف نکال دیا تھا۔ بس احمقانہ ضدیں رہ گئی تھیں، ایک انہیں کو کلیجے سے لگائے بیٹھے تھے۔ کسی نے کالے میاں سے نہ پوچھا تم نے ایسی احمقانہ قسم کھائی ہی کیوں

کر اچھی بھلی زندگی عذاب ہوگئی۔

خیر صاحب گوری بی پھر سے دلہن بنائی گئیں، کیا اینٹ والا مکان پھر پھولوں اور شمامۃ العنبر کی خوشبو سے مہک اُٹھا۔ اماں نے سمجھایا "تم اس کی منکوحہ ہو بیٹی جان۔ گھونگٹ اٹھانے میں کوئی عیب نہیں۔ اس کی ضد پوری کرو دو مغل بچہ کی آن رہ جائے گی، تمہاری دنیا سنور جائے گی، گودی میں پھول برسیں گے۔ اللہ رسول کا حکم پورا ہوگا۔"

گوری بی سر جھکائے سنتی رہیں۔ کچی کلی سات سال میں نوخیز قیامت بن چکی تھی۔ حسن اور جوانی کا ایک طوفان تھا جو اُن کے جسم سے پھوٹا نکلتا تھا۔

عورت کالے میاں کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ سارے حواس اسی ایک نکتہ پر مرکوز تھے۔ مگر ان کی قسم ایک میخ دار آہنی گولے کی طرح اُن کے حلق میں پھنسی ہوئی تھی۔ اُن کے تخیل نے سات سال آنکھ مچولی کھیلی تھی۔ انہوں نے بیسیوں گھونگٹ نوچ ڈالے رنڈی بازی لونڈے بازی، بٹیر بازی کبوتر بازی غرض کوئی بازی نہ چھوڑی مگر گوری بی کے گھونگٹ کی چوٹ دل میں پنجے گاڑے رہی۔ جو سات سال سہلانے کے بعد زخم بن چکی تھی۔ اس بار انھیں یقین تھا ان کی قسم پوری ہوگی۔ گوری بی ایسی عقل کی کوری نہیں کہ جینے کا یہ آخری موقع بھی گنوا دیں، دو انگلیوں سے ہلکا چلکا آنچل ہی تو سرکانا ہے کوئی پہاڑ تو نہیں ڈھونے۔

"گھونگٹ اٹھاؤ" کالے میاں نے بڑی لجاجت سے کہنا چاہا مگر مغلئی دبدبہ غالب آگیا۔

گوری بیگم غرور سے تمتمائی سناٹے میں بیٹھی رہی۔

"آخری بار حکم دیتا ہوں۔ گھونگٹ اٹھاؤ، ورنہ اسی طرح پڑی مر جاؤگی، اب جو گیا پھر نہ آؤں گا۔"

مارے غصہ کے گوری بی لال بھبوکا ہوگئیں۔ کاش اُن کے سلگتے رخسار سے ایک شعلہ لپکتا اور وہ منحوس گھونگٹ خاکستر ہو جاتا۔

بیچ کمرے میں کھڑے کالے میاں کوڑیالے سانپ کی طرح جھومتے رہے۔ پھر جوتے بغل میں دبائے اور پائیں باغ میں اُتر گئے۔

اب وہ پائیں باغ کہاں؟ ادھر پچھواڑے لکڑیوں کی ٹال لگ گئی۔ بس دو جامن کے پیڑ رہ گئے تھے اور ایک جھاوری بدگو۔ بیلے چمپئی کی روشیں، گلابوں کے جھنڈ، شہتوت اور انار کے درخت کب کے لٹ پٹ گئے۔

جب تک ماں زندہ رہیں گوری بی کو سنبھالے رہیں اُن کے بعد یہ ڈیوٹی خود گوری بی نے سنبھال لی۔ ہر جمعرات کو مہندی پیس کر پابندی سے لگاتیں دوپٹہ رنگ چن کر ٹانکتیں اور جب تک سسرال زندہ رہی تہوار پر سلام کرنے جاتی رہیں۔

اب کے جو کالے میاں گئے تو غائب ہی ہو گئے۔ برسوں اُن کا سراغ نہ ملا۔ ماں باپ رو رو کر اندھے ہو گئے، وہ نہ جانے کس

جنگلوں کی خاک چھانتے پھرے۔ کبھی خانقاہوں میں اُن کا سراغ ملتا۔ کبھی کسی مندر کی سیڑھیوں پہ پڑے ملتے۔

گوری بی کے سنہری بالوں میں چاندی گھُل گئی۔ موت کی جھاڑو کام کرتی رہی۔ آس پاس کی زمینیں مکان کوڑیوں کے مول بکتے گئے۔ کچھ پُرانے لوگ زبردستی ڈٹ گئے۔ کنجڑے قصائی آن بسے، پرانے محل ڈھے کر نئی دنیا کی بنیاد پڑنے لگی۔ پرچون کی دکان، ڈسپنسری، ایک مرگھلا سا جنرل سٹور بھی اُگ آیا جہاں المونیم کی پتیلیاں اور ریلیف چائے کی پڑیوں کے ہار لٹکنے لگے۔

ایک مفلوج مٹھی کی دولت رِس کر بکھر رہی تھی۔ چند محتاط انگلیاں سمیٹنے میں لگی تھیں۔ جو کل تک اودوائین پہ بیٹھتے تھے جھک جھک کر سلام کرتے تھے آج ساتھ اُٹھنا بیٹھنا کسرِ شان سمجھنے لگے۔

گوری بی کا زیور آہستہ آہستہ لالہ جی کی تجوری میں پہنچ گیا۔ دیواریں ڈھے رہی تھیں۔ چھجّے جھول رہے تھے۔ بچے کھچے مغل بچے افیون کا انٹا نگل کر پتنگوں کے پیچ لڑا رہے تھے۔ تیتر بٹیر سدھا رہے تھے اور کبوتروں کی دُموں کے پر گن کر ہلکان ہو رہے تھے۔ لفظ مرزا جو کبھی شان اور دبدبے کی علامت سمجھا جاتا تھا مذاق بن رہا تھا۔ گوری بیوی کولہو کے اندھے بیل کی طرح زندگی کے چھکڑے میں جتی اپنے محور پر گھومے جا رہی تھیں۔ اُن کی کرنجی آنکھوں میں تنہائیوں نے ڈیرہ ڈال دیا تھا۔

ان کے لیے طرح طرح کے افسانے مشہور تھے کہ ان پر جنوں کا بادشاہ عاشق تھا۔ جونہی کالے میاں اُن کے گھونگٹ کو ہاتھ لگاتے جھٹ تلوار سونت کر کھڑا ہو جاتا۔ ہر جمعرات کو عشا کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھتی ہیں تب سارا آنگن کوڑیالے سانپوں سے بھر جاتا ہے۔ پھر سنہری کلغی والا سانپوں کا بادشاہ اژدہے پر سوار ہو کر آتا ہے۔ گوری بی کی قرأت پر سر دھنتا ہے پو پھٹتے ہی سب ناگ رخصت ہو جاتے ہیں۔

جب ہم یہ قصے سنتے تو کلیجے اُچھل کر حلق میں پھنس جاتے اور رات کو سانپوں کی پھنکاریں سن کر سوتے میں چونک کر چیخیں مارتے۔

گوری بی نے ساری عمر کیسے کیسے ناگ کھلائے ہوں گے کیسے اکیلی نامراد زندگی کا بوجھ ڈھویا ہو گا۔ ان کے رسیلے ہونٹوں کو کبھی کسی نے نہیں چوما۔ انہوں نے جسم کی پکار کو کیا جواب دیا ہو گا؟

کاش یہ کہانی یہیں ختم ہو جاتی۔ مگر قسمت مسکرا رہی تھی۔

پورے چالیس برس بعد کالے میاں اچانک آپ ہی آن دھمکے۔ انھیں قسم قسم کے لاعلاج امراض لاحق تھے پور پور سڑ رہی تھی روم روم رِس رہا تھا۔ بدبو کے مارے ناک سڑی جاتی تھی۔ بس آنکھوں میں حسرتیں جاگ رہی تھیں جن کے سہارے جان سینے میں اٹکی ہوئی تھی۔

"گوری بی سے کہو مشکل آسان کر جائیں۔"

ایک کم ساٹھ کی دلہن نے روٹھے ہوئے دولہا میاں کو منانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مہندی گھول کر ہاتھ پیروں میں رچائی۔ پانی سمو کر پنڈا پاک کیا۔ سہاگ کا چکٹا ہوا تیل سفید لٹوں میں بسایا۔ صندوق کھول کر تورہ بورہ ٹپکتا جھڑتا بری کا جوڑا نکال کر پہنا اور ادھر کالے میاں دم توڑتے رہے۔

جب گوری بی شرماتی لجاتی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اُن کے سرہانے پہنچیں تو جھلنگے پہ چیکٹ تکیے اور گودڑ بستر پہ پڑے ہوئے کالے میاں کی مٹھی بھر ہڈیوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ موت کے فرشتے سے اُلجھتے ہوئے کالے میاں نے حکم دیا۔

"گوری بی گھونگٹ اُٹھاؤ۔"

گوری بی کے ہاتھ اُٹھے مگر گھونگٹ تک پہنچنے سے پہلے گر گئے۔ کالے میاں دم توڑ چکے تھے۔

وہ بڑے سکون سے اکڑوں بیٹھ گئیں، سہاگ کی چوڑیاں ٹھنڈی کیں اور رنڈاپے کا سفید آنچل ماتھے پر کھنچ گیا۔

ایک بات

عصمت مضمون لکھتی ہے تو افسانے کا گمان ہوتا ہے، یہی اس کی تحریر کی عظمت ہے۔

کہتے ہیں ایک آدمی تھا۔ اس کے تھیں چار بیویاں اور کمبختیں سب کی سب توتلی۔ ایک دن چند دوستوں کی دعوت کی۔ میاں نے سختی سے بولنے کو منع کر دیا۔ کہ سنیں گے تو ہنسی اڑائیں گے پر جب انہوں نے کھانے کی تعریف کی تو بیویوں کا جی نہ مانا اور بول ہی اٹھیں۔ تین تو خیر اپنی اپنی تعریف میں بولیں۔ پر چوتھی بیوی نے کہا۔ "بھلا ہوا جو ہم نہ بولے۔ میاں آئیں گے تو جوتے لگیں گے۔"

تو صاحب وہ جوتے لگے۔ مگر سب سے زیادہ ان آخری بولنے والی کے۔

تو آج کل ساقی سب کی باتیں سن رہا ہے تو ہم کیوں چپ رہیں۔ آخر ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ آج کل باتوں کا عام موضوع "نیا ادب" ہے۔ ہمدرد لوگ انسانیت، اخلاق، ادب، اور تہذیب کو گمراہی سے بچانے کے لیے اس شتر بے مہار یعنی نئے ادب کے پیچھے ہر قسم کے ہتھیار لے کر حملہ آور ہوتے ہیں اور قبلہ اونٹ صاحب کچھ بوکھلائے سے نظر آ رہے ہیں۔ اللہ جانے کس کروٹ بیٹھتے ہیں یا اور بدحواس ہونے کا ارادہ ہے۔

سنا ہے جب اونٹ کو غصہ آتا ہے۔ تو دشمن کی کھوپڑی اتار لیتا ہے۔ کیا معلوم بھئی!

اور ذرا ہتھیار ملاحظہ ہوں اور بد کانے والے

"نیا ادب فحش نگاری ہے۔"

"نیا ادب سوائے جنسی الجھنوں کے کچھ نہیں!!"

"نیا ادب گر رہا ہے!!!"

یا اللہ یہ فحش نگاری کیا ہوتی ہے۔ ہماری ایک خالہ تھیں جو کمسن لڑکیوں کو ہر وقت ڈھنگ سے دوپٹہ اوڑھنے کی تلقین کیا کرتی تھیں۔ ذرا شانہ سے دوپٹہ ڈھکا اور ان کی آنکھوں میں خون اترا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس خاص حصۂ جسم سے کیوں جلتی تھیں۔ معلوم ہوا کہ محترمہ خود چونکہ نہایت مرجھائی ہوئی گھٹائی کی شکل کی تھیں۔ لڑکیوں کے جسم کو دیکھ کر کوئلہ ہو جاتی تھیں — بیچاری خالہ! نہ جانے کتنی خالائیں اور نانیاں جوانی کھو کر لڑکیوں کی سوتیں بن جاتی ہیں۔

یہی حال نئے ادب نے پرانے ادب کا کر دیا ہے ۔ اور وہ اس کے شباب کی تپش سے پگھلا جا رہا ہے ۔ سمجھ میں نہیں آتا آخر اگر عریانی نظر آتی ہے تو لوگ بلبلا کیوں اٹھتے ہیں ۔ یہ مانا کہ یورپ کے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت بچپنے ہی سے کچھ اس انداز کی ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک صنفی چیزوں کی کچھ اہمیت ہی نہیں رہ جاتی ۔ وہ جب اس کے متعلق کچھ پڑھتے ہیں تو ان کے کانوں پہ جوں بھی نہیں رینگتی اور یہاں سانپ پھنپھنانے لگتا ہے ۔ کیوں صاحب کیا ضروری ہے کہ اس مقدس سانپ کو ہم اپنی آئندہ نسل کا خون چوسنے کے لیے زندہ چھوڑ دیں کیوں نہ اس کا پھن جلد از جلد کچل کر قصہ پاک کر دیا جائے اور نئے ادیب جو چن چن کر سانپوں کو کچلنے کی فکر میں ہیں ۔ دشمنِ دین و دنیا کیوں سمجھے جا رہے ہیں ۔ ؟

مگر یہ بھی تو غلط ہے کہ نئے ادب میں صرف عریانی ہی ہے ۔ وہ مثل ہے ناکہ جیسی روح ویسے فرشتے ۔ چند اصحاب نے صرف عریانی کو پڑھا اور وہ ان کے دل و دماغ پر نقش کر گئی ۔ باقی مطلب کی باتیں معلوم ہی نہ ہوئیں ۔ لہذا نظر انداز کر دیں ۔ مگر یقیناً عریاں جملے سو سو بار رٹے ۔ ذرا غور کیجئے عریانی پڑھنے کے شوقین تو معصوم بن کر چھوٹ جائیں اور لکھنے والا پکڑا ۔

یہ ضروری نہیں کہ ہر گندگی فضول کو بھی کھائی جائے اور بیکار سڑکوں پہ ننگے گھومنے لگیں لیکن اگر غسل آفتاب کے لیے کسی ضروری حصۂ جسم کو کھولنے کا موقع آئے تو اس میں کیا شرم ۔ اگر پٹی کھولنے سے زخم خشک ہو جائے تو یہ عریانی نہیں ہوتی بلکہ اسے علاج کہتے ہیں ۔ اور وہ بزرگ جو اس سے چڑ جائیں قابلِ رحم ہیں یہ تو ٹھیک ہے کہ عریانی تکلیف دہ ہوتی ہے اور اس عریاں ادب کے آئینے میں نہ جانے کیا لوگوں کو جھلک نظر آتی ہے کہ وہ اینٹھ کر غریب آئینے پہ دانت پیس کر دوڑتے ہیں ۔ بھلا سوچئے تو اس میں آئینہ کا قصور ہی کیا ؟

شاید افسانوں اور کہانیوں میں عریانی دیکھ کر لوگوں کے رکیک جذبات میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے ۔ ایک صاحب کو زہرہ کا مرمریں مجسمہ دیکھ کر مرگی کا دورہ پڑ جاتا ہے ۔ اب اس کا علاج کسی ادیب کے پاس تو نہیں ۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ واقعہ کو واقعہ سمجھ کر پڑھیئے ۔ صاحب یہ تو زندگی کی تصویر ہے کھلی بھی ہے ڈھکی بھی ہے ، گر عریانی ہے بھی تو کیا ۔ ضرور کہ مرگی کا دورہ ضرور ڈالا جائے ۔ ضبط اور جذبات پہ قابو بھی تو کوئی چیز ہے اور ایسا عریانی میں عیب ہی کیا ہے جو آپ ادب کی عریانی سے لرز سے جاتے ہیں ۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ادیب خود دنیا کی عریانی سے لرز اٹھا ہے اور دہشت کے مارے کانپ رہا ہے ۔ وہ تو صرف حروف میں انہی باتوں کو منتقل کر رہا ہے جو دنیا میں ہو رہی ہیں ۔ نیا ادب موجودہ زمانہ کی تاریخ ہے ۔ برسوں بعد بھی جب یہ نیا ادب نیا نہ رہے گا ۔ تب بھی اسی طرح سیاسی ، اقتصادی اور معاشرتی حالات کے متعلق تاریخی مواد پہنچاتا رہے گا ۔ یہی کہانیاں اور نظمیں تاریخ کے صفحات میں تبدیل ہو جائیں گی ۔ اگر نیا ادب گندہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نئی دنیا گندی ہے ، جس کی یہ تصویر

صاف گوئی

عصمت کو اپنے فن سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں۔ عصمت بہت سی باتوں کو شدت سے محسوس کرتی ہیں۔ یہ باتیں اُن کے آس پاس کے سماج کے متحدہ فیصلوں اور مَن بھاتے عقیدوں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں، لیکن وہ ان اخلاقی فیصلوں کی پابندیوں سے بے نیاز ہوکر سچ بات کو جیسا دیکھتی ہیں، ویسا ہی کہہ دیتی ہیں اور اس صاف گوئی میں کبھی بے رحمی اور بیدردی سے کام لینے میں بھی اُنہیں کوئی تکلف نہیں ہوتا۔

سیّد وقار عظیم

ہے۔ مصوّر کا کیا قصور؟

تاریخ اور ادب ساتھ ساتھ رہے ہیں اور رہیں گے۔ اقتصادیات کو بھی ادب سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ سیاسی مجبوریاں ادب کو سیاست سے دُور رکھیں۔ پھر بھی دبا چھپا رنگ پھوٹ ہی نکلے گا۔ اس نئے ادب سے پہلے رومان اور مزاح کا زور تھا۔ پطرس، عظیم بیگ، رشید احمد، شوکت تھانوی۔ امتیاز علی تاج فرحت اللہ بیگ سب ہی تو کم و بیش ایک ہی سا لکھتے تھے۔ ذرا غور سے پڑھیے، وہی بیوی کے مظالم، دوستوں کی خوش مذاقیاں، گھریلو جھگڑے سب کے سب ایک ہی بات بار بار لکھتے تھے۔ ہاں یہ بات اور تھی کہ سب کا رنگ جدا تھا اور اب نئے ادیب کیا لکھ رہے ہیں، جنسی الجھنیں، امیر و غریب کے جھگڑے، زندگی سے جنگ اور جملہ زندگی کی تلخیاں! یہ تو ہمیشہ ہی ہوتا ہے۔ پھر نئے ادیبوں سے کیوں شکایت ہے کہ وہ سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ کس قدر فضول نقص ہے۔ ارے صاحب طیریا پھیلتا ہے تو سب کو کونین ہی دیتے ہیں۔ دکھ درد میں سب الستان ایک ہی طرح روتے پیٹتے ہیں۔ کوئی گانا تو ہو نہیں رہا جو سُر تال ہی ہو۔ پرانا ادب بھی زندگی کی تصویر تھی اور نیا ادب بھی۔ یہ مانا کہ جب پرانا ادب لکھا گیا تو یہ دنیا اتنی گندی اور عریاں نہیں تھی۔ اور اب جدھر نظر اٹھا کر دیکھئے دنیا ننگی، بھوکی، چور، اچکی اور مکّار نظر آتی ہے نئے ادیب کیا کریں۔ کیسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر گل بکاؤلی اور مثنوی گلزارِ نسیم لکھنے لگیں۔ فسانۂ آزاد اور مذاقیہ کہانیاں لکھتے چلے جائیں نئے ادیب زیادہ ترننگے بھوکے اور حساس ہیں دل و دماغ زیادہ تیزی سے کام کر رہے ہیں اور ذرا سی چوٹ سے تلملا اٹھتے ہیں۔ ان کے بھیانک خواب جن کی اور بھی بھیانک تعبیریں! یہ ہماری دنیا کا نقشہ ہے۔ بُرا ہے یا اچھا۔ یہ فیصلہ آئندہ پود کے ہاتھ میں ہوگا کہ وہ اسے سینہ سے لگائے یا ٹھکرا دے۔ ہم اور آپ بھی انصاف سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اور آپ کا فیصلہ بیکار ہے کیونکہ وہ بے اثر ہوگا۔ نیا ادب جو کچھ بھی ہے، وہ موجودہ نوجوانوں کی پکار ہے جو چوٹ کھایا ہوا سانپ ہے۔ وہ دب نہیں سکتا آپ کے اعتراض اور طعنے اسے خاموش دبک جانے پر مجبور نہیں کر سکتے وہ چیخے گا ——— دکھ ہوگا تو روئے

گا۔ یہ جو جنسی بھوک ہے جس پر مہذب لوگوں کو اعتراض ہے۔ اسی طرح کہانیوں میں جھلکے جائے گی۔ جب بھوک ہی ٹھہری تو پھر ہائے ہائے کیوں نہ ہو۔ نئے ادیب اتنے شرمیلے اور بزدل نہیں جو طعنوں تشنوں سے ڈر جائیں گے۔ یہ جنسی پکار جوانسانوں میں نظر آرہی ہے۔ کیا ان کا تعلق اقتصادی اور معاشرتی حالات سے کچھ بھی نہیں۔ کیا اس میں آپ کو سیاست کی چاشنی نظر نہیں آتی۔ آپ نے ڈیمانڈ اور سپلائی Demand & supply) کے متعلق اکنامکس میں پڑھا ہوگا۔ ذرا اس نکتے کو ہماری موجودہ زندگی پر پرکھیئے۔ جنسی ڈیمانڈ بھی ہے اور سپلائی بھی۔ مگر مارکٹ نہیں۔ یعنی عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی اور خواہشات بھی، مگر ان کا ذکر بے شرمی، ہندوستان کے لوگ غریب ہیں ـــــ اکثر نادار ہیں، ناداری میں شادی مصیبت ـ ناداری میں عیاشی گناہ ـــــ ناداری میں جینا منع، کیوں ؟ آخر کیوں ؟ ہمارے نوجوان باوجود تعلیم اور جسمانی قابلیت رکھنے کے دنیا کی دلچسپیوں سے محروم۔ علم تو اُلٹا ہمارے لیے مصیبت ہو گیا کہ نہ پڑھتے نہ یہ معلوم ہوتا کہ دنیا کے دوسرے انسان کیا مزے اڑا رہے ہیں مزے سے اپنی چمڑی میں مگن رہتے۔ مگر اب ہم جانتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اور ملکوں میں زندہ رہنا جرم نہیں اور یہاں کے نوجوانوں کو کچھ بھی نصیب نہیں۔ یہاں ہر بات عیب، ہر بات گندی، عریاں اور مخرب اخلاق، وہاں عیش کے ہزاروں اسباب، یہاں زندگی کے خواب دیکھنا جرم۔ خیر اگر یہ مصیبتیں تھیں تو

عظیم بیگ چغتائی کی بیگم، نواسی اور خدیجہ صاحبہ محوِ گفتگو ہیں

کم از کم احساس ہی کند ہوتا۔ کاش کا شش مٹی کے تودے ہوتے جو نہ سنتے نہ دیکھتے نہ دکھ سکھ سے چلاتے۔ زمانہ کی ٹھوکروں میں لڑھکتے فنا کی طرف چلے جاتے مگر نئی دنیا کا نیا بیٹا ضدی بدمزاج اور اکھڑ ہے۔ وہ موجودہ نظام کو پسند نہیں کرتا۔ وہ ایک نئے نظام کے لیے بیکل ہے وہ اسے بدل ڈالنا چاہتا ہے۔ مگر ابھی تو وہ بدنظمی سے متنفر، غصہ ہو ہو کر اپنی ہی بوٹیاں چبا رہا ہے۔ خود اپنا ہی جسم اور روح چیر کر پھینک رہا ہے اور کل وہ اس نظام کو توڑ پھوڑ کر دوسرا نظام بنائے گا۔ مگر اس نظام کو توڑنے سے پہلے اسے نہ جانے کس کس کو کچلنا پڑے گا، کس کس کے پیروں سے روندا جائے گا۔ اور جو باقی رہے گا وہی نئے نظام کی تکمیل کرے گا۔

یہ نظام کیا ہوگا؟ یہ ابھی کسی کو نہیں معلوم۔ نئے ادب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نئے نظام میں دُکھ، بھوک اور افلاس تو نہ ہوگا۔ فاقے۔ جنسی اور روحانی نہ ہوں گے۔ بدمعاشی نہ ہوگی۔ طوائفوں کے اڈے نہ ہوں گے۔ اگر ہوں گے تو صرف انسانوں کے گھر ہوں گے جہاں انسان رہے گا۔

عورتوں کو بھوکی کتیوں کی طرح غلیظ موریوں میں عذاب دوزخ بن کر نہیں بیٹھنا پڑے گا۔ مرد حیوانیات سے دور ہوں گے۔ قدرت کے اصول کے مطابق جو انسان پیدا ہوں گے وہ انسان مانے جائیں گے اور انہیں صرف سماج کا پیٹ بھرنے کے لیے حلال نہیں کیا جائے گا۔ شادی بیاہ صرف پیسے ہی والوں کے نہ ہوں گے بلکہ ہر تندرست انسان کو مکمل زندگی گزارنے کا حق حاصل ہوگا۔

نیا ادب پکار پکار کر انسان کو جینے کا حق دلانا چاہتا ہے۔ زندگی اور اس کے سارے لوازمات جو باپ دادا کی وراثت بن گئے ہیں۔ انسان کا حق ہو جائیں گے۔ نئی دنیا کے دُکھ بہت بڑھ گئے اور نیا ادب اسی دنیا کے دکھوں کی آہ ہے جو دنیا کے ہر ذی روح نوجوان کے چُور چُور جسم سے نکل رہی ہے۔ طعنے دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بڑھیاں طعنے دیتیں مر گئیں۔ بوڑھے لاحول بھیجتے چل دیئے۔ مگر نوجوان زندگی کی کش مکش میں پھنسا ہوا ہے۔ وہ مٹنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ بزدل نہیں اور اسے بے شرمی کے خطاب سے ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ جب ادب کا سوال آتا ہے تو اس میں زنانہ مردانے ادب کا کیا سوال۔ جو نظام لڑکوں کو پسند نہیں وہ لڑکیوں کو کب پسند آ سکتا ہے مرد اگر چیخ سکتا ہے تو عورت کو بھی کراہنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔

نئے ادب کا مقابلہ ایک بزرگ جنسی کتابوں سے کرتے ہیں۔ بالکل ٹھیک، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہمارے ملک کے لوگ جنسی معلومات پر

ایک یادگار دستاویزی خصوصی
اُردو کا، عظیم افسانہ نمبر
اس میں اُردو افسانے کا صد سالہ انتخاب شامل ہے جو دو جلدوں میں پیش ہوگا۔
پہلی جلد —— حصول آزادی تک
دوسری جلد —— حصول آزادی کے بعد

لکھی ہوئی کتابوں کو صرف لذت کے لیے پڑھتے ہیں اسی طرح وہ نئے ادب سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ جنسی معلومات پر کتابیں طبی اصول واضح کرنے کو لکھی گئی تھیں۔ لیکن لوگ ان سے ادبی ذوق فرمانے لگے اور اسی طرح نئے ادب کو ناول اور افسانہ سمجھ کر مزہ لینا چاہتے ہیں۔ مگر بجائے اس میں چٹخارے دار مسالے کے حیب کو نین نکلتی ہے تو غریب ادیب کے جنم میں کھوتے کہتے ہیں۔

آخر میں ایک بات نئے ادیبوں سے! ان فضول طعنوں کی پروا نہ کیجیے۔ یہ اعتراض کب نہیں ہوئے! کس نے نہیں کیے؟ سوائے دادی اماں کے لاڈلے بیٹوں کے کون ایسا ہے جس نے کبھی بزرگوں سے شاباشی وصول کی ہو! نوجوانی سے بزرگوں کو ہمیشہ نفرت رہی ہے اور رہے گی سچ تو یہ ہے کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں یہ بزرگوں کے لیے ہے بھی نہیں۔ کچھ نہیں تو ادب سے سر جھکا کر مسکرا دیجیے۔ لکھیے ضرور لکھیے ضرور لکھیے جو کچھ بھی آپ دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، سوچتے ہیں وہ ضرور لکھیے۔ نہ زبان کی غلطیوں سے ڈریئے نہ اس بات سے ڈریئے کہ کوئی آپ کو ادیب نہیں مانتا۔ اگر آپ جس دنیا میں رہتے ہیں۔ اس میں کچھ مسموم کانٹے ہیں، کچھ بھیانک درندے ہیں۔ کچھ خوفناک کیڑے مکوڑے ہیں تو آئندہ نسل کے لیے اسے لکھ جائیے۔ اس کا سبق آپ کے ہی تجربے ہوں گے۔ آپ کے ہی مشاہدے ان کے ذہنی مشاہدات ہوں گے۔ اچھا، بُرا، کڑوا، کسیلا سب کچھ لکھ دیجیے اور وہ خوراکیں جو ہمارے ششریہ مریض پینے سے انکار کرتے ہیں اور بے طرح مچلے جاتے ہیں۔ آئندہ نسلیں انہیں

ہو فن کے حربے

حق کے اظہار کے لیے عصمت چغتائی نے بہت سے لطیف اور شدید حربوں سے کام لیا ہے تیکھے طنز، چست فقرے، شکر میں لپٹی ہوئی کڑوی باتیں، ہنسی مذاق، ہجو ملیح، پھبتیاں، باتوں کی چٹکیاں، ہنس ہنس کر سب کچھ کہہ جانا، یہ سب سیدھی سادی روزمرہ کی باتیں ان کے فن کے ہتھوڑے سے حربے ہیں۔

سیّد وقار عظیم

قدر یہ احترام سے لیں گی۔ کیونکہ آئندہ نسل زیادہ سمجھ دار، روشن دماغ اور اچھے برے کو پرکھنے والی پیدا ہوگی۔ اس کے لیے یہ خوراکیں بھاری ہوں گی۔ وہ نسل واقعہ کو واقعہ سمجھ کر پرکھے گی۔ اس کے جذبات اس قدر بودے نہ ہوں گے جو عریانی اور سچی بات سے بھڑ بھڑا جائیں جیسے شیر کی بو پا کر گھوڑا بدکنے لگتا ہے۔ لکھیے اور اتنا لکھیے کہ یہ ان کے لیے بالکل معمولی بات ہو جائے۔ اور ان جراثیم کو اپنے تیزاب جیسے ادبی مادے سے تباہ کر دیجیے اور یہی روئی کے گالے جن میں ایک چنگاری بھی پڑ جائے تو بھک سے اڑ جاتے ہیں۔ برف کے گالے بنا دیجیے جن میں انگارے بھی سرد پڑ جائیں۔

اور چلتے چلتے ایک بات ان بزرگانِ قوم سے کہ یہ نوجوانوں پہ اعتراض تو اب پرانا فیشن ہو گیا۔ اور پرانی چیز کو دفن ہی کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ بے شک آپ کو برا لگتا ہے اور آئندہ

ادب ان موجودہ ادیبوں کو بُرا لگے گا۔ سوت کسی کو اچھی نہیں لگتی۔

ان اصحاب کو کیونکر بھول جاؤں جو خود تو خوب لکھ چکے اور اب تائب ہو چکے ہیں۔ نصیحت پر تل گئے ہیں۔ ایک صاحب تو بہت ہی بگڑ گئے اور انہوں نے چند لاجواب اشعار بھی گنہگاروں کو راہِ راست پہ لانے کے لیے لکھے جن کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ مجھے بدقسمتی سے ان کا قافیہ اور ردیف اس وقت یاد نہیں آ رہا۔ مگر معنی جو دل پہ نقش ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ یہ ادیب جو ایسی فحش نگاری کرتے ہیں تو کیا ان کی بہن ماں نہیں۔ علاوہ شاعری حسن کے یہ ایک بالکل نرالا اور شاعرانہ گالی دینے کا مہذب طریقہ ہے اور مجھے از حد خوشی ہوئی کہ اور باتوں میں پیچھے سہی لیکن اس ہنر میں ہم ہر ملک سے بہت زیادہ ترقی کر چکے ہیں۔ ان حضرات سے دست بستہ عرض ہے کہ قبلہ اگر ماں بہنیں نہ ہوتیں تو پھر مشاہدہ کہاں ہوتا؟ یہ ادب ہے گپ اور خرافات تو ہے نہیں کہ نشہ پی کر لکھ ڈالا۔ نیا ادب زندگی کی تصویر ہے اور اس کے لیے ماڈل درکار ہیں۔ پھر؟ آپ کہیں گے "شرم نہیں آتی!"

"جی سچ مچ کی تو نہیں آتی۔ اگر آپ کہیں تو دکھاوٹاً شرمانے کو تیار ہیں۔"

اگر مصور شرمانا ہی شروع کر دیتے تو آج آپ کو آرٹ نظر نہ آتا اور پھر نئے ادیب آئینہ ساز ہیں۔ ہر شخص اس آئینہ میں منہ دیکھ کر شرما سکتا ہے۔

اوہ ——— ہاں بس ایک بات اور ان اچھے فرمانبردار بچوں سے جو اخلاق اور تہذیب کے حامی اور ادب سے اسے بچانا چاہتے ہیں۔ وہ ہرگز ہرگز نہ نیا ادب لکھیں اور نہ پڑھیں کیونکہ نیا ادب "اخلاق" اور تہذیب کی دھجیاں بکھیرتا ہے، یہ تو صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو بے خوف اور بے جگرے ہیں۔ جن کا ہاتھ بھی سڑ جائے تو اُسے کاٹ کر پھینک سکتے ہیں۔ بُجا مجبوٹی اور بناوٹی سوسائٹی ——— جو اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ اخباروں نے بائیکاٹ کر دیا۔ یا ادیب رو ٹھ گئے ——— اور وہ دن دُور نہیں جب اس ادب کا ریزہ ریزہ لوگ پلکوں سے چن لیں گے۔ مؤرخین، اکتومسٹ اور محکمہ تعلیم والے اس کو جمع کر لیں گے۔ اگر یہ موجودہ ادب موجودہ زمانہ کی سچی تصویر ہے تو خود بخود عجائب خانہ کی زینت بن جائے گا اور اگر کوڑا کرکٹ ہے تو اپنے راستے لگ جائے گا ——— ہمیں کیا فکر؟

عصمت اگر بالکل عورت نہ ہوتی تو اُس کے مجموعوں میں بھول بھلیاں، تِل، لحاف اور گیندا جیسے اور ملائم افسانے کبھی نظر نہ آتے۔ یہ افسانے عورت کی مختلف ادائیں ہیں۔ صاف، شفاف، ہر قسم کے تصنع سے پاک۔ یہ ادائیں وہ عشوے، وہ غمزے نہیں، جن کے تیر بنا کر مردوں کے دل اور کلیجے چھلنی کئے جاتے ہیں۔ جسم کی بھونڈی حرکتوں سے ان اداؤں کا کوئی تعلق نہیں۔ ان روحانی اشاروں کی منزلِ مقصود انسان کا ضمیر ہے جس کے ساتھ وہ عورت ہی کی انجانی، ان بوجھی مگر مخلص فطرت لیے بغل گیر ہو جاتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو

چوتھی کا جوڑا

وہ سر گھر جا کر دُلہنوں کے چوتھی کے جوڑے سیتی رہی، لیکن جب اپنی بیٹی کی باری آئی تو ....

سہ دری کے چوکے پہ آج پھر صاف ستھری جاجم بچھی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے۔ محلے ٹولے کی عورتیں خاموش اور سہمی ہوئی سی بیٹھی ہوئی تھیں جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو۔ ماؤں نے بچے چھاتیوں سے لگا لیے تھے۔ کبھی کبھی کوئی تھتی سا چڑچڑا بچہ رسد کی کمی کی دہائی دے کر چلا اٹھتا۔

"نائیں نائیں میرے لال" دبلی پتلی ماں اسے اپنے گھٹنے پہ لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان کے چاول سوپ میں پھٹک رہی ہو اور بچہ ہلکارے بھر کر خاموش ہو جاتا۔

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبریٰ کی ماں کے متفکر چہرے کو تک رہی تھیں۔ چھوٹے عرض کی ٹول کے دو پاٹ تو جوڑ لیے گئے تھے، مگر ابھی سفید گزی کا نشان بیونتنے کی کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی۔ کاٹ چھانٹ کے معاملہ میں کبریٰ کی ماں کا مرتبہ بہت اونچا تھا، ان کے سوکھے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے جہیز سنوارے تھے۔ کتنے چھٹی چھوچھک تیار کیے تھے اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔ جہاں کہیں محلہ میں کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی، کبریٰ کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبریٰ کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں، کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں کبھی چوکھٹا کرتیں اور دل ہی دل میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔

"آستین اور گھیر تو نکل آئے گا، گریبان کے لیے کترن میری بقچی سے لے لو۔" اور مشکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کر وہ کترنوں کی پنڈی بنا کر پکڑا دیتیں۔

پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا۔ اور سب کو یقین تھا کہ آج تو کبریٰ کی ماں کی ناپ تول ہار جائے گی جب ہی سب دم سادھے ان کا منہ تاک رہی تھیں۔ کبریٰ کی ماں کے پُر استقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکل نہ تھی، چار گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں لال ٹول کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پہ شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ اداس اداس گہری جھریاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم

اجاگر ہو گئیں جیسے گھنے جنگل میں آگ بھڑک اٹھی ہو، اور انہوں نے مسکرا کر قینچی اٹھا لی۔

محلہ والیوں کے جمگھٹے سے ایک قیمتی اطمینان کی سانس ابھری۔ گود کے بچے بھی ٹھسک دیے گئے چیل جیسی نگاہوں والی کنواریوں نے لیا جھپ سوئی کے ناکوں میں ڈورے پرو دیے۔ نئی بیاہی دلہنوں نے انگشتانے پہن لیے۔ کبری کی ماں کی قینچی چل پڑی تھی۔

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پیر لٹکائے ہتھیلی پہ ٹھوڑی رکھے دور کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح بی اماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی ہیں، اور بقچی کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی ہیں۔ کونڈی کے

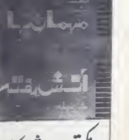

پاس بیٹھی برتن مانجھتی ہوئی کبری کن انکھیوں سے ان لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سرخ چھپکلی سی اس کے زردی مائل مٹیالے رنگ میں لپک اٹھتی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال جب پولے پولے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو ان کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اٹھتا۔ گہری صندوقوں جیسی شکنوں پہ کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا، ہر ٹانکے پہ زری کا کام ہلتا اور مشعلیں کپکپا اٹھتیں۔

یاد نہیں کب اس شبنمی دوپٹے کے بنے ٹکے تیار ہوئے اور گاڑھے کے بھاری قبر جیسے صندوق کی تہ میں ڈوب گئے۔ کٹوریوں کے جال دھندلا گئے۔ گنگا جمنی کرنیں ماند پڑ گئیں، طول کے لچھے اداس ہو گئے مگر کبری کی برات نہ آئی۔ جب ایک جوڑا پرانا ہو جاتا تو اسے چالے کا جوڑا کہہ کر سینت دیا جاتا۔ اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ نئی امیدوں کا افتتاح ہو جاتا۔ بڑی چھان بین کے بعد نئی دلہن چھانٹی جاتی۔ سہ دری کے چوکے پہ صاف ستھری جازم بچھتی۔ محلہ کی عورتیں ہاتھ میں پاندان اور بغلوں میں بچے دبائے جھانجھیں بجاتی آن پہنچتیں۔

"چھوٹے کپڑے کی گوٹ تو اتر آئے گی، پر بچیوں کا کپڑا نہ نکلے گا۔"

"لو بوا — لو اور سنو۔ تو کیا نگوڑی ماری ٹول کی چولیں پڑیں گی؟" اور سب کے چہرے فکر مند ہو جاتے۔ کبری کی ماں خاموش کیمیاگر کی طرح آنکھوں کے فیتے سے طول و عرض ناپتیں، اور بیویاں آپس میں چھوٹے کپڑے کے متعلق کھسر

پھُسر پھُسر کرکے قہقہہ لگاہیں ایسے میں کوئی من چلی کوئی سہاگ یا بنا چھیڑ دیتی، کوئی اور چار ہاتھ آگے والی سمدھنوں کو گالیاں سنانے لگتی بیہودہ گندے مذاق اور چہلیں شروع ہوجاتیں ۔ ایسے موقعوں پہ کنواری بالیوں کو سہ دری سے دور سر ڈھانک کر کھپریل میں بیٹھنے کا حکم دے دیا جاتا اور جب کوئی نیا قہقہہ سہ دری سے ابھرتا تو بیچاریاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں ۔ اللہ! یہ قہقہے انہیں خود کب نصیب ہوں گے ۔

اس چہل پہل سے دور کبریٰ شرم کی ماری مچھروں والی کوٹھڑی میں سر جھکائے بیٹھی رہتی ۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلہ پہ پہنچ جاتی کوئی کلی الٹی کٹ جاتی اور اس کے ساتھ بیویوں کی مت بھی کٹ جاتی ۔ کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی ۔

" یہی تو مشکل تھی، کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا ۔ جو کلی الٹی کٹ جائے تو جان لو نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا یا تو دولہا کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا اس کی ماں ٹھوس کڑوں کا اڑنگا باندھے گی ۔ جو گوٹ میں کان میں آجائے تو سمجھ لو یا تو مہر پہ بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پایوں کے پلنگ پہ جھگڑا ہوگا ۔ جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے بی اماں کی ساری مشاقی اور سگھڑاپا دھرا رہ جاتا نجانے عین وقت پر کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی ۔ بسم اللہ کے زور سے سگھڑ ماں نے جہیز جوڑنا شروع کر دیا تھا ۔ ذرا سی کتر بھی بچی تو تیلے دانی یا شیشی کا غلاف سی کر دھنک گوکرو سے سنوار کر رکھ دیتیں ۔ لڑکی کا کیا ہے کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے جو برات آگئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا ۔

اور جب سے ابا گزرے سلیقہ کا بھی دم پھول گیا ۔ حمیدہ کو ایک دم اپنے ابا یاد آگئے ۔ ابا کتنے دبلے پتلے لمبے جیسے محرم کا علم ۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑے ہونا دشوار تھا ۔ صبح ہی صبح اٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پہ بٹھا کر نہ جانے کیا سوچا کرتے پھر سوچتے سوچتے نیم کی مسواک کا کوئی پھونسڑا حلق میں چلا جاتا اور وہ کھانستے ہی چلے جاتے ۔ حمیدہ بگڑ کر ان کی گود سے اتر آتی ۔ کھانسی کے دھکوں سے یوں ہل ہل جانا اسے قطعی پسند نہ تھا ۔ اس کے ننھے سے غصے پہ وہ اور ہنستے اور کھانسی سینہ میں بے طرح الجھتی جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑپھڑا رہے ہوں ۔ پھر بی اماں آکر انہیں سہارا دیتیں، پیٹھ پہ دھپ دھپ ہاتھ مارتیں ۔

" توبہ ہے ایسی بھی کیا ہنسی ؟"

اچھو کے دباؤ سے سرخ آنکھیں اوپر اٹھا کر ابا بے کسی سے مسکراتے کھانسی تو رک جاتی ۔ مگر وہ دیر تک بیٹھے ہانپا کرتے ۔

" کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے کتنی بار کہا تم سے ۔"

" بڑے شفا خانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ اور روزانہ تین پاؤ دودھ اور آدھی چھٹانک مکھن ۔"

" اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پہ ۔ بھلا ایک تو کھانسی، اوپر سے چکنائی، بلغم نہ پیدا کر دے گی، حکیم کو دکھاؤ کسی ۔"

" دکھاؤں گا ۔" ابا حقہ گڑگڑاتے اور پھر

کہیں نہ کہیں سے جوڑ جمع کر کے شبرات کے مہینے میں کریپ کا دوپٹہ ساڑھے سات روپے میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گزارہ نہ تھا۔ منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلہ میں آ رہا ہے۔ بی اماں کو تو بس جیسے اک دم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ جانو چوکھٹ پر برات آن کھڑی ہوئی اور انہوں نے ابھی دلہن کی مانگ کی افشاں بھی نہیں کتری۔ ہول سے تو ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا کہ :

"بہن میرا مری کا منہ دیکھو جو اس گھڑی نہ آؤ۔"

اور پھر دونوں میں کھسر پھسر ہوئی۔ بیچ بیچ میں ایک نظر دونوں کبریٰ پر بھی ڈال لیتیں جو دلان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کانا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اسی وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکرو، چھ ماشہ سلمہ ستارہ اور پاؤ گز نیفے کے لیے ٹول لا دیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کر کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا، مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اُڑ گئی اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہو گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔ ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے، دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آ رہے تھے۔

"اچھو لگتا۔"

"آگ لگے اس موئے حقّے کو۔ سامی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جوان بیٹی کی طرف بھی دیکھتے ہو آنکھ اُٹھا کر۔"

اور اب ابّا کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے۔ کبریٰ جوان تھی۔ کون کہتا تھا جوان تھی وہ تو جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سناؤنی سن کر ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشاں ہوئیں، نہ اس کے سینے پر طوفان اُٹھے اور نہ کبھی اس نے ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل مچل کر پریتم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی۔ ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی۔ میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔

ابّا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے اور انہیں اُٹھانے کے لیے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ نہ آ سکا۔

اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لیے ضد کرنی چھوڑ دی۔

اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور ایک نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اُٹھ رہی ہے۔

مگر بی اماں کا دستور نہ ٹوٹا۔ وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگے کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں۔

"اللہ! میرے اللہ میاں! اب کے تو میری آپا کا فیصلہ کھل جائے۔ میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی!" حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔

صبح جب راحت بھائی آئے تو کبرای پہلے ہی سے مچھروں والی کوٹھڑی میں جا چھپی تھی۔ جب سیویوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبرای کوٹھڑی سے نکلی اور جھوٹے برتن اٹھا لیے۔

"لاؤ میں دھو دوں بی آپا" حمیدہ نے شرارت سے کہا۔

"نہیں" وہ شرم سے جھک گئی۔

حمیدہ چھیڑتی رہی، بی اماں مسکراتی رہیں اور کریپ کے دوپٹے میں لپا ٹانکتی رہیں۔

جس راستہ کان کی لونگیں گئی تھیں۔ اسی راستے پھول، پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی اور پھر ہاتھوں کی دو دو چوڑیاں بھی جو سنجھلے ماموں نے رنڈاپا اتارنے پر دی تھی۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لیے پراٹھے تلے جاتے کوفتے بھنا پلاؤ مہکتے خود سوکھا نوالہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔

"زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی۔" وہ حمیدہ کو منہ پھیلاتے دیکھ کر کہا کرتیں اور وہ سوچا کرتی "ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح سویرے اٹھ کر جادو کی مشین کی طرح جٹ جاتی ہے۔ نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لیے پراٹھے تلتی ہے، دودھ اونٹاتی ہے تاکہ موٹی سی بالائی پڑے، اس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں بھر دے اور کیوں نہ بھرے آخر کو وہ ایک دن اس کا اپنا ہو جائے گا جو کچھ کمائے گا اس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سینچتا؟ پھر جب ایک دن پھول کھلیں گے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے گی تو یہ طعنہ دینے والیوں کے منہ پر کیسا جوتا پڑے گا۔ اور اس خیال ہی سے میری بی آپا کے چہرے پہ سہاگ کھل اٹھتا۔ کانوں میں

تاریخ کی تکمیل

"عصمت چغتائی کی ادبی زندگی کا آغاز دوسری جنگِ عظیم سے کچھ پہلے ہوتا ہے۔ تقریباً اسی وقت سے جب سے ترقی پسند تحریک ادبی حلقوں میں باریاب ہونے لگی تھی اور جب اُن کا پہلا افسانہ "فسادی" جنوری ۱۹۳۸ء میں رسالہ "ساقی" میں چھپا اور بعد کو "کافر"، "خدمتگار"، "ڈھیٹ" اور "بچپن" اسی سال شائع ہوئے تو ادبی دنیا میں کھلبلی سی مچ گئی۔ مدتوں لوگ یہی سمجھتے رہے کہ کوئی مرد ہے جو عورت کا نام اختیار کر کے لکھ رہا ہے۔ لیکن لوگوں کی یہ غلط فہمی بہت جلد دور ہو گئی اور جب ۱۹۴۰ء میں اُن کا پہلا مجموعہ "کلیاں" شائع ہوا تو عصمت ملک کی ایک مشہور اور مقبول افسانہ نگار تسلیم کی جا چکی تھیں۔ اس کے بعد "چوٹیں" (۱۹۴۲ء)، "ایک بات"، "چھوئی موئی" (۱۹۵۲ء) اور "دو ہاتھ" (۱۹۶۲ء) میں شائع ہوئے۔ دو مجموعے ڈراموں کے بھی الگ سے چھپے۔ "ایک دھانی بانکپن" (۱۹۴۸ء) اور "شیطان" (۱۹۵۵ء)، اور اب یہ محسوس ہوتا ہے کہ عصمت اُردو افسانہ نگاری کی تاریخ کی ایک ایسی کڑی ہیں جن کے بغیر یہ تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔"

ڈاکٹر محمد عقیل

شہنائیاں بجنے لگتیں اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں۔ اس کے کپڑے وت کو پیار سے تہ کرتیں جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں وہ ان کے بدبودار چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں، بساندی بنیان اور ناک سے لبڑے ہوئے رومال صاف کرتیں۔ اس کے میل میں چیچپاتے ہوئے تکیے کے غلاف پہ سوئٹ ڈریم کاڑھتیں، پہ معاملہ چاروں کونے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔ راحت صبح انڈے پراٹھے ڈٹ کر کھاجاتا۔ اور شام کو آکر کوفتے کھا کر سو جاتا اور بی اماں کی منہ بولی بہن حکیمانہ انداز میں کھسر پھسر کرتیں۔

"بڑا اشرمیلا ہے بے چارہ" بی اماں تاویلیں پیش کرتیں۔ "ہاں یہ تو ٹھیک ہے پر بھئی کچھ تو پتہ چلے رنگ ڈھنگ سے، کچھ آنکھوں سے۔"

"اے نوج، خدا نہ کرے میری لونڈیا آنکھیں لڑائے، اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا ہے کسی نے" بی اماں فخر سے کہتیں۔

"اے تو پردہ توڑ والنے کو کون کہے ہے۔" بی آپا کے پکے مہاسوں کو دیکھ کر انہیں بی اماں کی دور اندیشی کی داد دینی پڑتی۔

"اے بہن تم تو سچ میں بہت بھولی ہو۔ یہ میں کب کہوں ہوں یہ چھوٹی نگوڑی کون سی بقرعید کو کام آئے گی۔" وہ میری طرف دیکھ کر ہنستیں۔ "اری او نک چڑھی! بہنوئی سے کوئی بات چیت کوئی ہنسی مذاق، اونہہ اری چل دیوانی۔"

"اے تو میں کیا کروں خالہ؟"

"راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی؟"

"بھیا ہمیں تو شرم آتی ہے۔"

"اے ہے وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھائے گا نا۔؟"

بی اماں چڑھ کر بولیں۔

"نہیں تو مگر . . . " میں لاجواب ہو گئی اور پھر مسکوٹ ہوئی، بڑی سوچ بچار کے بعد کھلی کے کباب بنائے گئے۔ آج بی آپا بھی کئی بار مسکرا پڑیں۔ چپکے سے بولیں۔

"دیکھو ہنسنا نہیں، نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائیگا۔"

"نہیں ہنسوں گی۔" میں نے وعدہ۔"

"کھانا کھا لیجیے۔" میں نے چوکی پہ کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر جو پٹی کے نیچے رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں بھاگی وہاں سے۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اللہ توبہ کیا خناس آنکھیں ہیں۔

"جا نگوڑی ماری اری دیکھ تو سہی، وہ کیسا منہ بناتا ہے لے ہے سارا مزے کر کرا ہو جائیگا۔" آپا بی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی۔ لوٹی ہوئی براتوں کا غبار تھا۔ اور چوتھی کے پرانے جوڑوں کی مانند اداسی میں سر جھکائے پھر کھیسے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ راحت خاموش کھاتے رہے، میری طرف نہ دیکھا۔ کھلی کے کباب کھاتے دیکھ کر مجھے چاہیے تھا کہ مذاق اڑاؤں، قہقہہ لگاؤں کہ:

"واہ جی واہ دولہا بھائی۔ کھلی کے کباب کھا رہے ہو۔" مگر جانو کسی نے میرا نرخرہ دبوچ لیا ہو۔

بی اماں نے جل کر مجھے واپس بلا لیا، اور منہ ہی منہ میں مجھے کوسنے لگیں اب میں ان سے کیا کہتی کہ وہ تو مزے سے کھا رہا ہے کم بخت۔

"راحت بھائی! کوفتے پسند آئے؟" بی اماں

کے سکھانے پر میں نے پوچھا۔

جواب ندارد۔

"بتائیے نا؟"

"اری ٹھیکسے سے جا کر پوچھ"! بی اماں نے ٹھوکا دیا۔

"آپ نے لا کر دیئے اور ہم نے کھائے — مزیدار ہی ہوں گے۔"

"ارے واہ رے جنگلی" بی اماں سے نہ رہا گیا۔

"تمہیں پتہ بھی نہ چلا کیا مزے سے کھلی کے کباب کھا گئے۔"

"کھلی کے؟" ارے تو روز کا ہے کے ہوتے ہیں، میں تو عادی ہو چلا ہوں کھلی اور بھوسہ کھانے کا۔"

بی اماں کا منہ اتر گیا۔ بی آپا کی جھکی ہوئی ہوئی پلکیں اوپر نہ اٹھ سکیں۔ دوسرے روز بی آپا نے روزانہ سے دگنی سلائی کی اور پھر جب شام کو میں کھانا لے کر گئی تو بولے۔

"کہیے آج کیا لائی ہیں؟" آج تو لکڑی کے برادے کی باری ہے۔"

"کیا ہمارے ہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟" میں نے جل کر کہا۔

"یہ بات نہیں، کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے کبھی کھلی کے کباب تو کبھی بھوسے کی ترکاری۔"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، ہم سوکھی روٹی کھا کے اسے ہاتھی کی خوراک دیں گھی ٹپکتے پراٹھے مٹھائیں، میری بی آپا کو جو شاذ نصیب نہیں اور اسے دودھ ملائی نگلوائیں۔ میں بھنا کر چلی آئی۔

دلوں کا راز

عصمت چغتائی کی سی مکمل انفرادیت بہت کم افسانہ نگاروں کے حصے میں آئی ہے۔ یہاں پر محض خواتین افسانہ نگاروں کا تذکرہ نہیں۔ پورے اردو ادب کا سرمایہ کھنگال جایئے عصمت کی سی دھلی دھلائی زبان اور صاف شفاف تحریر بہت کم ملے گی۔ انداز بیان شگفتہ بلکہ برجستہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے ہیں جو دل میں اتر جاتے ہیں۔ سیدھے سادے کردار ہیں جو ہمارے آپ کے درمیان کہیں نہ کہیں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ دلوں کا راز ہے جو زبان تک نہیں آتا اور عمل کی دوسری راہیں تلاش کر لیتا ہے۔ اُن کی خلوت تک ہمیں لے جا کر عصمت چھوڑ دیتی ہیں

محمود واجد

بی اماں کی منہ بولی بہن کا نسخہ کام آ گیا اور راحت نے دن کا زیادہ حصہ گھر ہی میں گزارنا شروع کر دیا۔ بی آپا تو چولہے میں جھونکی رہتیں، بی اماں چوتھی کے جوڑے سیا کرتیں۔ اور راحت کی غلیظ آنکھیں تیر بن کر میرے دل میں چبھا کرتیں، بات بے بات چھیڑنا کھانا کھاتے وقت کبھی پانی تو کبھی نمک کے بہانے سے اور ساتھ ساتھ جملہ بازی میں کھسیا کر بی آپا کے پاس جا بیٹھتی۔ جی چاہتا کسی دن صاف کہہ دوں کہ کس کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس۔ اے بی مجھ سے تمہارا یہ بیل نہ ناتھا

جائے گا۔ مگر بی آپا کے الجھے ہوئے بالوں پہ چولہے کی اڑتی ہوئی راکھ . . . نہیں . . . . . میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا، میں نے ان کے سفید بال لٹ کے نیچے چھپا دیئے۔ ناس جائے اس کم بخت نزلہ کا بیچاری کے بال پکنے شروع ہو گئے۔

راحت نے پھر کسی بہانہ سے مجھے پکارا۔

"اونہہ" میں جل گئی۔ پہ بی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح جو پلٹ کر دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

"آپ ہم سے خفا ہو گئیں؟" راحت نے پانی کا کٹورا لے کر میری کلائی پکڑ لی میرا دم نکل گیا اور بھاگی تو ہاتھ جھٹک کر۔

"کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا نے شرم و حیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں چپ چاپ ان کا منہ تکنے لگی۔

"کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ۔ جی چاہتا ہے کھاتا ہی چلا جاؤں۔ پکانے والی کے ہاتھ کھا جاؤں . . . . اوہ نہیں . . . کھا نہیں جاؤں بلکہ چوم لوں۔" میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا اور بی آپا کا کھردرا ہلدی دھنیا کی بساند میں سڑا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ سے لگا لیا۔ میرے آنسو نکل آئے۔ "یہ ہاتھ" میں نے سوچا جو صبح سے شام تک مصالحہ پیستے ہیں پانی بھرتے ہیں، پیاز کاٹتے ہیں بستر بچھاتے ہیں جوتے صاف کرتے ہیں۔ یہ بے کس غلام صبح سے شام تک جٹے ہی رہتے ہیں ان کی بیگار کب ختم ہو گی کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انہیں کبھی کوئی پیار سے نہ چومے گا؟ کیا ان میں کبھی مہندی نہ رچے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بسے گا؟

جی چاہا زور سے چیخ پڑوں۔

"اور کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے پر آواز اتنی رسیلی اور میٹھی تھی۔ کہ اگر راحت کے کان ہوتے تو . . . . مگر راحت کے نہ کان تھے نہ ناک بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔ اور کہہ رہے تھے "اپنی بی آپا سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں اور جوشاندہ پیا کریں۔"

"چل جھوٹی"

"ارے واہ جھوٹے ہوں گے آپ کے وہ۔"

"اری چپ مردار" انہوں نے میرا منہ بند کر دیا۔

"دیکھ تو سویٹر بن گیا ہے انہیں دے آ۔ پر دیکھ تجھے میری قسم میرا نام نہ لیجیو۔"

"نہیں بی آپا۔ انہیں نہ دو وہ سویٹر۔ تمہاری ان مٹھی بھر ہڈیوں کو سویٹر کی کتنی ضرورت ہے!" میں نے کہنا چاہا پر نہ کہہ سکی۔

"آپا بی، تم خود کیا پہنو گی؟"

"ارے مجھے کیا ضرورت ہے چولہے کے پاس تو ویسے ہی جھلس رہتی ہے۔"

سویٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے اوپر تان کر کہا۔

"کیا یہ سویٹر آپ نے بنا ہے؟"

"نہیں تو"

"تو بھئی ہم نہیں پہنیں گے۔"

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ کمینے مٹی کے تھودے، یہ سویٹر ان ہاتھوں نے بنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں۔ یہ ان ہاتھوں کا بنا ہوا

ہے جو ننھے پنگوڑے جھلانے کے لیے بنائے گئے ہیں ان کو تمام لوگ دھے کہیں گے اور یہ وہ پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمہاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے یہ ستار کی گت نہ بجا سکیں گے، منی پوری اور بھارت ناٹیم کے مدرا نہ دکھا سکیں گے۔ انہیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا۔ انہیں پھولوں سے کھیلنا نہیں نصیب ہوا۔ مگر یہ ہاتھ تمہارے جسم پر چربی چڑھانے کے لیے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں، صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں، چولہے کی آنچ سہتے ہیں۔ تمہاری غلاظتیں دھوتے ہیں تاکہ تم اجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو۔ محنت نے ان میں زخم ڈال دیے ہیں۔ ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکیں ہیں۔ انہیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما مگر میں چپ رہی۔ بی اماں کہتی ہیں میرا دماغ تو میری نئی نئی سہیلیوں نے خراب کر دیا ہے وہ مجھے کیسی نئی نئی باتیں بتایا کرتی ہیں۔ کیسی ڈراؤنی موت کی باتیں بھوک اور کال کی باتیں۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ایک دم چپ ہو جانے کی باتیں۔

"یہ سوئیٹر تو آپ ہی پہن لیجیے دیکھیے نا آپ کا کرتا کتنا باریک ہے۔"

جنگلی بلی کی طرح میں نے اس کا منہ نا ک گریبان اور بال نوچ ڈالے اور اپنی پلنگڑی پر جا گری۔ بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھیں۔

"وہ بولے۔" ان سے نہ رہا گیا تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا:

صفائی

افسانہ "لحاف" کے مقدمے میں جج صاحب نے عصمت چغتائی کو باعزت طور پر بری کرتے ہوئے، کورٹ کے پیچھے ایک کمرے میں طلب کیا اور بڑے تپاک سے بولے: "میں نے آپ کی اکثر کہانیاں پڑھی ہیں اور وہ فحش نہیں، اور نہ "لحاف" فحش ہے، مگر منٹو کی کہانیوں میں بڑی غلاظت بھری ہوتی ہے"

"دنیا میں بھی غلاظت بھری ہے۔" عصمت منمنی آواز میں بولی۔

"تو کیا ضروری ہے کہ اسے اچھالا جائے؟"

"اچھالنے سے وہ نظر آ جاتی ہے اور صفائی کی طرف دھیان جا سکتا ہے۔"

جج صاحب ہنس دیے کہ ٹھیک کہتی ہے۔

"بی آپا! یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں۔" میں نے سوچا میں آج سب کچھ بتا دوں گی۔

"کیوں؟" وہ مسکرائیں۔

"مجھے اچھے نہیں لگتے ...... دیکھیے میری ساری چوڑیاں چورہ ہو گئیں۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

"بڑے شریر ہیں۔" انہوں نے رومانٹک آواز میں شرما کر کہا۔

"بی آپا ...... سنو بی آپا۔ یہ راحت اچھے آدمی نہیں۔" میں نے سلگ کر کہا: "آج میں بی اماں سے کہہ دوں گی۔"

"کیا ہوا؟" بی اماں نے جا نماز بچھاتے ہوئے

کہا۔

"دیکھو میری چوڑیاں بی اماں۔"

"راحت نے توڑ ڈالیں؟" بی اماں مسرت سے چہک کر بولیں۔

"ہاں"

"خوب کیا۔ تواسے ستاتی بھی تو بہت ہے۔ اے ہے تو دم کاہے کو نکل گیا، بڑی موم کی بنی ہوئی ہو کہ ہاتھ لگایا اور پگھل گئیں۔" پھر چمکار کر بولیں، "خیر تو بھی چوتھی میں بدلہ لے لیجیو۔ وہ کسر نکالیو کہ یاد ہی کریں میاں جی۔" یہ کہہ کر انہوں نے نیت باندھ لی۔

منہ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی اور معاملات کو امید افزا راستے پہ گامزن دیکھ کر ازحد خوشنودی سے مسکرایا گیا۔

"اے ہے تو تو بڑی ہی مٹھس ہے اے ہم تو اپنے بہنوئیوں کا خدا کی قسم ناک میں دم کر دیا کرتے تھے۔"

اور وہ مجھے بہنوئیوں سے چھیڑ چھاڑ کے ہتھکنڈے بتانے لگیں کہ کس طرح انہوں نے صرف چھیڑ چھاڑ کے تیر بہدف نسخے سے ان دو میری بہنوں کی شادی کرائی جن کی ناؤ پار لگنے کے سارے موقع ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے جہاں بیچارے کو لڑکیاں بالیاں چھیڑتیں، شرمانے لگتے اور شرماتے شرماتے اختلاج کے دورے پڑنے لگتے اور ایک دن ماموں صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے غلامی میں لے لیجیے۔

دوسرے وائسرائے کے دفتر میں کلرک تھے۔ جہاں سنا کہ باہر آئے ہیں لڑکیاں چھیڑنا شروع کر دیتیں کبھی گلوریوں میں مرچیں بھر کے بھیج دیں، کبھی سوئیوں میں نمک ڈال کر کھلا دیا۔ لے لو وہ تو روز آنے لگے، آندھی آئے پانی آئے کیا مجال جو وہ نہ آئیں۔ آخر ایک دن کہلوا ہی دیا۔ اپنے ایک جان پہچان والے سے کہا کہ ان کے ہاں شادی کرا دو۔ پوچھا کہ "بھئی کس سے؟" تو کہا، "کسی سے بھی کرادو۔" اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو بڑی بہن کی صورت بھٹی کہ دیکھو تو جیسے بیچا چلا آتا ہے۔ چھوٹی تو بس سبحان اللہ۔ ایک آنکھ پورب تو دوسری پچھم، پندرہ تولے سونا دیا ہے۔ باپ نے اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری الگ دلوائی۔

"ہاں بھئی جس کے پاس پندرہ تولے سونا ہو اور بڑے صاحب کے دفتر کی نوکری اسے لڑکا ملتے کیا دیر لگتی ہے؟" بی اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"یہ بات نہیں ہے بہن۔ آج کل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بینگن ہوتا ہے جدھر جھکا دو ادھر ہی لڑھک جائے گا۔"

مگر راحت تو بینگن نہیں اچھا خاصا پہاڑ ہے جھکاؤ دینے پہ کہیں میں ہی نہ پس جاؤں، میں نے سوچا پھر میں نے آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پہ بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھیں اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی پھاڑ کر اپنے کنوار پنے کی لعنت سمیت اس میں سما جاتیں۔

"کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے؟ نہیں وہ بھوک کے احساس سے پہلے ہی سہم چکی ہے مرد کا تصور اس کے ذہن میں ایک امنگ بن کر نہیں ابھرا بلکہ روٹی کپڑے کا سوال بن کر

ابھرا ہے، وہ ایک بیوہ کی چھاتی کا بوجھ ہے اس بوجھ کو ڈھکیلنا ہی ہوگا۔"

مگر اشاروں کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود منہ سے پھوٹے اور نہ ان کے گھر ہی سے پیغام آیا۔ تھک ہار کر بی اماں نے پیروں کے توڑے گروی رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی۔ دوپہر بھر محلہ ٹولے کی لڑکیاں صحن میں اودھم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرمائی لجائی مچھروں والی کوٹھڑی میں اپنے خون کی آخری بوندیں چوسانے کو جا بیٹھیں۔ بی اماں کمزوری میں اپنی چوکی پہ بیٹھی چوتھی کے جوڑے میں آخری ٹانکے لگاتی رہیں۔ آج ان کے چہرے پر منزلوں کے نشان تھے۔ آج مشکل کشائی ہوگی۔ بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں، وہ بھی نکل جائیں گی۔ آج ان کی جھریوں میں پھر مشعلیں تھرتھرا رہی تھیں۔ بی آپا کی سہیلیاں ان کو چھیڑ رہی تھیں اور وہ خون کی بچی کھچی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کا بخار نہیں اترا تھا۔ تھکے ہارے دیئے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا۔ اشارے سے انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اپنا آنچل ہٹا کر نیاز کے ملیدے کی طشتری مجھے تھما دی۔

"اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔" ان کی بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔

طشتری لے کر میں سوچنے لگی۔ مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔ یہ مقدس ملیدہ اب راحت کے تندور میں جھونکا جائے گا۔ وہ تندور جو چھ مہینے سے ہمارے خون کے چھینٹوں سے گرم رکھا گیا یہ دم کیا ہوا ملیدہ مراد بر لائے گا۔ میرے کانوں میں

شگفتہ قلم

عصمت کو ہر طرح کی فرسودگی سے الجھن ہوتی ہے۔ وہ زندگی میں ہو یا فن میں، اسی لیے درد و غم کے ذکر میں بھی ہر جگہ ہنس دینے اور ہنسا دینے کا احساس اور جذبہ کام کرتا ہے۔ جس طرح اُن کی بنائی ہوئی سنجیدہ سے سنجیدہ فضا میں، اور اُن کے قلم کی کھینچی ہوئی سچی مصوّری میں ہر جگہ سچائی کے ساتھ ایک شگفتگی، ایک نیا پن، ایک کلبلاہٹ اور زندہ حرکت ہوتی ہے، اسی طرح اُن کا فن ہر جگہ شگفتہ، نیا، چلتا پھرتا اور زندگی سے بھرا ہوا نظر آتا ہے۔

سید وقار عظیم

شادیانے بجنے لگے۔ میں بھاگی بھاگی کوٹھے سے برات دیکھنے جا رہی ہوں۔ دولہا کے منہ پہ لمبا سا سہرا پڑا ہے جو گھوڑے کی ایالوں کو چوم رہا ہے۔

چوتھی کا شہابی جوڑا پہنے پھولوں سے لدی، شرم سے نڈھال، آہستہ آہستہ قدم تولتی ہوئی بی آپا چلی آ رہی تھی۔ ۔ ۔ چوتھی کا زرتار جوڑا جھلمل کر رہا ہے۔ بی اماں کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا ہے۔ ۔ ۔ بی آپا کی حیا سے بوجھل نگاہیں ایک بار اوپر اٹھتی ہیں، شکریے کا ایک آنسو ڈھلک کر افشاں کے ذروں میں قمقمے کی طرح الجھ جاتا ہے۔

"یہ سب تیری ہی محنت کا پھل ہے۔" بی آپا کی خاموشی کہہ رہی ہے۔ ۔ ۔ حمیدہ کا گلا بھر آیا۔ ۔ ۔

"جاؤ نہ میری بہنو" بی آپا نے اسے جگا دیا اور وہ چونک کر اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔

"یہ ... یہ ملیدہ" اس نے اچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا ... اس کے پیر لرز رہے تھے جیسے وہ سانپ کی بانبی میں گھس آئی ہو اور پھر پہاڑ کھسکا ... اور منہ کھول دیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدہ کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا ... نیچے تعفن اور تاریکی کے انتھاہ غار کی گہرائیوں میں، اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا۔

نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہو گئی۔ باہر آنگن میں محلہ کی بہو بیٹیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں۔

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔

اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے پراٹھے نہ پکے اور سوئٹر نہ بنے دق نے جو ایک عرصہ سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ ایک ہی جست میں انہیں دبوچ بیٹھی اور انہوں نے چپ چاپ اپنا مراد وجود اس کی آغوش میں سونپ دیا۔

اور پھر اسی سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جازم بچھائی گئی۔ محلے کی بہو بیٹیاں جڑیں۔ کفن کا سفید سفید لٹھا موت کے آنچل کی طرح بی اماں کے سامنے پھیل گیا۔ تحمل کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا۔ بائیں ابرو پھڑک رہی تھی۔ گالوں کی سنسان جھریاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں جیسے ان میں لاکھوں اژدھے پھنکار رہے ہوں۔

لٹھے کی کان نکال کر انہوں نے چوپرتہ کیا اور ان کے دل میں ان گنت قینچیاں چل گئیں۔ آج ان کے چہرے پہ بھیانک سکون اور ہرا بھرا اطمینان تھا جیسے انہیں پکا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح چوتھی کا یہ جوڑا استیانہ جائے۔

ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں، بالیاں میناؤں کی طرح چہکنے لگیں۔ حمیدہ ماضی کو دور جھٹک کر ان کے ساتھ جا ملی۔ لال ٹول پر ..... سفید گزی کا نشان! اس کی سرخی میں نہ جانے کتنی معصوم دلہنوں کا سہاگ رچا ہے اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر ابھری ہے اور پھر سب ایک دم خاموش ہو گئے بی اماں نے آخری ٹانکہ بھر کے ڈورا توڑ لیا۔ وہ موٹے موٹے آنسو ان کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں جیسے آج انہیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی کبریٰ کا سوا جوڑا بن کر تیار ہو گیا ہو اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اٹھیں گی۔

ساس

اس کہانی میں ساس بہو کا کوئی جھگڑا نہیں۔ اگر ہے تو بہت ہی عجیب و غریب ہے

سورج کچھ ایسے زاویہ پر پہنچ گیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ چھ سات سورج ہیں جو تاک تاک کر بڑھیا کے گھر ہی میں گرمی اور روشنی پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔ تین دفعہ کھٹولی دھوپ کے رخ سے گھسیٹی اور اسے لوٹ پھر پیروں پر دھوپ۔ اور جو ذرا اونگھنے کی کوشش کی تو دھما دھم اور ٹھٹھوں کی آواز چھت پر سے آئی۔

"خدا غارت کرے بیاہ دوں پٹی کو۔" ساس نے دیکھا بہو کا کوسا جو محلے کے چھوکروں کے سنگ چھت پر آنکھ مچولی اور کبڈی اڑا رہی تھی۔

"دنیا میں ایسی بہوئیں ہوں تو کوئی کا ہے کو جیئے۔ اے لو دوپہر ہوئی اور لاڈ چڑھ گئیں کوٹھے پر، ذرا ذرا سے چھوکرے اور چھوکریوں کا دل آن پہنچا۔ پھر کیا مجال ہے جو کوئی آنکھ جھپکا سکے۔"

"بہو... ق... " بڑھیا نے بلغم بھرے حلق کو کھڑکھڑا کر کہا "اری او... بہو!"

"جی آئی۔" بہو نے بہت سی آوازوں کے جواب میں کہا۔ اور پھر وہی دھما دھم... جیسے کھوپڑی پر بھوت ناچ رہے ہیں۔

"اے تو آچک خدا تجھے سمجھے" اور دھم دھم چھن چھن کرتی بہو سیڑھیوں پر سے اتری اور اس کے پیچھے کتوں کی ٹولی۔ ننگے، ادھ ننگے، چیچک منہ داغ، ناکیں سڑسڑاتے کوئی پون درجن بچے، کمی کمی، کمی کمی۔ کھوں کھوں، سب کے سب کھنبوں کی آڑ میں شرما شرما کر ہنسنے لگے۔

"الٰہی یا تو ان حرامی پلوں کو موت دے، یا میری مٹی عزیز کر لے۔ نہ جانے یہ اٹھائی گیرے کہاں مرنے کو آ جاتے ہیں... چھوڑ دیئے ہیں جن جن کے ہمارا چھاتی پر مونگ دلنے کو..." اور نہ جانے کیا کیا۔ پر بچے مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے کو گھورتے دیکھتے رہے۔

"میں کہتی ہوں تمہارے گھروں میں کیا آگ لگ گئی ہے... جو..."

"واہ تم تو مر گئی تھیں۔" بہو نے ثریا کے کہنی کا ٹھوکا دے کر کہا۔

بڑھیا چیلے کو اپنی طرف مخاطب سمجھ کر تلملا اٹھی۔

"جھاڑو پھیر دوں تیری صورت پہ۔ مریں تیرے

ہوتے سوتے، تیرے...."

"واہ۔ ہم تمہیں کب کہہ رہے تھے" بہو نے لاڈ سے مٹک کر کہا۔

مگر بڑھیا کوسے گئی اور بچوں کو تو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ بچاروں کو منہ چڑا کے بھاگتے ہی بنی۔ اور بہو پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

"دنیا جہان میں کسی کی بہو بیٹیاں یوں لونڈوں کے ساتھ گدگدے لگاتی ہوں گی؟ دن ہی کیا رات ہے تو...." ساس تو زندگی سے تنگ تھی۔

غٹ غٹ۔ غٹ غٹ۔" بہو منمنائی۔ اور طوطے کے پنجرے میں پنکھے سے تنکے نکال نکال کر ڈالنے لگی۔

"میں میں" طوطا چنگھاڑا۔

"خاک پڑی اب یہ طوطے کو کیوں کھائے لیتی ہے" ساس غرائی

"تو یہ بولتا کیوں نہیں" بہو نے جواب دیا۔

"تیری بلا سے۔ نہیں بولتا... تیرے باپ کا کھاتا ہے...." ساس نے پہلو بدل کر کہا۔

"ہم تو اسے بلائیں گے" بہو نے اٹھا کر طوطے کے پنجے میں تنکا کو بیچ کر کہا۔

"آئیں.... آئیں.... اے میں کہتی ہوں تیرا پتا ہی پگھل گیا ہے۔ اب ہٹتی ہے وہاں سے کہ لگاؤں" بڑھیا نے دھمکی آمیز پہلو بدل کر کہا۔ اور جب بہو نے اور رستگایا تو کشتی کی شکل کی جوتی اٹھا کر ایسی تاک کر ماری کہ گھڑونچی کے نیچے سوئے ہوئے کتے کے لگی جو بلبلا کر بھاگا اور بہو کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ بڑھیا نے دوسری جوتی سنبھالی اور بہو کھمبے کے آڑ میں۔

"آنے دے اصغر کے بچے کو...."

"بچہ...." بہو کو بچے کے نام پر بجائے شرمانے کے ہنسی دبانا پڑی

"مقتو ہے تیرے جنم پہ۔ اے اور کیا۔ بچہ بھی آج کو ہو جاتا جو کوئی بھاگوان آتی۔ جس دن سے قدم دھرا گھر کا گھر وا ہو گیا۔"

بہو اور مسکرائی اور طوطے کا پنجرہ جھول ڈالا

"میں کہتی ہوں یہ طوطے کی جان کو کیوں آگئی ہے" "تو یہ بولتا کیوں نہیں.... ہم تو اسے بلائیں گے" بڑھیا جل کر کوئلہ ہو گئی۔ "یہی ڈھنگ رہے تو اللہ جانتا ہے دوسری نہ کر لائی ہوں تو نام نہیں۔"

دھوپ ڈھل کر گھڑونچی اور وہاں سے کنڈیلی پر پہنچی۔

ساس بڑبڑاتی رہی۔ "موئے نکھٹو: بیٹی کو کیا جہیز دیا تھا.... اے واہ قربان جاواں خولی کڑے۔ اور ملمع کی بالیاں۔ اور...."

"تو ہم کیا کریں۔" بہو پھوٹ پڑنے سے بڑبڑائی اور کھٹولی پر پسر کر لیٹ گئی۔

"اور وہ ایلونیم کے...." جمائی لے کر بڑھیا نے پٹاری پر سر رکھ کر ذرا ٹانگیں پھیلا کر کہا...... اور پھر سونے سے پہلے وہ سمدھنوں کے گھٹنے پر سے گھسے ہوئے گلبدن کے پاجاموں پھیکے زردے اور سے ہوئے پایوں والے جہیز کے پلنگ کا ذکر کرتی رہی۔ مگر بہیا بہو آدھی کھٹولی اور آدھی زمین پر لٹک کر سو بھی گئی۔

بڑھیا کی بڑبڑاہٹ بھی خراٹوں میں نہ جانے کب بدل گئی۔

اصغر نے چھتری کو کھمبے سے لگا کر کھڑا کیا اور کتھی بچھائے والی نیلی واسکٹ کو اتار کر کرتے سے پسینے کے آبشار پونچھتے ہوئے دالان میں قدم رکھا پہلے بڑی احتیاط سے ایک شریر بچے کی طرح ننھ کر سوئی ہوئی بڑھیا پہ نظر ڈالی۔ اور پھر بہو پہ۔ آموں اور

خربوزوں کی پوٹلی کو زمین پہ رکھ کر سر کھجایا۔ اور جھک کر بہو کی باہنہ بھینچ دی۔

"اُوں.... بہو تیوریاں چڑھا کر اینٹھی اور اس کا ہاتھ جھٹک، مڑ کر سو گئی۔

اصغر نے پوٹلی اُٹھائی۔ جیب میں نئی چوڑیوں کی پڑیا ٹٹولتا کوٹھڑی میں چلا گیا۔ بہو نے ہوشیار بلی کی طرح سر اُچکا کر بڑھیا کو دیکھا اور دو پٹہ کڑھیڑتی جھپاک سے کوٹھڑی میں۔

لُو۔ رک گئی۔ پسینے کے سَرّاٹے چل نکلے۔ مکھیاں آموں کے چھلکوں اور کوڑے سے نیت بھر کے منہ کا مزا بدلنے بڑھیا کے اوپر رینگنے لگیں۔ دو چار نے باچھوں میں بنی ہوئی پیک کو چکھنا شروع کیا۔ دو چار آنکھوں کے کوئے میں تندہی سے گھسنے لگیں.... کوٹھڑی میں سے ایک گڑگڑاتی ہوئی بھاری آواز اور دوسری چنچناہٹ "اوں.... اوں" سنائی دیتی رہی۔ ساتھ ساتھ خربوزوں کے چھلکوں اور آموں کے پچوڑے کی چنز چپٹ آواز سکون کو توڑتی رہی مکھیوں کی جھلوں سے دکھی ہو کر آخر بڑھیا

پھڑ پھڑا ہی اُٹھی یہ مکھی ذات جی کے ساتھ لگی تھی...

ہوتے ہی گمٹی کی چپچپاہٹ سونگھ کر جو مکھیاں منہ پر بیٹھنا شروع ہوتیں تو کیا سوتے کیا جاگتے بس آنکھ ناک اور ہونٹوں کی طرح یہ بھی جسم کا ایک عضو بن کر ساتھ ہی رہتی تھی.... اور ایک مکھی تو نہ جانے سالہا سال سے اس کی دشمن ہو گئی تھی۔ جب لکھنؤ میں تھی جب کاٹا.... پھر جب اناؤ گئی تو برسات میں پھر کاٹا۔ اور سندیلہ میں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اگر بڑھیا کو معلوم ہوتا کہ اُسے اس کے جسم کے کون سے مخصوص حصے سے اُنس ہے تو وہ ضرور وہ حصہ کاٹ کر مکھی کو دے دیتی۔ مگر وہ تو ہر حصے پہ ٹہلتی تھی۔ وہ کبھی کبھی غور سے اسی خاص کٹکھنی مکھی کو دیکھتی۔ وہی بتیلے پہ ایڑھی ٹانگیں اور ٹھگا سا سر۔ وہ بڑے تاک کر پچکے کا جھپا کا مارتی .... مکھی ٹھمن ٹھمن کر کے وہ گئی.... آہ معبود! اُسے کتنا ارمان تھا کہ وہ کبھی تو اس مکھی کو مار سکے.... لنگڑا ہی کر دے۔ اس کا بازو مروڑ کر مرغی کی طرح گدّی باندھ کر ڈال دے اور مزے سے پاندان کے ڈھکنے پر رکھ کر تڑپنا دیکھے۔ مگر خدا تو شاید اُس

چرچراتی گرد آلود سیڑھیاں طے کر کے ہم منزل پر پہنچے فلیٹ کا دروازہ نیم وا تھا۔ ڈرائنگ رُوم نما کمرے میں ایک کونے میں صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ دوسری طرف ایک بڑا سا سفید اور صاف پلنگ پڑا تھا۔ کھڑکی سے ملی ہوئی ایک لدی پھندی بڑی سی میز کے سامنے ایک بڑی سی کرسی میں ایک باریک موٹے کی شکل کا انسان اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

"آیئے آیئے" بڑی خندہ پیشانی سے منٹو کھڑا ہو گیا۔ منٹو ہمیشہ کرسی پر اکڑوں بیٹھا کرتا تھا اور بہت مختصر نظر آتا تھا، لیکن جب کھڑا ہوتا تھا تو کھینچ کر اُس

کا قد خاصا لمبا نکل آتا تھا اور بعض وقت منٹو یوں رنگ کر کھڑا ہوتا تھا تو بڑا زہریلا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے جسم پر کھدّر کا کُرتہ پاجامہ اور جواہر کٹ صدری تھی۔

"ارے میں سمجھتا تھا' آپ نہایت کالی دُبلی 'سوکھی مریل سی ہوں گی۔" اُس نے دانت نکال کر ہنستے ہوئے کہا۔

"اور میں سمجھتی تھی' آپ نہایت دبنگ قسم کے گھبیر چنگھاڑتے ہوئے پنجابی ہوں گے۔" میں نے سوچا رسید دیتے چلو' کہیں یہ ایک دم نہ ہاتھ پیر ے لے۔

"میرا دوست' میرا دشمن"

مکھی سے بھی شیطان کی طرح تول مارے بیٹھا تھا کہ بس ستائے جائے اس کی ایک حقیر بندی کو نہ جانے اس میں کیا مزہ آتا ہے۔ مگر اُسے یقین تھا کہ اس دوزخی مکھی کا گریبان۔۔۔ اس مکھی کی فریاد ضرور اس قہار و جبار کی حضور میں لے کر جائے گی اور ضرور فرشتے اُسے خون پیپ پلا کر کانٹوں پر سلائیں گے ۔۔۔ مگر پھر۔۔۔ کیا یہ موٹی کانی مکھیاں بھی جنت میں جائیں گی!۔۔۔ اور ساری جنتی فضا مکدر ہو جائے گی۔ بڑھیا نے پنکھے کی تلوار بنا کر چھپا چھپ اپنے منہ، ہاتھوں اور موکھے پیروں کو پیٹ ڈالا۔

"ارے ہو۔۔۔ ارے بہو۔ مر گئی کیا" وہ جل کر چلائی اور بہو تڑپ کر کوٹھڑی سے نکلی۔ دوپٹہ ندارد، گریبان چاک۔ ہاتھ میں آم کی گٹھلی، جیسے کسی سے کشتی لڑ رہی ہو۔۔۔ پھر فوراً لوٹ گئی اور دوپٹہ کندھوں پر ڈالے آنچل سے ہاتھ پونچھتی نکلی۔

"ارے بہو۔۔۔ میں کہتی ہوں۔۔۔ ارے دو بوند حلق میں پانی۔"

اصغر بھی شلوار کے پائنچے جھاڑتا کرتے کی پوٹلی سے گردن رگڑتا آیا۔

"لو اماں۔۔۔ کیا خوشبودار امیاں ہیں" اس نے بڑھیا کی گود میں پوٹلی ڈال کر کہا۔ کھٹولی پہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

بڑھیا آموں اور خربوزوں کو سونگھ کر کمبخت کی نافرمانی کو بھول گئی۔ جواب آموں کی بوندیوں کا معائنہ کرنے کے لئے اُس کی باچھوں سے اُتر آئی تھیں۔

"ارے بہو چھری۔۔۔"

بہو نے گلاس دیتے ہوئے آموں کا رس ہونٹوں پر سے چاٹا۔ اصغر نے پیر بڑھا کر بہو کی پنڈلی میں چٹکیا بھر لیا۔ پانی چھلکا اور بڑھیا غرّائی۔

"اندھی میرے پاؤں پر اوندھائے دیتی ہے!"

اور ایسا کھینچ کر ہاتھ مارا کہ گلاس مع بھاری پیندے کے بہو کے پیر پہ۔ بہو نے دانت کچکچا کر اصغر کو گھورا اور چل دی تلملاتی "اماں لو پانی!" اصغر نے فرمانبردار بیٹے کی طرح پیار سے کہا۔ "یہ بہو تو بڑی وہ ہو گئی۔"

"تمہیں دیکھو۔" بڑھیا نے شکایت کی۔

"نکال دو مارکے حرام زادی کو۔ اماں اب دوسری لائیں۔ یہ تو"۔۔۔ اصغر نے پیار سے بہو کو دیکھ کر کہا۔

"لے زبان سنبھال کمینے!" بڑھیا نے آم پلپلا کر کہا۔

"کیوں اماں؟ دیکھو نا کھا کر بھینس ہو رہی ہے" اُس نے بڑھیا کی آنکھ بچا کر کمر میں چٹکی بھر کے کہا اور بہو نے چھری مارنے کی دھمکی دیتے ہوئے چھری بڑھیا کے گٹے پر پٹخ دی۔ جو تلملا گئی۔۔۔

"دیکھتی ہو اماں۔۔۔ اب مار دوں چڑیل کو" لو لپک کر اصغر نے دیا دھموکہ ہو گئی بیٹھ پہ۔ اور فرمانبردار بیٹے کی طرح پھر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"خبردار لو۔۔۔ اور سنو۔ ہاتھ توڑ کے رکھ دوں گی ایک جو تو نے ہاتھ اُٹھایا" بڑھیا غنیم کی طرفداری کرنے لگی۔ "کوئی لائی بھگائی ہے۔۔۔ جو تو۔۔۔ اے میں کہتی ہوں پانی لا دے" اُس نے ایک دم پھر بہو پہ برسنا شروع کیا۔

بہو کھمبے سے لگ کر منہ تھوتھا کر بیٹھ گئی اور گلاس سے زخمی ہوئے انگوٹھے کو دبا دبا کر خون نکالنے لگی۔ بڑھیا مزے سے گٹھلیاں چچوڑا کی اور پھر شکر کا ڈبہ دیتے وقت کچھ ایسا بڑھا کے پاؤں رکھ کر خون سے لتھڑا انگوٹھا بڑھیا نے دیکھ ہی لیا۔

"اوئی یہ خون کیسا؟..." پھر بہو دم گھٹ کر پھر کھمبے سے لگ کر بیٹھ گئی اور خون بہنے لگا۔

"ارے میں کہتی ہوں ادھر آ... دیکھوں تو خون کیسا ہے؟..." بڑھیا نے پریشانی چھپا کر کہا۔

بہو ہلی بھی نہیں۔

"دیکھو تو۔ کیسا جیتا جیتا خون نکل رہا ہے۔ اصغر اٹھ تو ذرا اس کے پیر پہ ٹھنڈا پانی ڈال۔" سانس بھی گڑگٹ ہوتی ہے۔

"میں تو نہیں ڈالتا۔" اصغر نے ناک سکیڑ کر کہا۔

"حرامزادے!" بڑھیا خود گھسٹتی ہوئی اٹھی۔

"چل بیٹی پلنگ پہ۔ اے میں کہتی ہوں یہ کھاس کھوا سیہ کا ہے۔ اس کمینے سے کتنا کہا ہلکا المونیم کا لادے۔ مگر وہ ایک حرام خور ہے۔ لے اٹھ ذرا۔" بہو ٹس سے مس نہ ہوئی بلکہ کہنی آگے کر کے جھوٹ موٹ ناک دوپٹے سے پونچھنے لگی۔

"لا پانی ڈال صراحی میں سے۔" اور اصغر سینے پر پتھر رکھ کر اٹھا۔

بڑھیا سوکھے سوکھے لرزتے ہاتھوں سے خون دھونے لگی۔ مگر یہ معلوم کر کے کہ بجائے زخم پہ پانی ڈالنے کے وہ بہو کے گریبان میں دھار ڈال رہا ہے اور بہو اس تاک میں ہے کہ قریب آتے ہی اصغر کا کان دانتوں سے چبا ڈالے۔ وہ ایک دم بکھر گئی۔

"خاک پڑے تیری صورت پر!" بڑھیا نے اصغر کے ننگے شانے پر سوکھے پنجے سے بدھیاں ڈال کر کہا۔ اور اس نے ایک سسکی لے کر جل کر سارا پانی بہو پر لوٹ دیا۔ اور خود ردمٹھ کر آم کھانے چلا گیا۔ ماں بیٹے کے لیے ڈھائی گھڑی کی موت آنے کا اعلان کرنے لگی۔

"بدذات ٹھہر جا۔ آئے دے اپنے چچا کو وہ کھال اُدھڑوا ئی ہو کہ بس..." بڑھیا نے میلی دھجی کی پٹی باندھ کر کہا۔

"لے بس اب پلنگ پہ لیٹ جا۔" بڑھیا نے زخم کو انتہائی خطرناک بتا کر کہا۔ اور پھر بہو کے نہ ہلنے پر خود ہی بولی۔ "اے ہاں... لے اصغر بہو کو کھٹولی پر پہنچا دے۔"

"مجھ سے تو نہیں اٹھتی۔ یہ موٹی بھینس کی بھینس۔" اصغر جل کر بولا۔

"ارے تیرے تو باپ سے اٹھے گی... سنتا ہے کہ اب..."

اور جب وہ پھر بھی بیٹھا رہا تو بڑھیا خود اٹھانے لگی۔

"اماں میں آپ اٹھ جاؤں گی۔" بہو نے بڑھیا کی گدگدیوں سے گھبرا کر کہا۔

"نہیں بیٹی... میں..." اور اس نے پھر اصغر کی طرف آنکھیں نکال کر دیکھا گویا کہہ رہی ہے کہ ٹھہر جاؤ میاں دودھ نہ بخشوں اور پہ نہ بخشوں۔

اصغر بھنا کر اُٹھا اور ایک جھپاکے سے بہو کو اُٹھا کر چلا کھٹولی کی طرف بہو نے موقع کی مناسبت سے فوراً فائدہ اٹھا کر اسی جگہ دانت گاڑ دیئے جہاں ابھی ساس کا سوکھا پنجہ پڑا تھا۔ اور اصغر نے تلملا کر اُسے کھٹولی پر پٹخ دیا اور اس کے سرخ سرخ ہونٹ چٹکی سے مسل دیئے۔

بہو ناک چھپا چھپا کر فتحمندانہ طریقے پر ہنستی رہی اور اصغر اپنے نیل پڑے ہوئے کندھے کو سہلا سہلا کر غراتا رہا... ساس وضو کے آخری مراحل طے کر رہی تھی اور آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر بڑبڑا رہی تھی... جانے کیا۔ شاید بیچیا بہو کو کوس رہی ہوگی۔

پنکچر

اسی کہانی نے اُس وقت جنم لیا جب دل کی شمع ٹمٹمانے لگی

"پنکچر!"

اوہ، بس دم ہی تو نکل گیا۔ کم بخت دو آنے گھنٹہ لیتے ہیں اور ایسی گھٹی گھٹائی سائیکل پکڑا دیتے ہیں۔ کتنی دفعہ ابا میاں کو لکھا کہ ہمیں ایک سائیکل دلا دیجیے۔ چھٹی ہو۔ کالج کا کام ویسے نہیں چلتا کون میل بھر گھسٹ کر روز روز جائے اور پھر اس دھوپ میں؟ تو بیجیے۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ سب بناوٹ ہے۔ کوئی ضرورت سائیکل کی نہیں۔ لڑکیوں کو تو اترانے کے سوا کچھ آتا ہی نہیں۔ سائیکل ویسے بھی کوئی سواری نہیں، نٹوں کا کھیل ہے، پالکیاں، تانگیاں، ڈولیاں سب اُٹھ گئیں، پہلے تو اچھے اچھے ڈاڑھی والے تک پالکیوں میں سوار ہوا کرتے تھے۔

اور اب یہ "اب" ملعون نہ جانے کیوں پیدا ہو گیا۔ خدا میں سب طاقت ہے۔ وہ چاہتا تو یہ "اب" دنیا میں آتا ہی نہیں۔ وہی سہانا "جب" رہتا اور پھر خدا کو اس "اب" کے ساتھ عورت کیوں پیدا کرنی تھی۔ کیا بنا عورت کے دنیا نہ چلتی؟ ہاں ذرا بچوں کا سوال ٹیڑھا سا تھا، سو وہ بھی کیا تھا مردوں ہی کی پسلیوں سے کھٹا کھٹ بچے پیدا ہوتے اور کچھ کھا پی کر پل ہی جایا کرتے۔ کیسا سکون ہوتا۔ شانتی ہی شانتی! مگر اب تو پنکچر ہو چکا تھا!

"لعنت ہے۔" میں نے ٹائر کو لاچاری سے ٹٹول کر سوچا۔ اور ابا کے انتظار میں ریت پر اکڑوں بیٹھ کر سوکھے تنکوں سے زمین پر پھول کاڑھنے لگی۔ یہ ابا ہی کی رائے تھی کہ آج دُور کی سیر رہے بھلا شہر سے چار میل مرنے کی مجھے کیا ضرورت آن پڑی تھی۔ سوچا لاؤ ذرا پہیئے کو دیکھوں۔ مگر خاک جو عقل کام کیا ہو۔ کالجوں اور اسکول میں سینا پرونا اور کھانا پکانا تو سکھایا جاتا ہے مگر یہ نہیں کہ ذرا پنکچر جوڑنا بھی سکھا دیا جائے۔ کہو بھلا پڑھ لکھ کر ہم کھانے پکانے ہی کو تو بیٹھے رہیں گے! جوڑنا عورت کی خصلت میں ہے ہی نہیں۔ اور خدا کسی کو ایسا میاں نہ دے جو ہر وقت زبان کی چاٹ میں بتلا رہے۔ جو بھونڈی جوتی سامنے رکھ دی صبر شکر سے کھا لی اور پھر یہ سائیکلیں کون جوڑے گا؟ لیجیے جو ذرا پہیہ کھولنے کی کوشش کی تو انگلی الگ تِکی اور سارے ہاتھ سڑ

گئے ہر بو سے۔

ٹنن ٹمن۔ سائیکل کی گھنٹی بجی۔ میں سمجھ گئی، ایڈنا آ گئی۔ اور اب مجھے جلائے گی۔ مگر میں نے بھی ارادہ کر لیا کہ لڑ ہی تو پڑوں گی۔

"ہوں۔ پنکچر"، کوئی بولا۔ واضح رہے کہ بولا۔ بولی نہیں۔ کوئی راہ گیر تھا گو میں قطعی رومانس۔ کے موڈ (Romance mood) میں نہ تھی۔ چونک پڑی۔

"یہ۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ پنکچر ہو گیا شاید" میں نے معصومیت سے کہا۔

"واقعی!" وہ بے ہنگم سا لمبا انسان مذاق اڑانے کے لہجے میں بولا۔

"جی ہاں کوئی کانٹا چبھ گیا شاید۔" میں نے معصومیت کی دال نہ گلتے دیکھ کر اونچی کھری آواز سے کہا۔

"واقعی۔" پھر وہی کمینہ تمسخرانہ گفتگو۔ کاش کوئی اُسے خواتین سے گفتگو کرنے کا سلیقہ سکھاتا۔

"کیوں؟ یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں۔ گویا پنکچر نہیں اور میں۔۔۔"

"جی ہاں۔ پہیہ بڑی آسانی سے کھول کر ہوا نکالی جا سکتی ہے۔"

"مگر یہ کیوں؟"

"یہ۔ یہ۔ ذرا یونہی۔ ذرا۔" لمبے آدمی کا لمبوترا چہرہ گھناؤنے طریقہ پر مسکرایا۔ واضح رہے کہ صورت سے کوئی شبہ نہ ہوتا تھا۔ خاصہ شریف انسان معلوم ہوتا تھا۔

"اس سے آپ کا مطلب؟"

"یہی کہ شوق۔ آپ لوگوں کو ذرا شوق ہوتا ہے کہ جہاں کوئی رومنٹک جگہ دیکھ لی، اور کوئی حادثے لے بیٹھیں۔ پنکچر ہو رہے ہیں۔ دریا میں ڈوبی جا رہی ہیں، بدمعاش لئے جاتے ہیں۔ جہاں دیکھو"

"آپ یقیناً بہک رہے ہیں۔" میں نے جل کر کہا۔ نہ جانے کیوں یہ طعنے میرے دل میں چبھ گئے۔

"جی۔ بہک ہی تو رہا ہوں۔ یہی تو مصیبت ہے، ابھی کل ہی آپ کتاب میں لکھا دیکھا کہ ایک حسین لڑکی۔ میرا مطلب ہے دوشیزہ کی موٹر راستہ میں بگڑ گئی، اور ادھر سے۔۔۔ آپ بتلائیے کون آیا؟" وہ یہ کہہ کر کر بہ ہنسی ہنسا۔

میں اور بھی جل گئی۔ "کوئی جانور۔ شیر یا بھیڑیا" میں نے بن کر کہا۔

"آپ بنیئے مت۔ وہی پریوں کا شہزادہ" "ہوں تو پھر تجھے کیا اس سے؟" میں نے سوچا اب یہ آیا ہے تو یا تو سیدھی طرح ایک مصیبت زدہ خاتون کی مدد کرے، جو اس کا اخلاقی فرض تھا، ورنہ غارت ہو یہاں سے۔

"مگر پھر کیا ہوا؟ یہ معلوم ہے آپ کو؟" وہ اور بھی بے تکلفی سے بولا۔ اور ٹیڑھے انداز سے سر ایک طرف کو کر لیا۔

"آپ عجیب انسان ہیں؟" میں نے واقعی تعجب سے کہا۔

"اوہ اب آپ رومنٹک تو بنیئے مت!" اس نے رکھائی سے میری سائیکل ٹٹولی۔

"اصل بات یہ ہے، میں سمجھا۔ خیر جانے دیجیے۔ آپ لوگوں کو عموماً یہ عادت ہوتی ہے کہ جہاں رومانس (Romance) کی تلاش ہوئی۔ اور۔"

میں حیرت سے اس انسان نما جانور کو دیکھنے لگی۔

"اگر آپ ایمانداری سے کہہ دیں —— دیکھیے دیکھیے۔ آپ تیور دکھائیں گی تو یاد ہے کہ —— ہاں سُنا آپ نے۔ میں اس قسم کا آدمی نہیں، سمجھیں صاحب! اگر واقعی آپ کی سائیکل بگڑ گئی ہے، تو از راہ نوازش میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔" اُس نے کوٹ اُتار کر آستینیں چڑھائیں۔

میں نے ساری عمر ایسا انسان نہیں دیکھا تھا۔ جس نے میرا کام کرنے سے انکار کیا ہو۔ لڑکے خواہ مخواہ بغرض احتیاط ہماری سائیکلوں میں ہوا بھر دیتے۔ اگر یونیورسٹی گیلری میں اندھیرا ہوتا تو ہر لڑکے کی خواہش ہوتی کہ پہلے سے جا کر روشنی جلانے کی سعادت حاصل کرے۔ اگر ایسا کبھی اتفاق ہوتا کہ کوئی نظر نہ آتا تو ہم بالکل لاچار گھبرائے ہوئے اندھیرے میں متوجہ کن آوازیں نکالا کرتے اور سوئچ کی تلاش میں بڑا غل پڑتا۔ یہاں تک کہ کوئی اللہ کا شیر آکر ہمیں اس مصیبت سے چھڑاتا۔ یہ لڑکے کالج بھر میں شریف گنے جاتے تھے۔

مگر یہ بے ڈول انسان کچھ عجیب کوڑھ مغز تھا۔

"یوں کام نہیں بنے گا۔" اس نے اِدھر اُدھر سے سائیکل کو دیکھ کر کہا۔ "اسے سامنے رہٹ پر لے چلو وہاں پانی میں پنکچر مل جائے گا۔"

اور بے توجہی سے اپنے کوٹ اور سائیکل کو اُٹھا کر رہٹ کی طرف چلا...... میں نے دل میں سخت بُرا مانتے ہوئے اپنی سائیکل گھسیٹی۔ مگر کنوئیں پر پانی نام کو نہ تھا۔

"پانی تو ہے نہیں۔"

"پھر؟" میں نے ہراساں ہو کر پُوچھا۔

"پھر!" وہ مسکرایا۔ اور میں ڈری کہ کم بخت پھر

حقیقت کی خندہ زنی

"عصمت چغتائی کے یہاں عہد کہن کی دھندلی دھندلی میٹھی یاد نہیں جو قدامت پسندوں کی آنکھوں کو ڈبڈبا دیتی ہے۔ وہ ایک سسکی لے کر نمناک آواز میں کہہ اٹھتے ہیں۔ آہ! وہ کیا زمانہ تھا۔ وہ کافوری شمعیں، وہ چلمن کی اوٹ، وہ مینائے نازک، وہ ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی، رومان پرستوں کی وہ تخیل آفرینیاں جن پہ بقول مولانا صلاح الدین احمد "حقیقت خندہ زنی کرے اور مشاہدہ اپنا سر پیٹے۔"

کرشن چندر

مجھے شرمندہ کرنے کی فکر میں ہے۔

"ذرا یہ پہیہ گھمائیے۔ پانی ہی پانی ہے۔ میں نالی بند کرتا ہوں۔" اور وہ موری سے کھیلنے لگا۔ اسی کام خود کر کے مجھے رہٹ پر جُتا دینا کہاں کی انسانیت تھی؟ اور پھر سگرٹ جلا کر خوب ہوا میں دھواں پھیلانا شروع کر دیا۔

اُس نے پانی میں ٹیوب ڈال کر پنکچر تلاش کرنا شروع کیا۔ میں لاچار عجیب صورت بنائے اس کے پاس بیٹھی رہی۔ اس کا کوٹ جو زمین پر پڑا تھا، میں نے اس کی عزت افزائی کے لئے اپنے گھٹنے پر ڈال لیا کہ شاید اس کا غصہ کم ہو۔ اور اس سے زیادہ ایک انسان کی کیا عزت افزائی ہو سکتی ہے۔ نہ جانے کیا سوچ کر اس نے مجھے غضبناک آنکھوں سے دیکھا اور غرّایا۔

"ہوں — لاحول ولاقوۃ! یہ آپ نے مجھے اُلّو بنانا شروع کیا۔" اُس نے ٹیوب پھینک دیا: "آپ مزے سے بیٹھی ہیں۔ خود کیوں نہیں بناتیں!" وہ دور کھڑا ہوگیا۔

میں ڈر کے اُچک پڑی۔ جلدی سے کوٹ دور پھینکا اور بڑبڑاتے ہوئے خود پنکچر ڈھونڈھنا شروع کیا۔ وہ خود دھواں اُڑا اُڑا کر منڈیر پر بیٹھا دیکھتا رہا۔

جب کوئی نیا اور جنگلی سا انسان آپ کی ہر مناسب بات کو بھی خواہ مخواہ اعتراض سے دیکھے جائے تو نہ جانے کیوں جی سا گھبرانے لگتا ہے۔ آخر یہ سے بولا "یہ آپ اترا اترا کر پنکچر چھوڑ کیوں دیتی ہیں — ابھی ابھی آپ کا ہاتھ وہاں پڑا تھا۔"

"نہیں تو۔ کہاں۔"

"اُفوہ! کس قدر ضدّی ہیں۔"

"بغاوت مناسب رخصت" مجھے پھر غصہ آیا۔ آپ کو کیا جلیئے نا یہاں سے۔"

"اوہو! یہ لیجیے — آپ نہ جانیں کیا سمجھیں ہوں گی — لاحول ولاقوت —" اور وہ چلا۔

"مگر سنیئے تو۔" اُس نے مڑکر کہا: "سیلوشن اور پمپ تو آپ کے پاس ہوگا ہی۔ بھلا جب آپ کے پاس سب کچھ سامان تھا تو وہاں کیوں پسر کر بیٹھ گئی تھیں۔ آپ لوگوں کو خدمت لینے کا تو بس چسکہ پڑ گیا ہے۔"

"آپ بہت بیہودہ انسان ہیں۔ میرے پاس نہ پمپ نہ سیلوشن۔" میں نے کھسیا کر چلانا شروع کیا۔

"اچھا یہ بات ہے — ہوں — تو پھر کہیئے کیا منہ سے بھریں گی؟" اُس نے ایک قہقہہ پھریئے کی طرح سر پیچھے پھینک کر لگایا۔

"آپ کی بلا سے۔" میں نے پنکچر منحوس مسل کر کہا۔

"پھر — وہی روٹھنگ بنتا؟" نہ جانے اِس شخص کو رومانس سے کیوں جلن تھی۔

"آپ کس قدر — وحشی — ہیں۔" میں نے ٹیوب دُور پھینک کر کہا۔ "اگر آپ کا کوئی کام ہوتا تو مجھے مدد دینے میں کبھی بھی — اس قدر کبھی — بھی — میں اتنی بدتمیزی نہ کرتی۔"

"دیکھو جی ہم نہ تو وحشی اور نہ جنگلی۔ اور ہم کام سو دفعہ کریں۔ مگر جو تم اینٹھ کر ہمارے اوپر دھونس جماؤ تو — واضح ہے کہ —"

"مگر آپ بدتمیزی کیوں کرتے ہیں۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

"تم بھی تو بدتمیزی کر رہی ہو۔ دیکھو نا اب جو تمہاری جگہ لڑکا ہوتا، خدا کی قسم جوتے مارتا اس کے اور دوسرے پہیئے میں بھی پنکچر کر دیتا۔ انتہا ہے گدھے پن کی کہ نہیں نہ سیلوشن، نہ پمپ، اور جنگل کی سیر کو جا رہی ہیں۔ جانتی ہیں، کوئی مل ہی جائے گا۔ جو پنکچر جوڑ دے گا۔ اور ہوا بھر کر، آپ کو سائیکل پر لاد کر پہنچائے گا گھر۔"

اُفوہ۔ میرا دل چاہا زور زور سے جنگی ٹریں مار مار کر رو دوں۔ یا گنواریوں کی طرح موٹی موٹی گالیاں دے کر اُس کے منہ پر وہی کیچڑ کھینچ ماروں جو میرے پیروں میں بے طرح لتھڑ گئی تھی۔ مگر پھر شرافت آڑے آ گئی۔ اور میں نے زور سے دانت بھینچ لئے — نہ جانے اب بھی اُس کی کون سی کل سیدھی رہ گئی اور اُس نے دُور ہی سے سیلوشن ٹیوب پھینک دیا۔ بدتمیز انسان نے ہوا بھی نہ بھری، بیٹھا دیکھتا رہا کس

قدر دردناک سماں تھا۔ ہوا میں سنسنی خود بھری!

"آپ کا نام کیا ہے۔ آپ یہ سلیوشن اور پمپ لے جا سکتی ہیں۔ پتہ دے جائیے اپنا۔"

"مجھے نہیں چاہئے آپ کا سلیوشن۔" میں نے سائیکل کو کوستے ہوئے اُٹھایا۔

"ادھو پھر نہیں۔"

سامنے سے ایڈنا آتی دکھائی دی۔

"آپ کی سائیکل میں پنکچر نہیں ہوتا؟" اُس نے بناوٹی استعجاب سے بغیر کسی تعارف کے ایڈنا سے پوچھا۔

"نہیں تو۔" ایڈنا تیوریاں چڑھا کر بولی۔ میں خوش ہوئی کہ اب یہ جنگلی اس کی بھی خبر لے گا۔

"تعجب" وہ بولا۔

"کیوں؟" ایڈنا اکڑ گئی۔

"ان کی سائیکل میں تو ہو گیا۔" اس نے طنز سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"جھوٹ، بالکل نئے ٹائر ہیں۔" ایڈنا بولی۔

"جی ہاں — نئے ٹائروں میں تو اور بھی جلدی ہوتا ہے۔" اور وہ قہقہہ لگاتا چلا گیا۔

"سنی۔" ایڈنا جل کر بولی۔

میں نے اُسے اُس جنگلی کی ایک بات بھی نہ بتائی۔ اس قابل ہی کب تھی کوئی بات، اور وہ باتیں ہی اور ہوتی ہیں جنہیں ہم سر جوڑ کر ایک دوسرے کو بتایا کرتے ہیں۔

یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لٹھ نما حیوان یونیورسٹی میں ریسرچ کے لئے اسی سال آیا تھا۔ نہ جانے کہاں سے!

"ہلو پنکچر۔" وہ کئی دفعہ ملا اور بے تکلفی سے بولا۔ اور پھر ہم اور زیادہ ملنے لگے، بہت جلد ہم بے تکلف ہو گئے۔ وہ اکثر آیا کرتا۔ مجھے پہلی دفعہ یہ معلوم ہوا کہ بے لوث کھرا پن، چاپلوسی سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔ گو وہ عموماً میری بات کو کاٹ دیا کرتا تھا لیکن ہم پھر بھی ملتے تھے۔ ایڈنا اس کی صورت سے جلتی تھی اور کہتی تھی کہ "اس جنگلی کو اتوار کا ستیاناس کرنے کو تو کم از کم مت بلایا کرو۔"

میری اس کی ایک گھڑی نہ بنتی تھی۔ جہاں کسی شاعر یا مصنف کی تعریف میرے منہ سے نکلی، اور وہ بولا۔ "اجی ہٹاؤ کم بخت کو، میرا بس چلے تو جلوا دوں اُسے۔"

جہاں کہیں میں نے کسی تقریر کی تعریف کی اور اس نے بکنا شروع کیا۔ "لا حول ولا قوۃ کس قدر ذلیل ٹرٹر تھی۔ کچھ تھا بھی اُس میں۔ میں تو چپ رہا ورنہ

ڈھونگ؟

عورت بیوہ ہو جاتی ہے تو اُس کی چوڑیاں توڑ دیتے ہیں۔ مرد کی گھڑی یا عینک یا حقہ توڑنے کا کبھی کسی کو خیال نہ آیا۔ بیوہ لباس میں بھی تبدیلی کرنے پہ مجبور ہوتی ہے۔ رنگا دوپٹہ پہنے یا ہاتھوں میں چوڑیاں ڈال لے تو لوگوں کے کلیجے پھٹ جائیں۔ مرد وہی سوٹ بوٹ، اچکن، انگرکھا ڈاٹے پھرتا ہے۔ کیسی بے رحمی ہے کہ دکھاوے کے بھی سوگ نہیں مناتا، حالانکہ عورتوں کو جیسے شوہر کا غم ہوتا ہے، مرد کو بیوی کا غم ہوتا ہے۔ بہت سی عورتوں اور مردوں کو نہیں ہوتا۔ مگر عورتوں کو ڈھونگ رچانا ہوتا ہے۔

عصمت چغتائی

— وہ تو کہو خیر ہوئی۔"

میں ان باتوں سے اس قدر جل جاتی کہ اُسے دلیل سے قائل کرنے کی برداشت نہ رہتی۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ میں اُس سے ملتی ہی کیوں ہوں۔ مجھے کسی کی حکومت سہنے کی عادت نہ ہے نہ کبھی ہو۔

ایک دن تو بدتمیزی کی انتہا ہوگئی۔ اور ایڈنا نے کہا۔ "پارٹی کے دام غارت ہوئے۔" ہم نے بہ وفیسروں اور چند نامی لڑکوں کو دعوت دی۔ آپ بھی آئے۔ بولے۔ "تم بھی تو مضمون لکھتی ہو؟" میں نے کتنی ہی دفعہ کہا، کبھی سب کے سامنے تم مجھ سے نہ بولا کرو۔ مگر اُس نے ایسی بڑی بُری دھمکیاں دیں کہ مجبوراً سہہ گئی۔

"ہاں لکھتی ہوں۔" میں نے ذرا تکلف سے کہا۔

"کیسے لکھ لیتی ہوں مضمون ؟" اس نے حیرت سے کہا۔

میں چونکی۔ مگر سنجیدہ دیکھ کر کوئی شاعرانہ طریقہ سوچنے لگی۔

بولے۔ "خیالات دل میں آتے ہوں گے؟"

میں نے سر ہلا دیا۔

"وحی سے آتی ہوگی ؟"

"ہاں وحی آتی ہے۔" میں نے انسانیت کے جامہ میں دیکھ کر کہا۔

"کیسے آتی ہے وحی تم جیسوں کو۔ جیسے مرگی کا دورہ پڑتا ہے ویسے ہی ؟ پہلے کچھ سردی سی لگتی ہوگی ؟" وہ پھر اڑنے لگا مجھ سے۔

"خیالات ہوتے ہیں، وہ دماغ میں آ جاتے ہیں۔" ایک اور صاحب بولے۔ انہیں شاید مجھ پر رحم آیا۔

"نہیں جی خیالات وغیرہ کچھ نہیں۔ ہیں نہ آجائیں خیالات ؟ یہ تو کوئی اور بات ہے۔" وہ عیاری سے مسکرایا۔

"کوئی اور بات کیا ہو سکتی ہے۔" ایک پروفیسر نے کہا۔

"یہی کوئی — اب تو یہ ڈاکٹر سے پوچھا جائے۔" وہ ہنسی چھپانے کو آگے جھک گیا۔

میں اور سارے سننے والے سکتے میں رہ گئے۔ کچھ بدتمیز لوگ ہنس بھی پڑے۔

سب کے جانے کے بعد میں نے لڑنے کی بے انتہا کوشش کی مگر ناکام رہی۔ وہ بضد اس بات پر اڑا

کراچی میں
پندرہ روزہ قافلہ
انسائیکلوپیڈیا معلومات
طلسم ہوشربا
اور دیگر شاہکار مطبوعات
ویلکم نیوز ایجنسی
۶/H-۱-۱ پی ای سی ایچ ایس
سے رابطہ قائم کریں
فون نمبر: ۴۳۵۵۱۳

رہا کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ خیر اس میں ہے کہ بجائے فخر کرنے کے فکر کی جائے۔ آثار کچھ اچھے نہیں اور رالٹی میں نیم پاگل تو ہو ہی چکی ہوں۔

وہ عموماً مجھے چنگیز کہا کرتا۔ میں نے بغاوت پر آمادگی ظاہر کی تو مجھے سب کے سامنے چنگیز کہنے پر تل گیا۔ کہا نا میں نے کہ اس سے تو بحث کرنا بیکار تھا۔ میں بچوں کی طرح چڑ جاتی اور بات اس سے کی جائے تو انسانیت کے جامے میں ہو۔ خواہ مخواہ کے اعتراضوں سے نہیں ڈرتی۔ پر نہ جانے کیا بات تھی۔ جب وہ کسی بات پر اعتراض کرتا، میرے دل کو جا لگتی اور غیر ارادی طور پر وہ بات ہی مجھ سے نہیں کی جاتی۔

دہرانے سے کیا فائدہ۔ بس ہم برابر ملتے رہے، آپ تعجب کریں گے کہ کیوں میں نے اس جنگلی سے راہ و رسم جاری رکھی۔ تو یہ خود نہیں معلوم۔ کمزوری سمجھ لیجئے۔ یا جو جی چاہے آپ کا، نہ جانے اس میں کیا بات تھی کہ کھینچے لیتی تھی۔ وہی باتیں جو پہلے بدتمیزی معلوم ہوتی تھیں اب بھلی معلوم ہونے لگی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اوپری دل سے اُسے وحشی اور جنگلی کہنے کے باوجود اگر وہ کسی دن نہ آتا۔ اور ایک آدھ جھگڑے کا لطف پیدا نہ ہوتا، تو جی نہ لگتا۔ میرا دل خوف سے بیٹھ جاتا۔ جب مجھے محسوس ہوتا کہ اس کے بغیر زندگی سونی ہو گی۔ اُس کے دل کا حال مجھ سے پوشیدہ تو نہ تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو دو انسانوں کے ملنے سے ہوتا ہے پر وہ انسان ہوتا جب نا! اُس کی تو کوئی بات ہی ڈھنگ کی نہ تھی۔ اُس کے اظہار الفت کا طریقہ بالکل حضرت آدم کا سا تھا۔

وہ جنگلات میں ایک معمولی عہدے پر مقرر ہو گیا۔ اور اب بجائے روزانہ کے ہفتہ اور اتوار کو ملنا ہوتا۔ اُس نے بارہا وہاں کی تنہائی کا ذکر کیا۔ مگر جونہی میں نے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہا تنہائی، سکون، اور اطمینان کی زندگی کہہ کر الٹی تعریف کرنی شروع کر دی مجھے اب بھی انتظار تھا نہ جانے کس بات کا۔ ایک دن فرمانے لگے "تم ہوتیں تو یقیناً پسند کرتیں۔ تیرنے کے لئے بہترین مقام ہے" اور اس سے آگے کچھ بھی نہیں۔

میں خاموش رہی۔ کئی دفعہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس سے قبل کہ میں خود ہی موقع دوں وہ کسی معمولی سی بات پر اس طرح اعتراض کرتا کہ میں جل کر دل میں توبہ کرتی، کہ خدا

ڈانٹے سیدھے مقولے

ایک صاحب فرماتے ہیں: "جب بچہ پہلی بار ماں کی چھاتی سے دودھ پیتا ہے تو وہ مسرت کے مارے لال ہو کر کانپنے لگتی ہے" خواتین نے تو فوراً تاڑ لیا ہوگا کہ فرمانے والے صاحب مرد ہیں اور انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، اُسنی سنائی ہے، یقیناً انہوں نے خود کبھی کسی بچے کو دودھ نہیں پلایا اور نہیں جانتے کہ بچہ پہلی بار دودھ پیتا ہے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ ماں جو لال پڑ کر کانپتی ہو گی، وہ قطعی محبت اور راحت کی لرزش نہیں ہو گی، کرب سے رنگ بدل گیا ہو گا۔ یہ مرد خواہ مخواہ الٹے سیدھے مقولے ٹھونکتے رہتے ہیں

عصمت چغتائی

ہی. بچائے اس بلا سے۔ مگر ہم عورتوں کی کوئی بات سیاسیات سے خالی نہیں ہوتی۔ اگر ہم کسی بات کو کرنا چاہیں تو سیدھے راستے کبھی نہیں چلتے۔ بلکہ گھوم گھوم کر منزلِ مقصود پر پہنچتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کامیابیاں زیادہ تر عورتوں ہی کو نصیب ہوتی ہیں۔ گو کوئی مانتا نہیں اس بات کو۔

فرض کیجئے کہ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا چھوٹا سا بھائی ذرا تخت کے نیچے گھس کر اُگالدان نکال لائے۔ وہ بے کہ نیشے کی گولیوں اور یا کسی عجیب کھیل میں منہمک ہے، آپ گھڑکتے ہیں، تو وہ رونے کی دھمکی دیتا ہے۔ ایسے موقع پر آپ کیا کریں گے۔ ہم تو یہ کرتے ہیں کہ فوراً کسی دوسرے

سہگل نمبر

مُرتّبہ :۔ علاؤ الدین منظہر

ایک یادگار دستاویز عنقریب شائع ہوگا۔

بچے کو پکارتے ہیں جو گھر میں موجود نہ ہو۔

"بھائی مکھن، میاں ذرا اُگالدان تو اُٹھا لاؤ۔ — وہ — وہ دیکھو تخت کے نیچے سے اس کا کنارا چمک رہا ہے۔ شاباش۔ اہا دیکھیں اب دیکھیں پہلے کون لائے — کون لائے" اور وہ معصوم رقابت کے جنون میں تیر کی طرح دوڑتا ہے۔ اُگالدان آجاتا ہے۔ ہے نا؟ تو میں نے بھی منظور صاحب کو اُلو کا ربنایا۔ بڑی شرم کی بات ہے، پر آپ ہی بتائیے اور کیا کرتی۔

اگر میں اُس سے بے حیائی لاد کر کہہ دیتی۔ آؤ ہم تم شادی ہی کر لیں نا، بیکار تم وہاں تنہا اور میں یہاں" تو یقیناً وہ بھڑک اٹھتا۔ مجھے معلوم تھا وہ مرجائے مگر منہ سے تو کبھی کچھ نہ کہے گا۔ اس سلسلہ میں خدا معاف کرے۔ منظور کی نئی موٹر میں بڑی بڑی سیریں کیں اور یہ دستور ہو گیا کہ میرا وحشی دوست تو مجھے لے کر آئے اور ٹال دوں۔

"معاف کرنا، منظور نے آج پکچر کا وعدہ کیا ہے۔ بہت عمدہ پکچر ہے" اور وہ اپنا سا منہ لے کر چلا جاتا۔ میرا دل کٹ جاتا اور پکچر دھندلی دکھائی دیتی۔ منظور، خدا کرے اُسے بہت اچھی بیوی ملے۔ اس غیر معمولی عنایت سے ذرا بھی حیران نہ تھا۔ نئی نوکری نے شادی کے بازار میں ان کی چوگنی قیمت کر دی تھی۔

مگر اللہ رے جنگلی پن۔ رقابت اپنا کام کئے بغیر نہ رہتی اور وہ تملا اٹھا بل کھاتا۔ مگر کیا مجال جو ٹس سے مس ہو جائے۔ اور وہی علاج کیا۔ یعنی آنا چھوڑ دیا۔ اور مجھے پھر وہی اندھیری شکست کے ہولناک خیالات نے گھیر لیا۔ شکست اور زندگی کے اس خاص شعبہ میں؟ یہ سمجھیے کہ زندگی کے مائرے میں پنکچر، شکست کا بدلہ جل کر مکمل شکست کھا لینا ہی ہم لوگوں کے بس کی بات

ہوتی ہے۔ نہ جانے انتقاماً یا خود کو سزا دینے کے لئے میں نے منظور کی انگوٹھی پہن لی۔ ذرا ڈھیلی تھی اور گر گر پڑتی تھی۔ پر میں نے آگے ایک تنگ چھلا پہن کر اُسے روکے ہی رکھا۔

میں نے اپنے اوپر ایک قسم کی ڈھٹائی سی لاد لی تھی۔ جلدی جلدی تیاریاں کرنا شروع کیں۔ ارادہ ہوا کہ فوراً ہی کشمیر چل دیں گے۔ منظور کی غیر موجودگی میں مجھ پر جنونی کیفیت طاری ہو جاتی۔ دل بغاوت پر تل جاتا اور یہ محسوس ہوتا کہ اگر فوراً شادی نہ ہو گئی تو ضرور پاگل ہو جاؤں گی۔ مجھے خود پر ذرا بھی بھروسہ نہ رہا تھا۔ بعض وقت گراں باغیانہ خیالات پر خود کو سزا دینے کے لئے منظور پر ضرورت سے زیادہ عنایات کی بارش کی جاتی۔ پر کون جانے وہ سارا اُبھار اور لگاوٹ دل میں کس کا خیال لے کر کیا جاتا؟ خدا ستّار عیوب ہے۔ منظور کو کیا معلوم کہ اس کی حیثیت ایک ڈمی کی سی تھی۔ جب کہ دل کہیں اور ہوتا تھا۔ نہ جانے ہندوستان میں کتنی عورتیں اپنے شوہر کے گلے میں باہیں ڈالتے وقت کس کے خیال میں کھوئی ہوئی ہوتی ہیں سکتے ہیں پہلی محبت بھلائے نہیں بھولتی۔ زخم بھر جاتا ہے پر جہاں پوربیہ ہوا چلی اور ٹیسیں اٹھنا شروع ہوئیں پر آج کل تعجب ہے مصنوعی ناک کان مل جاتے ہیں۔ تو سکونِ قلب کیوں نہیں مل سکتا؟ یہ ناممکن ہے ضرور ملتا ہے تلاش کرنے والا چاہیئے۔

شام کے وقت درزی کو رخصت کر کے اندھیرے ہی میں خاموش ایک کرسی پہ لیٹی رہی۔ کس قدر اداسی سی تھی۔ معلوم ہوتا تھا ہوا میں ہزاروں زہریلی گیسیں پھیلی ہوئی تھیں، کلیجہ میں عجب قسم کی سوزش ہو رہی تھی۔ کہ اگر بہت ضبط کیا تو سینے میں کوئی چیز زور سے پھٹ کے ٹکڑے ہو جائے گی۔ منظور! میرا خیال ان کی طرف گیا۔ انہیں میں گیس ماسک کی طرح استعمال کر کے ہمیشہ ان گیسوں سے بچ جایا کرتی تھی۔

برآمدے میں آہٹ ہوئی۔ منظور کے آنے پر مجھے ہمیشہ بن کر چوکنا پڑتا تھا۔ اور اس وقت تو میں نیم مردہ ہو رہی تھی۔ ایک لمبا چوڑا سا سایہ کمرے کے دروازے پر نظر پڑا۔ وہ کچھ آشنا سی بالوں کی تراش، خاص جھکائے ہوئے شانے اور باہر کی دھندلی روشنی میں پتھر کی ترشی ہوئی مورتی کا سا کرخت چہرہ! دل تڑپ تڑپ کر اچھلنے لگا۔ اگر مجھے پورا یقین نہ ہوتا کہ یہ ظالم مجھے خون تھکوا دے گا، تو چیخیں مار کر اُس بے رحم سے چمٹ جاتی۔ تین ہفتوں بعد آج مرنے کی فرصت ملی تھی۔ مگر منظور کی تبرک انگوٹھی گیلری کی دھندلی روشنی میں جگمگ جگمگ کر رہی تھی میرا دل ڈوبنے لگا۔

"ارے کس قدر اندھیرا ہے۔" اندر آ کر کہا۔

"کہیں تار بگڑ گیا ہے۔" میں نے چاہا وہ بجلی نہ جلائے۔ ورنہ میرے منحوس چہرے پہ جو ٹھیکرے ٹوٹ رہے ہیں وہ کیسے چھپیں گے؟"

"کہاں خراب ہے یونہی ..؟" میز کا لیمپ جلا کر ریڈیو کے سامنے اسٹول پہ بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموشی سے ریڈیو مروڑتے رہے۔ کھڑ کھڑ، خر خر گھر گھر، میرے آنسو نکل آئے۔

میں نے نئے جائے تقرر کی بابت پوچھا۔ "کس جگہ ہے۔"

"دوزخ" گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"کیوں؟ جنگل تو پر فضا ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہونگے۔ شاعروں کے لئے۔"

یا اللہ! کدھر سجدہ کروں؟ یہ تغیر

"نہیں درندوں کے لئے بھی۔" میں نے جواب دیا۔ پھر پچھتانے لگی کہ میرا تو ارادہ ہی بے تکلف ہونے کا نہ تھا۔

"ہوں۔ مگر پالتو درندوں کے لئے نہیں، جو پنجرے کے عادی ہو چکے ہوں۔"

آواز کی نرمی مجھے متحیر کئے بغیر نہ رہ سکی۔

"مگر آپ کو تنہائی پسند ہے۔ شکار تو خوب ہوتا ہوگا۔"

"خاک"۔ ذرا جلی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیوں، عباس، شہاب، نہ جانے کون کون تھے، اُن کا ذکر آپ مزے لے کر کرتے تھے۔"

"وہ — عباس اپنی بیوی کو لے آیا۔ شہاب کی ستمبر میں شادی ہوگئی۔ محمود دوڑ دوڑ کر دہلی جاتا رہتا ہے۔ ضیا کو تو جانتی ہو جنونی سا ہے۔" یہ اس طرح کہا جیسے کوئی بچہ جس کے سارے کھلونے ایک ایک کرکے ٹوٹ گئے ہوں، اور ماں نئے کھلونے منگانے سے انکار کر دے۔

میرے حلق میں سوکھا سا پھندا پڑنے لگا۔

"چھٹیاں ہیں؟"

"نہیں تو لے کر آیا ہوں۔"

"کیوں۔"

"ایک ضروری کام تھا۔"

"آپ کو اور کام؟ دہلی گئے ہوتے تو قریب پڑتا۔" میں نے تنگ کرنا شروع کیا۔

"ہاں — وہ — میں نے اسٹیشن پر اخبار دیکھا تھا۔ مبارکباد تو دینا بھول ہی گیا۔" کھسیانی ہنسی۔

"اوہو تو اس لئے آپ آئے ہوں گے۔"

شکریہ۔ منظور سے تو آپ کو ہمدردی ہوگی نا؟"

"ہاہاہا۔ خود کوزہ را علاجے نیست۔ کس نے کہا تھا اُس سے کہ دریا میں کودو۔ اب کودا ہے تو ہاتھ پاؤں مارے۔" وہ کمرہ جسے سن کر مجھے ہسٹریا کا دورہ پڑنے لگتا ہے، اپنے مخصوص جھکولوں کے ساتھ گونجا مگر میں نے ضبط کیا۔

"مارچ میں شادی ہو جائے گی، سیدھے کشمیر چلے جائیں گے۔ وہاں برف —" میں نے مصنوعی مسرت سے کہا۔ گو دل پر برف کے تودے جمے ہوئے تھے۔

"مگر منظور تو تمہیں پسند نہ کرتے تھے۔" وہ ایک دم بولے۔

"اوہ، وہ میری غلطی تھی — وہ فرشتہ ہیں —" میں نے کم از کم آخری لفظ تو دل سے کہا

"ہاں — ہے تو — پر کٹا فرشتہ" اور پھر وہی پاگل کن قہقہہ "بڑی جلدی فیصلہ کر لیتی ہو۔"

"ہاں ناقص العقل جو ٹھہرے ہم لوگ۔ خیر منظور جانتے ہیں۔ وہ میری غلطیوں سے بھی پیار رکھتے ہیں۔"

"بڑے عقلمند ہیں پھر تو۔" ایسے طعن سے کہا کہ میرا جی چاہا منہ نوچ لوں بیوقوفوں کا۔

مگر میں بولے ہی گئی۔ "وہ فرشتہ ہیں — میں نے تو ان سے کہہ دیا تھا — یہاں تک کہہ دیا تھا۔"

"کیا کہہ دیا تھا؟" وہ ریڈیو پر دُور کا کوئی اسٹیشن لگا کر بولے۔

شکر تھا کہ لیمپ ذرا آڑ میں تھا۔ اور مجھے تاریکی نے اپنی پناہ میں لے رکھا تھا۔ میراجی ذرا آگے کو جھکا اسٹول پر بیٹھا تھا۔ بے ترتیب بال، باغیانہ ڈھٹائی سے پیشانی کی طرف جھکے ہوئے تھے۔ چوڑے شانے لیمپ کی روشنی سے میرے چہرے کو چھپائے

ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر وہی کچھ تلخ سی مسکراہٹ میرا دل بُری طرح گھبرانے لگا۔ میں نے بمشکل اس تلخی کو روکا جو میرے ہونٹوں پر مچل رہی تھی۔ ریڈیو کی آواز اونچی کرنے کے لئے میں نے ہاتھ بڑھایا اور اُدھر سے انہوں نے تھوڑی دیر کے لئے میری اُنگلی اُن کے گرم ہاتھوں سے مس ہوگئی اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ریڈیو لیک کر رہا ہے۔ میری آنکھوں میں تارے ناچنے لگے۔ اور منظور کی انگوٹھی اس کی گرمی سے پگھلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ مگر میں نے سختی سے اس ایکٹر کی طرح بولنا شروع کیا جو اپنا پارٹ شروع سے بھول چکا ہو۔ اور ہال میں بدتمیز دو آنے والے تماشائی تالیاں بجانے آئے ہوں۔"

"کچھ بھی ہو۔ انہوں نے تو یہ تک کہہ دیا۔ میں نے جب کہا کہ میرا کیا بھروسہ شادی کے بعد ہی میں بدل جاؤں اور چل دوں گھر بار چھوڑ کے۔ تو وہ بولے۔"

"کیا بولے؟" انہوں نے سکوت سے کہا۔ اور لاپرواہی سے سگریٹ تلاش کرنے کے لئے جیبیں ٹٹولنا شروع کر دیں۔

"اوہ، منظور فرشتہ ہے۔ اُس نے کہا۔ تم چلی جانا۔ میں بچوں کو پال لوں گا..." میرے گلے میں آواز اٹک گئی۔

"ہیں؟ کیا؟ کیا کہا۔ پھر تم نے کیا کہا؟" خواہ مخواہ دل دکھانے کے لئے حیرت کا اظہار کرنا تو اس کی خصلت میں داخل ہے۔

"پھر کیا؟ مجھے عمر میں پہلی مرتبہ اس وقت منظور پر پیار آیا۔ اور۔"

"کیا؟ تمہیں۔ پیار۔ آیا!!!۔

"اور کیا، وہ ہے ہی پرستش کے قابل۔ اور

داد' بیداد

عصمت کے فن کی غالباً سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی بصیرت کی ایک نہایت بے باک اور صداقت شعار ترجمان ہیں اور اگرچہ اُن کی یہ ترجمانی اُن کی نگارش کی پُرکاری کا نقاب اوڑھے رہتی ہے، لیکن ازبسکہ وہ ایک ہندوستانی عورت ہیں، اس لئے اس نیم پخت دَور میں اُنہیں اپنی جرأت کی وہ داد نہیں مل سکتی جو اُن کا حق ہے۔ داد تو ایک طرف اگر وہ اُس بیداد سے بچ جائیں، جس کی ارزانی میں معترضوں کے دل اُن کی زبانوں کا ساتھ نہیں دیتے تو بسا غنیمت ہے

مولانا صلاح الدین احمد

کیا کرتی میں۔"

"تم نے اُسے گھر سے نکلوا دیا ہوتا، لاحول ولا قوت۔"

"کیوں؟"

وہ تھوڑی دیر حیرت سے منہ پھاڑے بیٹھا رہا۔ کم بخت کی شکل باوجود ان باتوں کے کس قدر جاذب نظر تھی۔ اُس نے اپنا اسٹول بالکل میرے قریب گھسیٹ لیا لیکن میں صوفے کے آخر کونے پر کھسک گئی۔ اوخدا میں خود کو کس قدر محفوظ سمجھ کر اور سکون سے بیٹھی تھی تین ہفتے تین صدیوں کی طرح کٹے تھے۔ یہ گزر تو چکے تھے اور اب جب میں نے اپنی پناہ کی جگہ ڈھونڈ لی تھی تو یہ پھر مجھے بہکانے آگیا۔ شیطان سانپ کا بھیس بدل کر حوا کو بہکانے آیا تھا۔ اور پھر وہ ——

میں نے خود کو ہوش میں لانے کے لئے زور سے اپنی

ران میں چٹکی بھرلی۔ اور دانت بھینچ لئے۔

"تم عورت ہو۔" وہ سختی سے بولا۔

"یقیناً۔" میں نے وثوق سے کہا۔

"اور پھر تم مجھ سے پوچھتی ہو۔ کہ کیوں؟"

"یہ کوئی بات نہیں ہوتی۔ تمہاری دلیل بالکل فضول ہے۔"

"کیا تم واقعی اُسے پسند کرتی ہو؟ — میرا مطلب ہے منظور کر۔" وہ ایک دم بولے۔

"کس قدر واہیات سوال ہے۔" میں نے حقارت سے کہا۔ "اور —"

"مگر — میں سوچتا ہوں —" اُس نے اپنا ہاتھ صوفے پر پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیا سوچتے ہیں آپ —" میں نے رکھائی سے کہا۔ وہ اور بھی قریب آگیا — میں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں سوچتا ہوں۔" آواز میں کس قدر نرمی تھی۔ "میں یہ کہنے آیا تھا کہ میں غلطی پر تھا۔ جنگل بڑے بھیانک ہوتے ہیں۔ خصوصاً تنہائی میں — سنو تو —" مجھے بولنے سے روک دیا۔ "میں تنہائی نہیں پسند کرتا۔ اب پسند نہیں کرتا — سنو تو میرا وہاں بہت دل گھبراتا ہے۔"

"میں — دیکھو بچے وچے کچھ نہیں پالوں گا۔ اگر تم ان کو چھوڑ کر چلی گیئں تو انہیں درندوں کی طرح پیٹوں گا۔ اور —" پھر بھنا اُٹھا۔

میں بمشکل اپنی ہنسی گھونٹ سکی۔

"اور یہ ناممکن کہ تم مجھے چھوڑ کر جا سکو۔"

"کیوں؟ — یہ کیوں؟" میں نے کہا۔

"یہ یوں کہ — کہ — میں — چھوڑو بھی اس بات کو — لاحول ولا قوۃ ایک دفعہ مجھ سے شادی کرنے کے بعد" — وہ بالکل قریب جھک گیا۔

"کون بے وقوف تم سے شادی کر رہا ہے — ذرا ہوش میں۔" میں نے پیچھے سرک کر کہا۔

"تم سنتی تو ہو نہیں — میرا وہاں بہت دل گھبراتا ہے۔ اور میں —" پھر بچوں کی طرح کہا۔

"تو میں کیا کروں۔ بلا سے گھبرائے آپ کا دل۔ جی ہاں مجھے کیا؟"

"بڑی خوبصورت جگہ ہے، تم کہو گی کہ بس جنت ہے۔" سرد سے آنکھیں نیم باز کرکے کہا۔

"بس معاف رکھیے اپنی جنت سے۔" میری آواز کمزور تھی۔

"ایک — ایک بات سنو۔" انہوں نے اپنا دہکتا ہوا گرم ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔

"ہاں کیا؟" میں نے کہا۔ اور سنسنی آنے لگی، ہلکی ہلکی کمزوری بڑھنا شروع ہوئی۔

"تم — سب کچھ سمجھتی ہو — کیوں ہے نا؟ پرسنتی ہو۔" وہ اور آگے جھکے۔ صوفے پر پیچھے سرکنے کی جگہ بھی تو نہ تھی۔

"اوہ — بھئی۔" میں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ مگر ایک تھکے ہوئے بچے کی طرح انہوں نے میری گود میں سر ڈال دیا۔ اس وقت!

"گھر گھر، پھٹ پھٹوں۔ فش۔" باہر برآمدے میں موٹر پھنکار رہی تھی!

"ارے پنکچر!" منظور کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔ اور ہم چوروں کی طرح ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

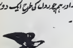

دوزخی

اپنے بھائی پر اس خاکے کے سوا عصمت اور کچھ نہ لکھتیں، تب بھی ان کا نام اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہتا

جب تک کالج سر پر سوار رہا پڑھنے لکھنے سے فرصت ہی نہ ملی جو ادب کی طرف توجہ کی جاتی اور کالج سے نکل کر بس دل میں یہی بات بیٹھ گئی کہ ہر وہ چیز جو دو سال پہلے لکھی گئی بوسیدہ، بد مذاق اور جھوٹی ہے۔ نیا ادب صرف آج اور کل میں ملے گا۔ اس نئے ادب نے اس قدر گڑبڑا یا کہ نہ جانے کتنی کتابیں صرف نام دیکھ کر ہی واہیات سمجھ کر پھینک دیں اور سب سے زیادہ بیکار کتابیں جو نظر آتیں وہ عظیم بیگ چغتائی کی تھیں۔ "گھر کی مرغی دال برابر" والا مضمون گھر کے ہر کونے میں ان کی کتابیں رلتی پھرتیں۔ مگر سوائے اماں اور دو ایک پرانے فیشن کی بھابیوں کے کسی نے اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ یہی خیال تھا بھلا ان میں ہوگا ہی کیا۔ یہ ادب نہیں پھکڑ، مذاق، پرانے عشق کے سڑیل قصے اور جی جلانے والی باتیں ہوں گی۔ یعنی بے پڑھے رائے قائم۔ مجھے خود یقین نہیں آیا کہ میں نے عظیم بھائی کی کتابیں کیوں نہ پڑھیں۔ شاید اس میں تھوڑا سا غرور بھی شامل تھا اور خودستائی بھی۔ یہ خیال ہوتا تھا یہ پرانے ہیں ہم نئے۔

ایک دن یونہی لیٹے لیٹے ان کا ایک مضمون "یکہ" نظر آیا۔ میں اور عظیم پڑھنے لگے۔ نہ جانے کس دھن میں تھے کہ ہنسی آنے لگی اور اس قدر آئی کہ پڑھنا دشوار ہو گیا۔ ہم پڑھ ہی رہے تھے کہ عظیم بھائی آگئے اور اپنی کتاب پڑھتے دیکھ کر کھل اٹھے مگر ہم جیسے چڑھ گئے اور منہ بنانے لگے وہ ایک ہوشیار تھے۔ بولے "لاؤ میں تمہیں سناؤں" اور یہ کہہ کر وہ ایک مضمون جو ہمیں سنائے تو صحیح معنوں میں ہم زمین پر لوٹنے لگے ساری بناوٹ غائب ہو گئی۔ ایک تو ان کے مضمون اور پھر ان کی ہی زبانی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہنسی کی چنگاریاں اڑ رہی ہیں جب وہ خوب احمق بنا چکے تو بولے۔

"تم لوگ تو کہتے ہو میرے مضمونوں میں کچھ نہیں" اور انھوں نے چھیڑا۔ ہمارے منہ اتر کر ذرا ذرا سے نکل آئے اور بے طرح چڑ گئے۔ جھنجھلا کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے۔ جی جل گیا اور پھر اس کے بعد اور بھی ان کی کتابوں سے نفرت ہو گئی۔

میں نے ان کے مضامین کی ان کی زندگی میں کبھی تعریف نہ کی، حالانکہ وہ میرے مضمون دیکھ کر ایسے

خوش ہوتے تھے کہ بیان نہیں۔ اس قدر پیار سے تعریف کرتے تھے مگر یہاں تو ان کی ہر بات سے چڑنے کی عادت تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جب وہ شخص کسی کا مذاق اڑاتا تھا تو جی چاہتا تھا بچوں کی طرح زمین پر مچل جائیں اور روئیں۔ کس قدر طنز، کیسی کڑوی مسکراہٹ اور رکتے ہوئے جملے۔ میں تو ہر وقت ڈرتی تھی کہ میرا مذاق اڑایا اور میں نے بدزبانی کی۔ کبھی کہتے تھے۔ "مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم مجھ سے اچھا نہ لکھنے لگو" اور میں نے صرف چند مضمون لکھے تھے۔ اس لیے جی جلتا تھا کہ یہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔

ان کے انتقال کے بعد نہ جانے کیوں مرنے والے کی چیزیں پیاری ہوگئیں۔ ان کا ایک ایک لفظ چبھنے لگا اور میں نے عمر میں پہلی دفعہ ان کی کتابیں دل لگا کر پڑھیں۔ دل لگا کر پڑھنے کی بھی خوب رہی۔ گویا دل لگانے کی بھی ضرورت تھی۔ دل خودبخود کھنچنے لگا۔ اُفوہ! تو یہ کچھ لکھا ہے۔ ان رلنے والی کتابوں میں ایک ایک لفظ پر ان کی تصویر آنکھوں میں کھنچ جاتی اور پل بھر میں وہ غم اور دکھ میں ڈوبی ہوئی مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی آنکھیں وہ اندوہناک سیاہ گھٹاؤں کی طرح مرجھائے ہوئے چہرے پر پڑے ہوئے گھنے بال۔ وہ پیلی نیلاہٹ لیے ہوئے بلند پیشانی، پژمردہ اودے ہونٹ۔ جن کے اندر قبل از وقت توڑے ہوئے ناہموار دانت اور وہ لاغر سوکھے سوکھے ہاتھ اور عورتوں جیسے نازک دواؤں میں بسی ہوئی لمبی انگلیوں والے ہاتھ اور پھر ان ہاتھوں پر ورم آ گیا تھا۔ پتلی پتلی کھپچی جیسی ٹانگیں جن کے سرے پر ورم سے سوجے ہوئے بدوضع پیر جن کے دیکھنے کے ڈر کی وجہ سے ہم لوگ ان کے سرہانے ہی کی طرف جایا کرتے تھے اور سوکھے ہوئے پنجرے جیسے سینے پر دھونکنی کا شبہ ہوتا تھا۔ کلیجوں پر ہزاروں کپڑوں، بنیانوں کی تہیں اور اس سینے میں ایسا پھڑکتا ہوا چلبلا دل! یا اللہ یہ شخص کیونکر ہنستا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھوت ہے یا جن جو ہر خدائی طاقت سے کشتی لڑ رہا ہے تبھی مانتا مسکرائے جاتا ہے۔ خدا قہار و جبار چڑھ چڑھ کر کھانسی اور دمے کے عذاب نازل کر رہا ہے اور یہ دل قہقہے نہیں چھوڑتا۔ کون دنیا اور دین کا دکھ تھا جو قدرت نے بچا رکھا تھا۔ مگر پھر بھی رلا نہ سکا۔ اس دکھ میں جلن میں ہنستے ہی نہیں ہنساتے رہنا کسی انسان کا کام نہیں۔ ماموں کہتے تھے۔ "زندہ لاش" خدایا اگر لاشیں بھی اس قدر جاندار، بے چین اور پھڑکنے والی ہوتی ہیں تو پھر دنیا ایک لاش کیوں نہیں بن جاتی۔

میں ایک بہن کی حیثیت سے نہیں ایک عورت بن کر ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی تو دل لرز اٹھتا تھا۔ کس قدر ڈھیٹ تھا ان کا دل! اس میں کتنی جان تھی! منہ پر گوشت نام کو نہ تھا۔ مگر کچھ دن پہلے چہرے پر ورم آ جانے سے چہرہ خوبصورت ہو گیا تھا۔ کنپٹیاں بھر گئی تھیں۔ پچکے ہوئے گال دبیز ہو گئے تھے ایک موت کی سی جلا چہرے پر آئی تھی اور رنگت میں کچھ عجب طلسمی سبزی سی آگئی تھی جیسے حنوط کی ہوئی ممی! مگر آنکھیں معلوم ہوتا تھا کسی بچے کی شریر آنکھیں جو ذرا سی بات پر ناچ اٹھتی تھیں اور پھر کبھی ان میں نوجوان لڑکوں کی سی شوخی جاگ اٹھتی تھی اور یہی آنکھیں کبھی دورے کی شدت سے گھبرا کر چیخ اٹھتیں ان کی صاف شفاف نیلی سطح گدلی زرد ہو جاتی اور بیکس ہاتھ لرزنے لگتے سینہ پھٹنے پر آ جاتا۔ دورہ ختم ہوا کہ پھر وہی روشنی، پھر وہی رقص، پھر وہی چمک۔

ابھی چند دن ہوئے میں نے پہلی مرتبہ "خانم" پڑھی۔ ہیرو وہ خود نہیں ان میں اتنی جان ہی کب تھی۔ مگر وہ ہیرو ان کے تخیل کا ہیرو ہے۔ وہ ان کے دبے ہوئے جذبات کا تخیل مجسم ہے جیسے ایک لنگڑا خوابوں میں خود کو ناچتا

کودتا، دوڑتا ہوا دیکھتا ہے۔ ایسے ہی وہ مرض میں گرفتار نڈھال پڑے اپنے ہمزاد کو شرارتیں کرتا دیکھتے تھے۔ کاش ایک دفعہ اور صرف ایک دفعہ ان کی خانم اس ہیرو کو دیکھ لیتی۔

شاید اوروں کے لیے خانم کچھ بھی نہیں۔ لیکن سوائے لکھنے والے کے اور باقی کے سارے کیرکٹر درست اور زندہ ہیں۔ بھائی صاحب، بھائی جان، نانی اماں، شیخانی، والد اور خانم جھگڑ رہی ہیں۔ وہ بھائی صاحب شرارتیں ایجاد کررہے ہیں اور مصنف خود؟ سر جھکائے خاموش تصویر کشی میں مشغول ہیں۔

"کھریا بہادر" جس کا پہلا ٹکڑا "روح لطافت" میں چھپا ہے، یہ سب تخیل ہے۔ لاچار و مجبور انسان اپنے ہمزاد سے دنیا جہاں کی شرارتیں کروا لیتا ہے۔ وہ خود تو دو قدم نہیں چل سکتا۔ لیکن ہمزاد چوریاں کرتا، شرارتیں کرتا

عصمت چغتائی عظیم بیگ چغتائی صاحب کے اہل خاندان کے ہمراہ

صاحب، بھتیجے، بھنگی، بہشتی، یہ سب کے سب ہیں اور رہیں گے۔ یہی ہوتا تھا بالکل یہی اور اب بھی سب گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کم از میرے گھر میں تو بقا اور ایک ایک لفظ گھر کی سچی تصویر ہے۔ جب عظیم بیگ لکھتے تھے تو سارا گھر اور ہم سب ان کے لیے ایکٹنگ کیا کرتے تھے ہم ملتے جلتے کھلونے تھے اور وہ ایک نقاش جس نے بالکل اصل کی نقل کردی۔ جتنی دفعہ خانم کو پڑھتی ہوں یہی معلوم ہوتا ہے۔ خاندان کا گروپ دیکھتی ہوں۔ وہ بھابی جان

ہے خود تو ایک انگلی کا بوجھ نہیں سہار سکتا۔ مگر ہمزاد جی بھر کر مار کھاتا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ مصنف کو ارمان تھا کہ کاش وہ بھی اتنا مضبوط ہوتا۔ دوسرے بھائیوں کی طرح۔ ڈیڑھ ڈیڑھ سو جوتے کھا کر کم جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ تندرست لوگ کیا جانیں ایک بیمار کے دل میں کیا کیا ارمان ہوتے ہیں۔ پر کٹا پرندہ ویسے نہیں تو خوابوں میں تو دنیا بھر کی سیر کر آتا ہے۔ یہی حال ان کا تھا۔ وہ جو کچھ ہوتے افسانہ میں دبی بن کر دل کی آگ بجھا لیتے تھے۔

کچھ تو چاہیئے نا جینے کے لئے۔

شروع ہی سے روتے دھوتے پیدا ہوئے۔ روئی کے گالوں پر رکھ کر پالے گئے۔ کمزور دیکھ کر ہر ایک معاف کر دیتے۔ ہر ایک دل جوئی میں لگا رہتا۔ مگر بیمار کو بیمار کہو تو اسے خوشی کب ہو گی۔ ان مہربانیوں سے احساسِ کمزوری اور بڑھتا۔ بغاوت اور بڑھتی۔ غصہ بڑھتا، مگر بے بس، سب نے ان کے ساتھ گاندھی جی والی "نان وائلنس" شروع کر دی تھی۔ وہ چاہتے تھے کوئی تو انہیں بھی انسان سمجھے، انہیں بھی کوئی ڈانٹے، انہیں بھی کوئی زندہ لوگوں میں شمار کرے۔ لہٰذا ایک ترکیب نکالی اور وہ یہ کہ فسادی بن گئے۔ جہاں چاہا دو آدمیوں کو لڑا دیا۔ اللہ نے دماغ دیا ہے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ بلا کا تخیل اور تیز زبان چٹخارے لے لے کر کچھ ایسی ترکیبیں چلتے کہ جھگڑا ضرور ہوتا۔ بہن، بھائی، ماں، باپ سب کو نفرت ہو گئی۔ اچھا خاصا گھر میدانِ جنگ بن گیا اور سب مصیبتوں کے ذمہ دار خود۔ بس ساری خود پرستی کے جذبات مطمئن ہو گئے، اور کمزور، لاچار، ہر دم کا روگی تھیٹر کا ولین ہیرو بن گیا اور کیا چاہیئے۔ ساری کمزوریاں ہتھیار بن گئیں۔ زبان بد سے بدتر ہو گئی۔ دنیا میں ہر کوئی نفرت کرنے لگا۔ صورت سے جی متلانے لگا۔

لیکن مقصد یہ تو نہ تھا کہ واقعی دنیا انہیں چھوڑ دے۔ گھر والوں نے جتنا ان سے کھنچنا شروع کیا۔ اتنا ہی وہ چپٹے۔ آخر میں تو خدا معاف کرے ان کی صورت دیکھ کر نفرت آتی تھی۔ وہ لاکھ کہتے مگر دشمن نظر آتے تھے۔ بیوی شوہر نہ سمجھتی۔ بچے باپ نہ سمجھتے۔ بہن نے کہہ دیا تم میرے بھائی نہیں، اور بھائی آواز سن کر نفرت سے منہ موڑ لیتے۔ ماں کہتی۔ "سانپ جنا تھا میں نے!"

مرنے سے پہلے قابلِ رحم حالت تھی۔ بہن ہو کر نہیں انسان بن کر کہتی ہوں جی چاہتا تھا جلدی سے مر چکیں۔ آنکھوں میں دم ہے۔ مگر دل دکھانے سے نہیں چوکتے۔ عذاب دوزخ بن گئے ہیں۔ ہزاروں کہانیوں، افسانوں کا ہیرو ایک ولین بن کر مطمئن ہو چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اب بھی کوئی اسے پیار کرے، بیوی پوجا کرے۔ بچے محبت سے دیکھیں۔ بہنیں واری جائیں اور ماں کلیجہ سے لگائے۔

ماں نے واقعی پھر کلیجہ سے لگا لیا۔ بھولا بھٹکا راستہ پر آن لگا۔ آخر کو ماں تھی مگر اوروں کے دل کی نفرت نہ گئی۔ یہاں تک کہ پھیپھڑے ختم ہو گئے۔ ورم بڑھ گیا۔ آنکھیں چندھیا گئیں اور اندھوں کی طرح ٹٹولنے پر بھی راستہ نہ ملا۔ ہیرو بن کر بھی ہار ان کی ہی رہی۔ جو چاہا نہ ملا اس کے بدلے نفرت، حقارت، کراہت ملی۔ انسان کس قدر پُر ہوس ہوتا ہے۔ اتنی شہرت اور نام ہونے کے باوجود حقارت کی ٹھوکریں کھا کر جان دی۔ صبح چار بجے آج سے ۴۲ برس پہلے جو ننھا سا کمزور بچہ پیدا ہوا تھا۔ وہ زندگی کا ناٹک کھیل چکا تھا۔ ۲۰، اگست کو صبح چھ بجے شمیم نے آ کر کہا "منے بھائی ختم ہو رہے ہیں۔ اُٹھو!"

"وہ کبھی ختم نہ ہوں گے —— بیکار مجھے جگا رہے ہو ——" میں نے بگڑ کر صبح کی ٹھنڈی ہوا میں پھر سو جانے کا ارادہ کیا۔

"ارے کمبخت تجھے یاد کر رہے ہیں ——" شمیم نے کچھ پریشان ہو کر ہلایا۔

"انی سے کہہ دو اب حشر کے دن ملیں گے —— ارے شمیم وہ کبھی نہیں مر سکتے" میں نے وثوق سے کہا۔ مگر جب میں نیچے آئی تو ان کی زبان بند ہو چکی تھی۔ کمرہ سامان سے خالی کر دیا گیا تھا۔ سارا کوڑا کرکٹ، کتابیں، ہٹا دی گئی تھیں۔ دوا کی بوتلیں لاچاری کی تصویر بنی لڑھک رہی تھیں۔ دو ننھے بچے پریشان ہو ہو

کر دروازے کو تک رہے تھے۔ بھابی انھیں زبردستی چائے پلا رہی تھیں، آنسو بند تھے۔

"منّے بھائی" میں نے ان پر جھک کر کہا۔ ایک لمحے کو آنکھیں اپنے محور پر رکیں، ہونٹ سکڑے، اور پھر وہی نزع کی حالت طاری ہو گئی، ہم سب باہر بیٹھ کر چار گھنٹے تک سوکھے بے جان ہاتھوں کی جنگ دیکھتے رہے معلوم ہوتا تھا عزرائیل بھی پست ہو رہے ہیں جنگ تھی کہ ختم ہی نہ ہوتی تھی۔

"ختم ہو گئے منے بھائی ـــــ" نہ جانے کس نے کہا

"وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے" مجھے خیال آیا۔

اور آج میں ان کی کتابیں دیکھ کر کہتی ہوں، ناممکن ہے وہ کبھی نہیں مر سکتے ان کی جنگ اب بھی جاری ہے۔ مرنے سے کیا ہوتا ہے۔ میرے لیے تو وہ مر کر ہی جیے اور نہ جانے کتنوں کے لیے وہ مرنے کے بعد پیدا ہوں گے اور برابر پیدا ہوتے رہیں گے۔ ان کا پیغام "دکھ سے ڈرو، نفرت سے لڑو، اور مر کر بھی لڑتے رہو۔" یہ کبھی نہ مر سکے گا۔ ان کی باغیانہ روح کو کوئی نہیں مار سکتا۔ وہ نیک نہیں تھے۔ پارسا نہ ہوتے اگر ان کی صحت اچھی ہوتی۔ وہ جھوٹے تھے ان کی زندگی جھوٹی تھی۔ سب سے بڑا جھوٹ تھی۔ ان کا رونا جھوٹا۔ ہنسنا جھوٹا۔ لوگ کہتے ہیں ماں باپ کو دکھ دیا۔ بیوی کو دکھ دیا۔ بچوں کو دکھ دیا اور سارے جگ کو دکھ دیا۔ وہ ایک عفریت تھے جو عذاب دنیا بن کر نازل ہوئے تھے اور اب دوزخ کے سوا ان کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ اگر دوزخ میں ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانا ہے تو ایک بار تو ضرور اس دوزخ میں جانا پڑے گا۔ صرف یہ دیکھنے کہ جس شخص نے دنیا کی دوزخ میں یوں ہنس ہنس کر تیر کھائے اور تیر اندازوں کو کڑھاؤ میں تلا۔ وہ دوزخ میں عذاب نازل کرنے والوں کو کیا کچھ نہ چڑھا چڑھا کر ہنس رہا ہو گا۔ بس میں وہ تلخ طنز سے بھری ہنسی دیکھنا چاہتی ہوں۔ جسے دیکھ کر دوزخ کا داروغہ بھی جل اٹھتا ہو گا۔

مجھے یقین ہے وہ اب بھی ہنس رہا ہو گا۔ کیڑے اس کی کھال کو کھا رہے ہوں گے۔ ہڈیاں مٹی میں مل رہی ہوں گی۔ ملاؤں کے فتوؤں سے ان کی گردن دب رہی ہو گی۔ آہوں سے اس کا جسم چیرا جا رہا ہو گا۔ مگر وہ ہنس رہا ہو گا آنکھیں شرارت سے ناچ رہی ہوں گی

اسکیچ کے لیے اردو میں خاکہ نگاری، مرقع، قلمی تصویر وغیرہ اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں، ان میں خاکہ سب سے موزوں اصطلاح ہے۔

عصمت چغتائی نے ممکن ہے ایک آدھ اسکیچ اور بھی لکھا ہو، لیکن "دوزخی" ان کا ایسا کارنامہ ہے جس کے ہوتے ہوئے یہ ضروری نہیں رہتا کہ ان کے لکھے ہوئے دوسرے خاکوں کی چھان بین ـــ یا خواہش بھی کی جائے۔

عصمت چغتائی اردو کی بہترین افسانہ نگار ہیں۔ ان کی حقیقت نگاری سے بعضوں نے تو پناہ مانگی ہے۔ لیکن اگر وہ "دوزخی" کے سوا اور کچھ نہ لکھتیں تب بھی ان کا نام اردو میں ہمیشہ زندہ رہتا۔ مغربی زبانوں کا ادب پڑھ کر جو مبہم سی خلش احساسِ کمتری کی اردو والوں کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے، وہ "دوزخی" جیسے مضامین پڑھ کر دور ہو سکتی ہے۔

نثار احمد فاروقی

نیلے مردہ ہونٹ تمخی سے پی رہے ہوں گے مگر کوئی اُسے رُلا نہیں سکتا۔

وہ شخص جس کے پھیپھڑوں میں ناسور، ٹانگیں عرصہ سے اکڑی ہوئی بانہیں انجکشنوں سے گدی ہوئی۔ کولہے میں امرود برابر پھوڑا، آخری دم اور چیونٹیاں جسم میں لگنا شروع ہو گئیں۔ کیا ہنس کر کہتا ہے۔ "یہ چیونٹی صاحبہ بھی کس قدر بے صبر ہیں۔ یعنی قبل از وقت اپنا حصہ لینے آن پہونچیں" یہ مرنے سے دو دن پہلے کہا دل چاہئے پتھر کا کلیجہ ہو۔ مرتے وقت جملے کسنے کے لئے۔

ان کا ایک جملہ ہو تو لکھا جائے۔ ایک نقطہ ہو جو یاد آئے۔ پوری کی پوری کتابیں ایسے ایسے چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں۔ دماغ تھا کہ انجن! بنا آگ پانی کے ہر وقت چلتا رہتا تھا اور زبان تھی کہ قینچی! اس قدر نپے تلے جملے نکالتی تھی کہ جسم کر رہ جاتے تھے۔

نئے لکھنے والوں کے آگے ان کی گاڑی نہیں چلی۔ دنیا بدل گئی ہے خیالات بدل گئے ہیں۔ ہم لوگ بدزبان ہیں اور منہ پھٹ۔ ہم دل دکھتا ہے تو رو دیتے ہیں۔ سرمایہ داری۔ سوشلزم اور بیکاری نے ہم لوگوں کو جھلا دیا ہے ہم جو کچھ لکھتے ہیں، دانت پیس پیس کر لکھتے ہیں اپنے پوشیدہ دکھوں، کچلے ہوئے جذبات کو زہر بنا کر اگلتے ہیں۔ وہ بھی دکھی تھے، نادار، بیمار اور مفلس تھے سرمایہ داری سے عاجز مگر پھر بھی اتنی ہمت تھی کہ زندگی کا منہ چڑاتے تھے دکھ میں ٹھٹھے لگاتے تھے۔ وہ افسانوں ہی میں نہیں ہنستے تھے زندگی کے ہر معاملہ میں ہنس کر دکھ کو نیچا کر دیتے تھے۔

باتوں کے اس قدر شوقین کہ دنیا کا کوئی انسان ہو، اس سے دوستی کر یا بہادر میں جو شاہ لنگران کے حالات ہیں وہ ایک میراثن سے معلوم ہوئے اس سے ایسی دوستی تھی کہ بس بیٹھے ہیں اور گھنٹوں گفتگو ہو رہی ہے لوگ متحیر ہیں کہ یا اللہ یہ بڑھیا میراثن سے کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ مگر جو کچھ انہوں نے لکھا اسی بڑھیا میراثن نے بتایا ہے۔

اور تو اور بھنگن۔ بہشتن، راہ چلتوں کو روک کر باتیں کرتے تھے یہاں تک کہ کچھ دن ہسپتال میں رہے۔ وہاں رات کو جب خاموشی ہو جاتی، آپ چپکے سے سارے مریضوں کو سمیٹ کر گپیں اڑایا کرتے، بڑے بڑے قصے سنتے اور سناتے۔ وہی قصے "سوانہ کی روحیں"، "جہارانی کا خواب"، "چکی" اور "بریڈے" بن گئے۔ وہ ہر چیز زندگی سے لیتے تھے اور زندگی میں کتنے جھوٹ ہیں۔ یہی بات ہے ان کی کہانیوں میں۔ بہت سی باتیں بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں۔ چونکہ ان کا شاعرانہ تخیل ہر بات کو یقین کرتا ہے۔

ان کی ناولیں بعض جگہ واہیات ہیں۔ فضول سی۔ خصوصاً "گولتار" تو بالکل ردی ہے مگر اس میں بھی حقیقت کو اصلی صورت میں گڑبڑ کر کے لکھ دیا ہے "شریر بیوی" تو بالکل فضول ہے۔ مگر اپنے زمانے کی بڑی چلتی ہوئی چیز تھی۔

"چکی" ایک دہکتا ہوا شعلہ ہے۔ یقین نہیں آتا کہ اس قدر سوکھا مارا انسان جس نے اپنی بیوی کے علاوہ کسی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا، تخیل میں کس قدر عیاش بن جاتا ہے۔ اف وہ چکی کی ناموش نگاہوں کے پیغام۔ ہیرو کا اس کی حرکتوں سے مسحور ہو جانا اور پھر خود مصنف کی زندگی کس قدر مکمل جھوٹ۔ یہ عظیم بھائی نہیں ان کا ہمزاد ہوتا تھا۔ جو ان کے جسم سے دور ہو کر حسن و عشق کی عیاشیاں کراتا تھا۔

عظیم بھائی کی مقبولیت یوں بھی موجودہ ادب میں یعنی بالکل نئے ادب میں نہ تھی کہ وہ کھلی باتیں نہ لکھتے تھے وہ عورت کا حسن دیکھتے تھے مگر اس کا جسم بہت کم دیکھتے

دوزخی

کہانیوں کے علاوہ عصمت چغتائی کا ایک مضمون "دوزخی" ہے۔ اس مضمون کی بے رحم راست بازی، اس کی پُرخلوص سفّاکی ہمارے ہاں بالکل نئی چیز ہے میں چاہتا ہوں کہ اسے بہت سے لوگ پڑھیں۔ اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ عصمت صاحبہ کہانیوں کے نیلے پیلے غبارے اُڑانے کے علاوہ نہایت جاندار مضمون بھی لکھ سکتی ہیں اور جس خوبی سے انھوں نے اس مضمون کا حق ادا کیا ہے، بہت اُمید افزا معلوم ہوتا ہے۔

فیض احمد فیض

تھے۔ جسم کی بناوٹ کی داستانیں پرانی مثنویوں گل بکاؤلی، زہرِ عشق وغیرہ میں بہت نمایاں تھیں اور پھر انھیں پرانی کہہ دیا گیا تھا لیکن اب پھر یہ فیشن نکلا ہے کہ وہی پرانا سینہ کا اتار چڑھاؤ، پنڈلیوں کی گاؤدُمی رانوں کا گداز نیا ادب بن گیا ہے۔ وہ اسے عریانی سمجھتے تھے اور عریانی سے ڈرتے تھے، گو جذبات کی عریانی ان کے یہاں عام ہے اور بہت غلیظ باتیں بھی کہنے میں نہیں جھجکتے تھے۔ وہ عورت کے جذبات تو عریاں دیکھتے تھے مگر خود اسے کپڑے پہنے دیکھتے تھے، وہ زیادہ بے تکلفی سے مجھ سے باتیں نہیں کہتے تھے اور بہت بچہ سمجھتے تھے۔ کبھی کسی جنسی مسئلہ پر تو وہ کسی سے بحث کرتے ہی نہ تھے۔ ایک دوست سے صرف اتنا کہا کہ "نئے ادیب بڑے جوشیلے ہیں، لیکن بھوکے ہیں اور اوپر سے ان پر جنسی اثر بہت ہے۔ جو کچھ لکھتے ہیں 'اماں کھانا' معلوم ہوتا ہے وہ یہ بھی کہا کرتے کہ ہندوستانی ادب میں ہر زمانے میں جنس بہت نمایاں رہتی ہے۔ یہاں کے لوگ جنس سے بہت متاثر ہیں۔ ہماری شاعری مصوری قدیم پرستش سے بھی جنسی بھوک کا پتہ چلتا ہے۔ اگر فرا دیر عشق و محبت کو بھول جائیں تو مقبول عام نہیں رہ سکتے یہی وجہ ہے کہ بہت جلد ادب میں ان کا رنگ غائب ہو کر وہی "الف لیلہ" کا رنگ غالب آگیا۔

انھیں حجاب امتیاز علی سے خاص لگاؤ تھا (ہمی عزیز سے معافی مانگ کر کہوں گی کہ مرنے والے کا راز ہے)، کہا کرتے تھے "یہ عورت بہت پیارے جھوٹ بولتی ہے"۔ انھیں شکایت تھی کہ میں بہت ہی لٹھ سیدھے جھوٹ بولتی ہوں میرے جھوٹ بھوکے کی پکار ہیں، اور ان کے جھوٹ بھرے کی مسکراہٹیں۔ اللہ جانے ان کا کیا مطلب ہوتا تھا۔

ہم ان کے افسانوں کو عموماً "جھوٹ" کہا کرتے تھے، جہاں انھوں نے کوئی بات شروع کی اور والد صاحب مرحوم ہنسے۔ "پھر" "قمر صحرا" کہنے لگے؟ وہ ان کی گپوں کو "قمر صحرا" کہتے تھے۔ عظیم بھائی کہتے "سرکار دنیا میں جھوٹ بغیر کوئی رنگینی نہیں! بات کو دلچسپ بنانا چاہو تو جھوٹ اس میں ملا دو۔"

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ "جنّت اور دوزخ کا بیان بھی تو "قمر صحرا" ہے۔

اس پر ماموں کہتے :۔

"ارے اس زندہ لاش کو منع کرو کہ یہ کفر ہے"

اسی پر وہ ماموں کے توہم پرست سسرال والوں کا تمسخر اڑاتے تھے۔

انھیں پیری مریدی ڈھونگ معلوم ہوتا تھا لیکن کہتے تھے" دنیا کا ہر ڈھونگ ایک مزے دار جھوٹ ہے اور جھوٹ ہی مزے دار ہے۔"

کہتے تھے "میری صحت اجازت دیتی تو میں اپنے باپ کی قبر پجوا دیتا بس دو سال قوالی کرا دیتا اور چادر چڑھاتا۔

مزے سے آمدنی ہوتی ــــ"

انھیں دھوکہ باز اور مکار آدمی سے مل کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔ کہتے تھے "دھوکہ اور مکاری مذاق نہیں، عقل چاہیئے ان چیزوں کے لیے"

انھیں ناچ گانے سے بڑا شوق تھا، مگر کس ناچ سے ؟ یہ جو فقیر بچے آتے ہیں ان کا۔ عموماً پیسے دے کر دھول میں ناچتے ہوئے فقیروں کو اس شوق سے دیکھا کرتے تھے کہ ان کا انہماک دیکھ کر رشک آتا تھا۔ نہ جانے انھیں اس ننگے بھوکے ناچ میں کیا کچھ نظر آتا تھا۔

میں نے انھیں کبھی نماز پڑھتے نہ دیکھا۔ قرآن شریف لیٹ کر پڑھتے تھے اور بے ادبی سے اس کے ساتھ ساتھ سو جاتے تھے۔ لوگوں نے ملامت کی تو اس پر کاغذ چڑھا کر کہہ دیا کرتے تھے۔ کچھ نہیں قانونی کتاب ہے۔ جرح تو خوب نبھاتے تھے۔

حدیث بہت پڑھتے تھے اور لوگوں سے بحث کرنے کے لئے عجیب عجیب حدیثیں ڈھونڈھ کر حفظ کر لیتے تھے اور سنا کر لڑا کرتے تھے۔ ان حدیثوں سے لوگ بڑے عاجز تھے۔ قرآن کی آیات بھی یاد تھیں اور بے تکان حوالہ دیتے تھے۔ شک کرو تو سرہانے سے قرآن نکال کر دکھا دیتے تھے۔

یزید کے بڑے مدح تھے اور امام حسین کی شان میں بکواس کیا کرتے تھے۔ لوگوں سے گھنٹوں بحث ہوتی تھی کہتے تھے "میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت امام حسین کھڑے ہیں، ادھر سے یزید لعین آیا۔ آپ کے پیر پکڑ لئے۔ گڑگڑایا، ہاتھ جوڑے تو آپ کا خون جوش مارنے لگا۔ اور اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ بس میں نے بھی اسی دن سے یزید کی عزت شروع کر دی۔ جنت میں تو ان کا ملاپ بھی ہو گیا۔ پھر ہم کیوں لڑیں"

سیاسیات سے کم دلچسپی تھی۔ کہتے تھے "بابا ہم لیڈر بن نہیں سکتے تو پھر کیا کہیں، لوگ کہیں گے تم ہی کچھ کر کے دکھاؤ اور میاں کمبخت کھانسی اور دمہ نہیں چھوڑتا۔ بہت سال ہوئے کچھ مضامین ریاست میں سیاسیات اور اکنومکس پر لکھے تھے۔ وہ نہ جانے کیا ہوئے۔ مذہب کا جنون سا تھا۔ مگر آخر میں آکر بحث کم کر دی تھی۔ کہتے تھے :۔

"بھئی تم لوگ تو ہٹے کٹے ہو اور میں مرنے والا ہوں اور جو کہیں دوزخ جنت سب نکل آئیں تو کیا کروں گا۔ لہٰذا چپ ہی رہو۔ پردہ کے خلاف تو کبھی سے تھے مگر آخر میں کہتے تھے" یہ پرانی بات ہو گئی۔ اب پردہ لوگے سے نہیں رک سکتا۔ اس معاملہ میں ہم بہت کچھ اپنی پریشانیاں ہیں۔" لوگ کہتے تھے دوزخ میں جاؤ گے تو فرشتہ "میاں کونسی اللہ میاں نے جنت دے دی جو وہاں دوزخ کی دھمکیاں ہیں کچھ پرواہ نہیں ہم تو عادی ہیں۔ اللہ میاں اگر ہمیں دوزخ میں جلائیں گے تو ان کی لکڑی اور کوئلہ بیکار جائے گا۔ کیونکہ ہم تو ہر عذاب کے عادی ہیں ــــ" کبھی کہتے "اگر دوزخ میں رہے تو ہمارے جراثیم تو مر جائیں گے۔ جنت میں تو ہم سارے مولویوں کو دق میں لپیٹ لیں گے۔"

یہی وجہ ہے کہ سب انھیں باغی اور دوزخی کہتے تھے۔ وہ کہیں پر بھی جائیں میں دیکھنا چاہتی ہوں، کیا وہاں بھی ان کی وہی قینچی جیسی زبان چل رہی ہے! کیا وہاں وہ حوروں سے عشق لڑا رہے ہیں۔ یا دوزخ کے فرشتوں کو جلا کر مسکرا رہے ہیں۔ مولویوں سے الجھ رہے ہیں۔ یا دوزخ کے بھڑکتے شعلوں میں ان کی کھانسی گونج رہی ہے۔ پھیپھڑے پھول رہے ہیں اور فرشتے ان کے انجکشن گھونپ رہے ہیں۔ فرق ہی کیا ہے۔ ایک دوزخ سے دوسری دوزخ ہیں۔ دوزخی کا کیا ٹھکانا؟

* *

کلّو کی ماںٔ

سہاگ کی رات جب وہ حجلۂ عروسی میں داخل ہوئی تو کیا دیکھتی ہے کہ......

جمّو بجیا کے جہالے کا جوڑا دھوم دھڑاکے سے سل رہا تھا۔ چچی بی اور اماں جی میں دھواں دھار بحث ہو رہی تھی۔ چچی بی مصر تھیں کہ چھپا ٹوئی کا زمانہ گیا۔ نئے فیشن کی رو سے بنت کے اوپر تلے اسپنولی بیل اور گنگا جمنی کرن خوب کھلے گی۔

اماں جی کہتی تھیں۔

"کرن موئی نفتی دو گھڑی میں بٹ کر کشتلی ہو جاوے ہے۔ چھپا برسوں بھی ویسے کا ویسا ہے۔"

بجیا اپنے جہیز سے ڈوبے بے تعلق سی بیٹھی، بچوں کے سنگ گوٹ پیس کھیل رہی تھیں۔ مگر جی ان کا بنت اور گوکھرو میں اُلجھا ہوا تھا۔ وہ اُن دیدے کا پانی ڈھلی کنواریوں میں سے نہ تھیں جو کھلے بندوں بیٹھ کر اپنا جہیز سیتی ہیں۔ کبھی ان سے کچھ ٹکوانا ہوتا تو چچی بی کہتیں۔

"جمّو بیٹی ذرا میرے کرتے پر تخمل کے پھول ٹانک دو۔" بجیا سمجھ جاتیں مگر پھول ٹانکے دیتیں سب کے سامنے نہیں۔ دالان در دالان سے جا کر چچی بی نے پیتی کر یپ کے ڈوپٹے پر ٹابیٹی کی بنت کے آس پاس اسپنولی بیل اور گنگا جمنی کرن جا کر پوچھا۔

"کیوں جمّو، کیسا لگتا ہے؟"

بجیا شرم سے کنارہ ہو گئیں اور بوکھلاہٹ میں اپنے اڑی کے راستے پر تڑپ مار دیا۔ اماں جی سے کہا، "ہے ہے دولہن، خدا خیر کرے، تمہاری تو جانو مت ماری گئی ہے۔ اسے وہ بیچاری کیا بولے گی۔"

مگر کہنا چچی بی کا ماننا پڑا۔ چچی بی تھیں بھی تو فیشن ایبل۔ بوپٹوں کے بال کا فیشن وہ اپنے میکے سے لائیں جو سارے محلے میں وبا کی طرح پھیل گیا۔ کاشغاری سیندھ تک پوتتی تھیں۔ سرخ پتنگ کا کاغذ جس میں زیور بندھ کر آتے ہمیشہ ان کی پاندان کی ڈبیا میں اڑسا رہتا۔ سب کی آنکھ بچا کے پان کھاتے وقت ہونٹوں پر کاغذ تھوک سے تر کر کے گھسا مار لیتیں۔ اور ان کے سانولے لب اسٹک لگ جاتی۔ کرن کے حق میں فیصلہ ہونے کے بعد جوڑا سلنے لگا۔

چندھی میاں نے ترنگ میں آکر لرزتی بلغم بھری آواز میں گانے شروع کر دیئے۔ ایک دم جیسے سب کے دلوں میں شہنائیاں بج اٹھیں۔ شادیوں کا موسم سا ٹوٹ پڑا۔ جوڑے پہ جوڑے لگائے جانے لگے۔ رفیق میاں کی رضیہ بی سے فریدہ بی کی پنو میاں سے، رشید میاں کی صفو بی سے ڈور باندھی جانے لگی۔

"تو کس سے بیاہ کرے گا رے؟" مذاق میں چچی بی نے چھٹو سے پوچھا "تم سے!" دو برس کے چھوٹے ماں کی گود میں مچل کر فیصلہ کیا۔ سب ہنس پڑے۔ بات پھیلتی ہی گئی۔ یہاں تک کہ کنواری بجیا کے ہونے والے لڑکے یا لڑکی کا بھی جوڑا لگا دیا گیا۔ کلو کی ماں دہلیز پر بیٹھی دھنیا کی گٹھری کوٹ رہی تھیں، ترنگ میں آکر بولیں۔ "اے رے کلوے تو کس سے بیاہ کرے گا؟"

"اچھا بی بی سے"، پانچ برس کے کلوے نے کپّا گالوں والی نوشابہ بی کی طرف پیار سے دیکھ کر کہا۔ اور چھابہ بی بی کھِل کھِل کر ہنس پڑیں۔ سب ہی ہنس پڑے مگر چچی بی کا شہابی رنگ تمتما کر قرمزی ہو گیا۔ اٹھی جوتی۔ تڑ تڑ کلوے کے ناک، منہ اور سر پہ جڑ دیں۔ ہنسی میں کھنسی ہو گئی۔ تاش کے پتے پھینک پھانک جمو بجیا روتے ہوئے چھبو کو لپے پہ ٹکا کے ٹھنکنے لگیں۔ اماں جی نے بسورتی ہوئی چھابہ کو گود میں سمیٹ لیا۔ کلو کی ناک سے جیتے جیتے خون کی تلی بہنے لگی۔ کلو کی ماں چھاتی پیٹ پیٹ کر دھاڑیں — "ہائے میرے پوت کو مار ڈالا۔ ہائے میرا بن باپ کا بچہ!"

"کلوے کا بچہ۔ خیرات کے ٹکڑوں پہ پلنے والا اور اس کے بھرپھن۔ موری کا کیڑا اور دماغ آسمان پہ،" چچی بی کا پٹھانی خون کھول کر لاوا بن گیا۔ "حرامزادے کو ردیتیاں لگی ہیں۔"

"ہے ہے، دلہن، سید بچہ ہے۔" اماں جی نے سر پیٹ لیا۔ "اس کی بساط ہی کیا۔ تم کا ہے کو اپنی عاقبت سنوارو۔"

"چولہے میں پڑے سید بچہ اور بھاڑ میں جائے سیدانی۔ میری بچی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو دیدے نکال لوں گی۔" اماں جی روکتی رہیں پر چچی بی بپھر چکی تھیں۔ کلو کی ماں نے ادپہ سے دو دھموکے کلو کی پیٹھ پر اور جمائے اور اس کی سات پشتوں کو کوسنے لگیں۔

"اے تجھے ڈھائی گھڑی کی آوے۔ باوا کو کھا گیا۔ اب جنم جلی کے سر چھپانے کی جگہ تھی۔ سو بھی ملیا میٹ کر کے دم لے گا۔ خدائی خوار، نامراد۔" وہ اسے گھسیٹتی ہوئی باورچی خانے میں لے گئیں۔

کلو کی ماں ویسے ہماری دور کی خالہ تھیں۔ پڑوسنوں کو خالہ کہہ لینے پر انہیں خالہ کہتے عار سی آتی۔ امتیازی تو نہ کہتے پر کلو کی ماں ضرور کہتے۔ گھٹتے گھٹتے ان کی پوزیشن نوکروں جیسی ہو گئی تھی۔ وہ جہاں بھی جاتیں، دو چار دن کی مہمان داری کے بعد لوگ دھیرے دھیرے انہیں ڈھب پہ لے آتے۔ ماما کھسکا دی جاتی اور وہ بغیر تنخواہ کے صرف پھٹے پرانے کپڑے اور روٹی پہ ماما کا عہدہ سنبھال لیتیں۔ میاں لام پر گئے۔ سو نہ جانے کس کی گولی کھا کر ڈھیر ہو گئے۔ امتیازی خالہ کا تو کسی لال منہ والے سے بیر بھی نہ تھا۔ پر اللہ

جانے کس اللہ کے بندے نے ان کی مانگ اُجاڑ دی۔

تنخواہ کا کوئی ذکر نہیں۔ بھلا اپنے رشتہ داروں کو تنخواہ دے کر کون ذلیل کر سکتا ہے! ہاں عید بقر عید پر "آپا سلام" اور "دولہا بھائی سلام" کے صلہ میں اچھی اماں جی سے اور روپیہ ابا جی سے ضرور مل جاتا تھا اور دوسرے نوکروں کی طرح "بیگم صاحبہ" نہیں کہنا پڑتا تھا بلکہ آپا اور دولہا بھائی کہنے کا فخر حاصل تھا۔

کلو کی ماں جو یوں تیرے میرے در پر ماتھا رگڑتی تھیں اس کی بھی ایک وجہ تھی وہ چاہتی تھیں کہ ان کا کلو لکھ پڑھ کر کسی قابل ہو جائے اور وہ راج جو وہ میاں کے دم سے نہ کر سکیں، کلو کے دم سے نصیب ہو۔ اتنے بچے پڑھتے ہیں۔ ایک کلو بھی پڑھ جائے گا۔ مگر کلو کے سپرد ہزاروں ڈیوٹیاں تھیں۔ چچی کی کمر دبانی۔ دوپہر کو پیر کے انگوٹھے میں رسی کھینچنا۔ تجھے مجھے پانی پلانا۔ ایک دم سارے گھر ہی کو پیاس لگ جاتی۔ کلو کو ایک مشک پانی کٹورہ کٹورہ کرکے ڈھونا پڑتا۔ چھبو اور چھابہ کے ساتھ کھیلنا۔ ہزار بار جھنجھنا گر لئے تو اٹھا نا چھابہ بی کی گڑیا کو ایک منٹ میں چھتیس بار ڈوپٹہ اوڑھانا مہترانی سے پوتڑے دھلوانے کے لئے پانی ڈالنا۔ اتنا وقت ہی کہاں ملتا تھا جو کلو علم و ادب کی طرف رجوع کرتا۔ ویسے مولوی صاحب مفت کا اُتو پڑھانے کے قائل بھی نہ تھے کلو کے کپڑے بھی تو اس قابل نہ رہتے تھے کہ وہ سب بچوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھ سکے۔

ہمارے ہاں باورچی تھا۔ اس لئے ماماگیری سے تو کلو کی ماں کو نجات ملی ہوئی تھی۔ مگر گیہوں پھٹکنا۔ دالیں بیننا۔ مسالے کوٹنا۔ بچوں کو نہلانا دھلانا۔ جنس تُلوانا۔ کسی کے ہاں بچہ ہو تو راتوں کو زچہ کے سرہانے جاگنا کہیں بلی حرام خور تال کی بسومد سے لگی چلی آئے اور بچہ کو چبا کے نہ رکھ دے۔

کلو چند مہینے کا گود میں ہوگا کہ شادی آ گئی۔ نہ میت اٹھی نہ جنازہ آیا نہ تربت بنی۔ بس ایک تار نے چوڑیاں ٹھنڈی کر دیں۔ کانچ کی چوڑیاں اور دو پیسے مہینے کے گلابی فیروزی رنگ سے پیچھا چھوٹ گیا۔ جوان بیوہ کس کو بھا دے۔ جہاں گیئں نکلنا پڑا۔ لڑھکتی پڑھکتی ہمارے ہاں آکر دم لیا تھا تو کلو کی عشق بازی نے پیر اکھاڑ دیئے۔ دو چار پیغام بھی آئے خود شوقین مزاج چھوٹے چچا نے ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی مگر کلو کی ماں

فکر کا تریاق

پندرہ بیس سال پہلے لڑکیاں بالیاں عصمت کی کہانیاں پڑھ کر "ہائے اللہ بے شرم" کہہ کر منہ چھپا لیتی تھیں، مگر اس بات سے کسے انکار ہے۔ عصمت کی ہر زہریلی کہانی میں فکر کا تریاق بھی چھپا ہوتا تھا جو دبے دبے سے دلوں میں اُتر کر انسان کو سچ بولنے پہ اکساتا تھا اور یہ عصمت ہی کی فکر تھی جس نے مجھ جیسے سیکڑوں ذہنوں کی پرورش اس طرح کی کہ آج ہم اپنے معاشرے کی ہر غلط روایت سے انحراف کا حوصلہ رکھتی ہیں۔

رعنا فاروقی

کے پیٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیا۔

"نہ میاں، میرا پوت جوان ہوگا تو کیا کسی کو منہ دکھائے گا کہ میاں نے خصم کر لیا۔" ویسے وہ بیچاری شادیوں کی لت سے بھی واقف تھیں۔ بیاہتا بیوی پر تلنبولن لا بٹھائی۔ بتنولن پہ بساطن اس پہ دھوبن، میراثن اور بھنگن کا نزول ہوا۔ غرض میاں نے کوئی "رن" یا "تن" نہ چھوڑی اور جب ان کی بیویوں میں جوتم پیزار بڑھتی وہ ایک نئی پھلجھڑی لا کر چھوڑ دیتے۔ ان کے حصے دالان میں یتیم خانہ کھلا ہوا تھا۔ کلو کی ماں میں دم درود بھی نہیں تھا۔ پچیس برس کی عمر میں ککھو ڈائن ہو کر رہ گئی تھیں۔ صورت پہ مکھیاں جھنکتی تھیں۔ ازلی ڈنڈا پہ برستا تھا۔ آئے دن نیم تلے کھٹیا پہ لحاف اوڑھے جوڑی بخار سے کشتی لڑا کرتیں ویسے کوئی کام کی چیز کوئی کھاہے کو بیلہ ہے۔ مفت کی تو گرانی کسے بڑی لگتی ہے۔

اسی شام انہوں نے بخار میں جھلتے ہوئے کلو کو کندھے سے لگایا اور پڑوس میں نواب ممتاز کے شاگرد پیشے میں جا پڑیں۔

نواب صاحب کا بھرا پرا گھر تھا۔ پڑھے لکھے فیشن ایبل لڑکے لڑکیاں، بہوئیں۔ کوٹھی کے شاندار احاطے میں آئے دن ڈنر پارٹیاں ہوتیں اور اسی کوٹھی کے ایک گمنام سے کونے میں نواب صاحب بڑے زندگی کی آخری سانسیں گن رہے تھے۔ دو سال سے ان کی اب تب ہو رہی تھی مگر جا تو اللہ میاں سے پٹہ لکھا کر لائے تھے۔ اچھے بھلے جوان لڑھک جائیں پر بڈھا اس سے مس نہ ہو۔ ایک تو دنیا بھر کی بیماریاں جن میں پرانی پیچش اور گٹھیا پیش پیش۔ اوپر سے بڈھے کا دماغ ساتویں آسمان پہ۔ منہ پر وہ مغلظات کہ کوئی نوکر آٹھ دن سے زیادہ نہ ٹھہرتا۔ کلو کی ماں کے بھاگوں ان کا نوکر بھاگا ہوا تھا۔ لہٰذا ساٹ روپے مہینہ اور کھانا اور سال میں دو جوڑے سوسی کے کپڑوں پر وہ نواب صاحب کی نرس کے طور پر رکھ لی گئیں ہمارے خاندان کی تو ناک کٹ گئی۔ نواب صاحب کے ہاں سے پہلے ہی لین دین بند تھا وہ اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھتے تھے۔ اب تو اور بھی تن گئی۔

نہ جانے کلو کی ماں کی تیمارداری نے رنگ دکھایا یا بڈھے نے ہاتھ دھو کر پیچھا نہ چھوڑا، بجائے مرنے کے، سانسوں کی ڈور ٹوٹنے کے اور مضبوط ہو گئی، بڈھا بدمزاجی کا ٹھیکیدار تھا۔ بیچاری سر جھکا کر ان کی گالیاں کوسنے سنا کرتی۔ کوٹھی میں قہقہے گونجا کرتے اور وہ بیٹھی بڈھے کی تھے سمیٹا کرتی۔

اور پھر بڑے میاں کی گالیوں میں کمی ہونے لگی۔ گلاس، رکابی مار پھینکنے کی عادت میں بھی کمی آگئی۔ کبھی کبھی ترنگ میں آ کر سرہانے سے اکنی نکال کر کلو کو دیتے۔ "کیوں بے، کیا لے گا؟" وہ اس سے مذاق میں پوچھتے۔

"جی، رو شنائی۔"

"روشنائی! ابے گلاس کھا گیا ہے؟ گجک لیجیو، اچھا۔"

"جی اچھا۔" کلو سہمی ہوئی آواز میں کہتا۔

ایک دن کلو کی ماں نے منہ دھلا کر سلفچی اٹھائی تو بڑے میاں بڑی نرم آواز میں بولے۔

"کلو کی اماں تم میری پھپھیوں کے برابر ہو۔ پر نامحرم سے یہ خدمت کراتے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں گناہ کر رہا ہوں۔ اب بڑھاپے میں

کھڑے بیٹھے مسالے

جیسے جدید پینٹنگ کو دیکھ کر آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ عورتیں کھڑی ہیں یا گنے کا کھیت ہے، بالکل اسی طرح محبوب کے پکائے ہوئے کھانوں کو چکھ کر آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ قورمہ ہے، قلیہ ہے یا کھڑے مسالے کا گوشت ہے۔ جہاں تک مسالوں کا تعلق ہے، وہ کھڑے بیٹھے مسالے کے سالن کی بجائے کچھ اچھلتے کودتے اور اودھم مچاتے مسالوں کے کھانے پکاتے تھے۔ سیاسی پارٹیوں کی طرح ہر مسالہ بالکل اکیلا اور اچھوتا، اپنا رنگ ڈھنگ اور نزدر دکھاتا نظر آتا۔

عصمت چغتائی ــ ''محبوب''

مرتے وقت عاقبت خراب کرنا نہیں چاہتا۔ اگر تم مناسب سمجھو تو نکاح کر لو۔''

کلو کی ماں سے سلابکی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی کوٹھڑی میں چلی گئیں اور دیر تک سیدھی پڑی رہیں پھر ایک دم جی بھر آیا۔ اور خوب بھڑاس نکالی ہائے مرنے والے، یہ تم نے کس قصور کی سزا دی۔

شام کو جب وہ بیڈپین لے کر آئیں تو بڑے میاں تکیے کے سہارے بیٹھے تھے۔ ''مجھے حاجت نہیں۔ ابھی کریم آیا تھا۔ اس نے فراغت کرا دی'' انہوں نے ذرا سوکھی آواز میں کہا۔ اور کلو کی ماں کا خون خشک ہو گیا۔ یا مولا! اب کتنی سیڑھیاں باقی رہ گئی ہیں۔ سر چکرایا اور دروازے سے ٹک گئیں۔

''سردے کی دو پھانکیں ذرا برف لگا کر لے آؤ۔'' بڑے میاں اپنی روکھی کھردری آواز میں بولے۔ آنسو جھپک کر کلو کی ماں سردے کی قاشیں لے آئیں ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف بڑے میاں کی ڈھیلی بتیسی کی چپڑ چپڑ سنائی دے رہی تھی۔

بڑے میاں کچھ نادم، کچھ جھینپے سے سر کے قتلے چکتے رہے۔ کلو کی ماں کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

اتنے میں چق کے پیچھے سے کلو کی آنکھیں چمکیں۔ ماں نے اشارے سے بھگانا چاہا۔ مگر بڑے میاں بولے۔

''آنے دو بچے کو۔'' کلو دبا دبا آیا۔ اور گھبراہٹ چھپانے کو کبھی ایک پیر پر اور کبھی دوسرے پیر پر ڈگمگاتا رہا۔

''کچھ پڑھتا دڑھتا بھی ہے یا بس ڈنڈے بجاتا ہے۔'' پاس بلا کر وہ کلو سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ کلو کی ماں جب ان کی بتیسی دھو کر لائیں تو وہ بڑے میاں کو چھ کا پہاڑا سنا رہا تھا۔ اور وہ آنکھیں بند کئے اونگھ رہے تھے۔ ماں کے اشارے پر کلو باہر جانے لگا تو بڑے میاں غرائے۔

''ہم سو نہیں رہے ہیں کلیم الدین۔''

کلیم الدین ــــ بڑے بڑے آنسو کلو کی ماں کی آنکھوں میں بھر آئے کلیجہ سن ہو گیا۔ بس کلو کا باپ یوں کلیم الدین لکھا کرتا تھا۔

''کلیم الدین کو پیار۔''

اُس کے آخری خط میں بھی تھا۔ پر اب تو وہ دنیا میں کلو ہی بن کر رہ گیا تھا۔ اور وہ اس گمنام

سے کلّو کی ماں! — منہ پھیر کر جب وہ خالی رکابی اُٹھانے لگیں تو پھر گرجے

"ہم یہاں اُس رہے ہیں۔ دیکھیں باجی کو کچھ یاد بھی ہے یا نہیں ہاں بھئی تو چھ ستے؟"

"بیالیس"، کلو نے سہمی ہوئی آواز میں کہا اور کلّو کی ماں کا دل پگھل کر آنکھوں کے راستے بہنے لگا۔

بڑے میاں نے پھر نکاح کی بات نہیں چھیڑی۔ مگر کلو سے ان کی دوستی یارانے کی حد کو پہنچ گئی۔ آہستہ آہستہ وہ ان کے بستر پر بیٹھنے لگا۔ دونوں دوبیتا کھیلتے تو بڑے میاں خوب بے ایمانی کرتے اور کلّو ان سے جھگڑتا ان کے بستر پر بیٹھنے کے لئے کلو کو کپڑے بھی صاف پہنانے پڑتے ویسے اب اسے کام کاج نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے اتنا میلا بھی نہ ہوتا تھا۔ ایک دن تاش کھیلتے کھیلتے ایک دم بولے۔ "چودہ پنجے۔"

"اکیاسی"

"ایں!"، بڑے میاں غرّائے۔ "کیا کہا؟ اکیاسی!۔ کریم خان، اس اُلو کے پٹھے مولوی کی داڑھی پکڑ کر ہمارے سامنے حاضر کرو۔"

جب مولوی صاحب آئے تو بڑے میاں بلبلائے "سُنیئے مولوی صاحب! ہاں بھئی کلیم الدین چودہ پنجے؟"

"اکیاسی"، کلو نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "سُنا آپ نے مولوی صاحب؟ چودہ پنجے اکیاسی! بچے کو آپ اپنا سر پڑھاتے ہیں؟"

بڑے میاں نے مولوی صاحب کی گھنٹہ بھر ٹانگ کھینچی۔ پھر کلو کی ماں کی چار گھنٹے جان سولی پر کردی اور اس دن سے مولوی صاحب برآمدے میں بیٹھ کر کلو کو سبق دینے لگے۔ سنک سوار ہو جاتی تو بڑے میاں، مولوی صاحب اور کلو دونوں کا دھوبی گھاٹ کر دیتے۔

صاف ستھرے پوتوں نواسوں کو کہاں اتنی فرصت تھی جو اپنی نرسری اور کنڈر گارٹن سے پرائے بیچش میں سڑتے ہوئے دادا میاں کے پاس آتے۔ کئی کئی دن گزر جاتے۔ کوئی پلٹ کر نہ پوچھتا۔ لوگ منتظر تھے، کب بڑے میاں مریں اور ان کا دھوم دھام سے چالیسواں ہو۔ بیار کا بھوکا کلو بڑے میاں کی سنسان بوڑھی زندگی میں تروتازہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔ دو پیاس کے ترسے ہوئے ایک چھوڑ ہزار جان سے ایک دوسرے پر عاشق ہوگئے۔ گھنٹوں دونوں میں ایسے گھل مل کر باتیں ہوتیں، جیسے وہ ہم سن ہوں

"ابے کلیم، فاختہ نے دانہ کھایا؟"

"نہیں ابا جی، چاول دلیے کے دلیے پڑے ہیں۔"

"اماں، گاودی ہونہہ۔ فاختہ چاول پر منہ نہیں ڈالے گی۔ اسے کودوں دو"، اور دونوں سر جوڑ کر فاختہ کو کودوں کھلاتے۔ وہ ایک دانہ کھالیتی تو بڑے میاں کا چلوؤں خون بڑھ جاتا۔

اور ایک دن بڑے میاں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جب کلّو کی ماں نے انہیں لاٹھی کے سہارے دوسرے ہاتھ سے کلّو کا کندھا پکڑے صحن میں کیاریوں کے پاس دیکھا تو کلیجے میں گولی سی لگی۔

کوٹھی میں بم پھٹ پڑا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ رات کو دادا میاں نے کلّو کی ماں سے نکاح پڑھوالیا۔ بیس ہزار مہر نقد بنک میں اور مہر

بھابھی اور بھرماں

عام طور پر ہیروئن کی فلمی زندگی پندرہ سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں داخل ہوتی ہے، دو چار سال دھکّے کھاتی ہے، پھر موقع پاتی ہے اور ہنگامہ بن جاتی ہے۔ آٹھ دس سال تماش بینوں کے ہوش و حواس پر اُچھلتی کودتی ہے۔ ہر ایک پہ دھونس جماتی ہے۔ خوب من مانی کرتی ہے۔ یہ اُس کی بہار کے دن ہوتے ہیں۔ جب بے حد پھُول جاتی ہے تو فلم فلاپ اور پروڈیوسر ہلاک ہونے لگتے ہیں۔ ادھر اُس پر چربی چڑھتی ہے، اُدھر آمدنی سوکھنے لگتی ہے۔ ہوش آجاتا ہے تو ڈائٹنگ کر کر کے تھوڑے دن گھسٹتی ہے۔ پھر بوکھلا کر کسی ادنگے بونگے سے شادی کر بیٹھتی ہے یا ہمت والی ہوئی تو بھابھی اور بھرماں کے رول کرنے لگتی ہے

عصمت چغتائی — ”ریشمی گنگا“

والی کوٹھی جس کا ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ کرایہ آتا تھا۔

”میں نہ کہتی تھی، وہ ایک حرافہ ہے“ چچی بی نے کہا۔ حالانکہ یہ پیش گوئی انہوں نے اسی دم گھڑی تھی۔

ہفتوں کلو کی ماں اور دادا میاں کے چرچے محلے والے نمک مرچ لگا کر کرتے رہے۔ ایک شاعر قسم کے نوجوان نے تو ان پہ نظم تک کہہ ڈالی۔ خاندان والوں کی لے دے سے تنگ آکر بڑے میاں نے اپنی طرف کے دروازے میں اینٹیں چنوا دیں۔ سب کی محبت پھڑ پھڑا کے جاگ اٹھی۔ اور لا وارث بڈھا سب کا چہیتا بن گیا۔ مگر جلدی بڈھے کے منہ لگنا مناسب نہ سمجھا کہ کہیں کلو کی ماں کے جادو میں آکر رہی سہی جائداد نہ دے ڈالے۔ اور معنت کے عیش میں چنگاری پڑ جائے۔

نکاح کی رات جب رفع حاجت کے بعد بتیسی دھو کر گلاس میں ڈال کر سرہانے رکھنے گئیں تو وہ اور کلو دو معصوم بچوں کی طرح گلے میں بانہیں ڈالے بے خبر سو رہے تھے۔ مچھر دانی درست کر کے کلو کی ماں برآمدے میں اپنی مخصوص پلنگڑی پر لیٹیں تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ ایک چھتار برگد کی چھاؤں میں لیٹی ہیں۔ بے اختیار کانوں میں اپنی بارات کے تاشے تڑاتڑ تڑانے لگے۔ انار پھلجھڑیاں چھوٹ کر دماغ میں جگنوؤں کی طرح پھیل گئیں۔ وہ مانجھ، چوتھی، بری ایک ایک کر کے ذہن کی پگڈنڈی پر گزرنے لگیں۔ عمر ہی کیا تھی۔ رحیم بھی تو کم سن ہی تھا۔ مہندی سے لال ہاتھ کئی دن یار دوستوں سے چھپاتے پھرا تھا اور پھر گھر کی اندھیری کوٹھڑیوں اور سنسان چھتوں پہ وہ جوان ہوئے۔ پھر کلو نے ان کو ان کھڑوں کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ مگر بنتے ہی دنیا اجڑ گئی۔

کلو کی ماں کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ مرنے والے کی جوان چوڑی چکلی چھاتی سانس روکنے لگی۔ تھکے ہارے مسافر کی طرح کلو کی ماں نے اس غیر مرئی چھاتی پہ ماتھا ٹکا دیا۔ جو سنگ مرمر کی طرح سرد اور بے جان تھی۔ ایک انجانی گولی اس چھاتی کو چیرتی ہوئی۔ معصوم کلو اور بد نصیب ماں کے وجود کو پاش پاش کر گئی۔

*

چھوٹی موٹی

ریل کے ایک ڈبے میں دو مسافروں کا اپنی اپنی منزل پر پہنچنے کا الگ الگ انداز

آرام گرسی ریل کے ڈبے سے لگا دی گئی اور بھائی جان نے قدم اُٹھایا "آلہی خیر!۔۔۔ یا غلام دستگیر۔۔۔ بارہ اماموں کا صدقہ۔ بسم اللہ بسم اللہ۔۔۔۔۔ بیٹی جان سنبھل کے۔۔۔ قدم تھام کے۔۔۔ پایا بچہ اُٹھا کے۔۔۔ سچ سچ، بی مغلانی نقیب کی طرح للکاریں یکہ میں نے گھسیٹا کچھ بھائی صاحب نے ٹھیلا۔ تعویذوں اور امام ضامنوں کا اشتہار بنی بھابی جان تنتے ہوئے غبارے کی طرح ہانپتی سیٹ پر لڑھک بیٹھیں۔

"پاک پروردگار تیرا شکر"، بی مغلانی کے منہ سے اور ہمارے دلوں سے نکلا بغیر ہاتھ پیر ہلائے ہانپ جانے کی عادت شاید وہ ساتھ لے کر تو پیدا نہ ہوئی ہوں گی اور نہ اناؤں، دایاؤں کی لاڈ بھری گودوں میں ان کا اچار پڑا۔ پھر بھی اوسط درجے کی خوبصورت دُبلی پتلی لڑکی چند ہی سال میں پھپھولے کی طرح نازک بن گئی۔ بات یہ ہوئی کہ سیدھی ماں کے کولہے سے توڑ بھائی جان کے پلنگ کی زینت بنا دی گئیں اور وہاں ایک شگفتہ پھول کی طرح پڑے مہکنے کے سوا ان پر زندگی کا اور کوئی بار نہ پڑا۔ بی مغلانی شادی کے دن سے انہیں پلنے پوسنے پر مقرر کر دی گئیں۔ صبح سویرے یعنی جب بڑے لوگوں کی صبح ہوتی ہے۔ چلمچی میں منہ دُھلا کر وہیں مسہری پہ جوڑا بدل کر چوٹی کنگھی سولہ سنگار کر کے بھرپور دلی کے ناشتے کا خوان سامنے چن لیا جاتا جسے صاف کر کے میری پھولے پھولے کلّوں والی بھابی ہتھیلی پہ ٹھوڑی رکھے بیٹھی مسکرایا کرتیں۔

لیکن یہ مسکراہٹیں شادی کے دوسرے ہی سال پھیکی پڑ گئیں اور ان کا سلسلہ ہر وقت ٹھونگنے اور رستے کرنے میں گزرنے لگا۔ جھکتے ہوئے پھولوں میں لدی مرباروہ کے بجائے اس روگ میں مبتلا بیوی کو پا کر بھائی جان بھی بدکنے لگے۔ مگر اماں بیگم اور بی مغلانی کے یہاں تو جانو بہار آ گئی۔ پہلے ہی مہینے سے گدیلے پوتڑے اس زور و شور سے سلنے لگے جانو کل ہی پرسوں میں زچگی ہونے والی ہے۔ مارے تعویذوں کے جسم پر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی، آئے دن کے ٹونے ٹوٹکے دم لوٹنے لگے۔ ویسے ہی بھابی جان کے دشمن کاہے کو چلنے پھرنے کے شوقین تھے۔ اب تو بس کروٹ بھی لیں تو مغلانی بی اللہ بسم اللہ کے جُدّی

کا دل سے گھر سر پہ اٹھا لیتیں اور بس دن بھر وہ بچے گھروے کی طرح سینت کر رکھی جاتیں۔ صبح شام پیر فقیر دم درود کرتے اور پھونکیں مارنے آتے۔

لیکن باوجود کہ مغلانی کا پہرہ سخت تھا، کچا گھڑا وقت سے پہلے ہی کھل گیا اور ارمانوں پر پانی پھر گیا۔ ڈال پھر خالی رہ گئی۔ بُور جھڑ گیا۔ پر جان بچی لاکھوں پائے اللہ اور دے گا۔ گھر کی دولت ہے۔ اللہ نے اور دیا۔ پہرہ پہلے سے چوگنا ہو گیا۔ مگر پھر ہاتھ خالی۔ تیسری دفعہ تو معاملہ ذرا قابلِ غور بن گیا۔ مارے دواؤں کے بھابی جان کا پلیتھن نکل گیا۔ رنگ ایک سرے سے غائب۔ صرف پھولی پھولی اُبلی ہوئی شکر قند جیسی رہ گئیں۔

بھائی جان کی شام رات کے بارہ بجے ہوتے گی۔ بی مغلانی اور اماں بیگم کے تیور بھی ذرا چڑھنے اترنے لگے اور بھابی جان کو مسہری پر پڑے پڑے بھائی جان کی دوسری شادی کے شادیانے سنائی دینے لگے۔

اور جب اللہ اللہ کر کے پھر وہ دن آیا تو پیروں مریدوں کے علاوہ دہلی کے ڈاکٹر بھی اپنے سارے تیر تفنگ لے کر تعینات ہو گئے۔ خدا کے کرم سے اگلا مہینہ لگا اور بھابی جان صابن کے بلبلے کی طرح روئی کے پھولوں پر رکھی جانے لگیں۔ کسی کو قریب کھڑے ہو کر چھینکنے یا ناک سنکنے کی بھی اجازت نہ تھی مبادا ردِ عمل سے بلبلہ شق نہ ہو جائے۔

اب ڈاکٹروں نے کہا خطرہ نکل گیا تو اماں بیگم نے بھی سوچا کہ زچگی علیگڑھ ہی میں ہو۔ ذرا سا تو سفر ہے گو بھابی جان دلی چھوڑتے لرزتی تھیں۔ جہاں کے ڈاکٹروں نے ان کا اتنا سفر صحیح و سالم کٹوا دیا تھا۔ اب آنکھوں کی سوئیاں ہی تو رہ گئی تھیں۔ دوسرے وہ زمانے کے تیور دیکھ رہی تھیں، اگر اب کے وار

باپ کی باپتا

مان کی مامتا کا ساری دنیا ڈھول پیٹتی ہے، باپ کی باپتا کا رونا کوئی نہیں روتا۔ عورت کی عزت لٹ سکتی ہے، مرد کی نہیں لٹتی۔ شاید مرد کی عزت ہی نہیں ہوتی جو لوٹی کھسوٹی جا سکے۔ عورت کے حرامی حلالی بچہ ہوتا ہے، مرد کے کچھ نہیں ہوتا۔

عصمت چغتائی

خالی گیا تو بھائی جان کو ان کے سینے پہ سوت لا بٹھانے کا کوئی بہانہ بھی اٹھے نہ رہے گا۔ اب تو وہ نام چلانے والے کی آڑ لے کر سب کچھ کر سکتے تھے۔ خبر نہیں بیچارے کو اتنا اپنا نام زندہ رکھنے اور اُسے چلانے کی کیوں فکر پڑی تھی حالانکہ خود ان کا کوئی اونچا نام تھا ہی نہیں۔ دنیا میں۔ مسہری کی زینت کا جو ایک اہم فرض ہے، اگر وہ بھی نہ پورا کر سکیں تو یقیناً انہیں سکھ کی سیج چھوڑنا پڑے گی۔ یہ چند سال نوجوانی اور حسن کے بل بوتے پر وہ ڈٹی رہیں، پر اب تو ذرا تخت کے پائے ڈگمگاتے جا رہے تھے اور وہ انہیں الٹ دینے کو تیار تھا اور پھر اس تخت سے اُتر کر بیچاری کے پاس دوسری جگہ کہاں تھی۔ سینا پرونا تو انہوں نے سیکھا اور نہ اس میں جی لگے دو بول پڑھے تھے، سو وہ بھی بھول بھال گئی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا میں اگر ان کا کوئی کھلانے پلانے والا نہ رہے تو وہ صرف ایک کام اختیار کر سکتی ہیں۔ یعنی وہی خدمت جو وہ بھائی جان کی کرتی تھیں خلقِ خدا کی کریں۔

لہٰذا وہ جی جان سے اس بار ایک ایسا ہتھیار

شوہر کی خاطر

میں نے اونچی ایڑی کی سینڈلیں اس لیے پہننا چھوڑ دیں کہ میرے اور شاہد لطیف کے قدوں کا باہمی فرق کم ہو جائے اور وہ بڑے معلوم ہونے لگیں۔ میں نے لکھنا کم کر دیا تاکہ میری شہرت سے وہ احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں۔ میں نے اچھے لباس پہننے چھوڑ دیئے تاکہ لوگوں کی نظریں مجھ پر کم پڑیں۔

عصمت چغتائی

مہیا کرنے پر تلی ہوئی تھیں جس کے سہارے ان کے کھانے پینے کا انتظام تو ہو جاتا۔ باپ نہ سہی دادا دادی تو پا لیں گے ہی۔

زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ اماں بیگم کا نادر شاہی حکم آیا اور ہم لوگ یوں لدے پھندے علی گڑھ چل پڑے۔ نئے تعویذوں اور ٹوٹکوں سے لیس ہو کر بھابی جان میں بھی اتنی ہمت ہو گئی۔

"الٰہی خیر" بی مغلانی انجن کی ٹکر سے بے خبری میں دھڑام سے گریں اور بھابی جان نے لیٹے لیٹے دونوں ہاتھوں سے گھڑا دبوچ لیا۔

"ہے ہے یہ گاڑی ہے کہ بلا۔ چلا الٰہی پیروں کا صدقہ..... اے مشکل کشا" بی مغلانی بھابی جان کا پیٹ تھام کر بُدبُد کرکے درود اور کلام پاک کی آیتیں پڑھنے لگیں۔ خدا خدا کرکے غازی آباد آگیا۔ طوفان میل کا نام بھی خوب ہے۔ دندناتی چلی جاتی ہے۔ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ڈبہ لیدا اپنے لئے ریزرو تھا۔ بھیڑ بھاڑ کا خدشہ ہی نہ تھا۔ میں

کھڑکی کے سامنے والی گاڑی میں بھری ہوئی مخلوق کے مطالعے میں محو اور بی مغلانی انجن کی سیٹی کے خوف سے کان بند کیے بیٹھی تھیں۔ بھابی جان کو تو دور ہی سے بھیڑ کو دیکھ کر چکر آگیا اور وہ وہیں پٹڑی پر پسر گئیں۔ جوں ہی ریل رینگی ڈبّہ کا دروازہ کھلا اور ایک گنواری گھسنے لگی۔ قلی نے بہتیرا گھسیٹا، مگر وہ چلتی ریل کے پائیدان پر ڈھیٹ چھپکلی کی طرح لٹک گئی اور بی مغلانی کی "ہیں ہیں" کی پرواہ نہ کرکے اندر رینگ آئی اور

غسل خانے کے دروازے سے پیٹھ لگا کر ہانپنے لگی۔

"اے ہے موئی توبہ ہے" بی مغلانی منمنائیں۔ "ئے نگوڑی کیا پورے دن سے ہے۔"

ہانپتی ہوئی بیدم عورت نے اپنے پپڑیاں جمے ہونٹوں کو بمشکل مسکراہٹ میں پھیلایا اور اثبات میں سر ہلایا۔

"اے خدا کی سنوار دیدہ تو دیکھو سردار کا... توبہ ہے اللہ توبہ" اور وہ باری باری اپنے گالوں پر تھپڑ مارنے لگیں۔

عورت نے کچھ جواب نہ دیا صرف درد کی شدت سے تڑپ کر غسل خانے کا دروازہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ سانس اوپر تلے بے ترتیب ہو گیا اور پیشانی پر پسینے کے قطرے ٹھنڈی مٹی پر اوس کی بوندوں کی طرح پھوٹ آئے۔

"اری کیا پہلوٹھی کا ہے؟" بی مغلانی نے اس کے انداز سے خوفزدہ ہو کر کہا اور اس بار کرب کا ایسا حملہ پڑا کہ وہ جواب ہی نہ دے سکی۔ اس کے چہرے کی ساری رگیں کھنچنے لگیں، لمبے لمبے آنسو اس کی ابلی ہوئی آنکھوں سے پھوٹ نکلے۔ بی مغلانی ہے ہے، اوئی، ہائے، کرتی رہیں اور وہ درد کی لہر کو گھونٹتی رہی۔

بیٹی بسور رہی تھی اور بھابی جان سسکیاں لے رہی تھیں۔

"اے ہے بی گنواری کیا مزے سے بیٹھی دیکھ رہی ہو۔ اے بیٹی اُدھر منہ کرکے بیٹھو" اور گنواری نے جلدی سے منہ اُدھر کر لیا۔ پھر جوں ہی درد کی لہر سے تڑپ کر اس نے آواز نکالی، گردن قابو میں نہ رہ سکی، اور بی مغلانی نے صلواتیں سنانی شروع کیں۔ "اوئی تو بہ جیسے ایک بچے کو دنیا میں داخل ہوتے دیکھ کر میرا کنوارپن منسوخ ہی تو جائے گا۔" بھابی جان دوپٹہ منہ پہ لپیٹے بسور رہی تھیں۔ بی مغلانی ناک پر برقعہ رکھے خی خی تھوک رہی تھیں اور ریل کے فرش کی جان کو رو رہی تھی۔

ایک دم ایسا معلوم ہوا ساری دنیا سکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ فضا گھٹ کر ٹیڑھی میڑھی ہو گئی۔ شدت احساس سے میری کنپٹیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح اکڑ گئیں اور بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ میں نے سوچا عورت اب مری اور اب مری کہ ایک دم سے فضا کا تشنج رک گیا۔ بی مغلانی کی ناک کا برقعہ پھسل پڑا اور بالکل بھابی جان کی سلیم شاہی جوتیوں کے پاس لال لال گوشت کی بوٹی آن پڑی۔ حیرت اور مسرت کی ملی جلی چیخ میرے منہ سے نکلی اور جھک کر اس ننھی سی کائنات کو دیکھنے لگی جس نے اپنا لمبا چوڑا دہانہ کھول کر ہائے توبہ ڈال دی۔

بی مغلانی نے میری چوٹی پکڑ کر مجھے کونے میں ٹھونس دیا اور اس عورت پر گالیوں اور ملامتوں کا طومار لے کر ٹوٹ پڑیں۔ میں نے سیٹ کے کونے سے آنسوؤں کی چلمن سے جھانک کر دیکھا تو وہ عورت مری نہ تھی۔ بلکہ اس کے سوکھے ہوئے ہونٹ جنہیں اس نے چبا ڈالا تھا۔ آہستہ آہستہ مسکراہٹ میں پھیل رہے تھے۔ اس نے ننھے سے سائل کی دادیلا سے بے چین ہو کر آنکھیں کھول دیں۔ اٹھی ہو کر اس نے اسے اٹھا لیا۔ کچھ دیر وہ اپنے ناتجربہ کار ہاتھوں سے اسے صاف کرتی رہی۔ پھر اس نے اوڑھنی سے دھجی پھاڑ کر نال کو کس کر باندھ دیا۔ اس کے بعد وہ بے کسی سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی سب مجھے اپنی طرف مخاطب دیکھ کر وہ ایک دم کھل کھلا کر ہنس پڑی "کوئی چھری چکو ہے جی بی جی؟"

بی مغلانی گالیاں دیتی رہ گئیں۔ بھابی جان نے بسور کر میرا آنچل کھینچا پر میں نے ناخون کاٹنے کی قینچی اسے پکڑا دی۔

اس کا سن میرے ہی اتنا ہو گا یا شاید سال چھ مہینے بڑی ہو۔ وہ اپنے اللہڑ، ناتجربہ کار ہاتھوں سے ایک بچہ کا نال کاٹ رہی تھی جو اس نے چند منٹ پیشتر جنا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے وہ بھیڑ بکریاں یاد آنے لگیں جو بغیر دائی اور لیڈی ڈاکٹر کی مدد کے گھاس

یکساں ترجمان

عصمت کی ایک اور حیرت انگیز خصوصیت یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں طبقوں کی یکساں ترجمان ہیں۔ اس کے لئے دیہاتی حبشن بیرا کا کردار بھی کتابِ زندگی کا ایک ویسا ہی کھلا ہوا ورق ہے جیسا فیشن ایبل رقیعہ کا کیرکٹر۔ اس نے محل اور جھونپڑی دونوں کے تاریک گوشوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا ہے اور اس کا بیان بھی موضوع کے اعتبار سے گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتا ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد

چرتے چرتے پیڑ تلے زچہ خانہ رمالیتی ہیں اور نوزائیدہ کو چاٹ چاٹ کر قصہ ختم کرتی ہیں۔

بزرگ لوگ کنواری لڑکیوں کو بچہ کی پیدائش دیکھنے سے منع کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ زیب النساء نے اپنی بہن کے ہاں بچہ پیدا ہوتے دیکھ لیا تھا تو وہ ایسی ہیبت زدہ ہوئی کہ ساری عمر شادی ہی نہ کی۔ شاید زیب النساء کی بہن میری بھابی جان جیسی ہوگی، ورنہ اگر وہ اس فیرنی سے بچہ پیدا ہوتے دیکھ لیتی تو میری ہی ہم خیال ہو جاتی کہ سب ڈھونگ رچاتے ہیں۔ بچہ پیدا کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا بھابی جان کے لئے ریل پہ سوار ہونا یا اترنا۔

اور مجھے تو ایسی بھیانک قسم کی شرم کی بات بھی نہ معلوم ہوئی۔ اس سے کہیں زیادہ بیہودہ باتیں بی مغلانی اور اماں ہر وقت مختلف عورتوں کے بارے میں کیا کرتی تھیں جو میرے کچے کانوں میں جا کر بھٹکے چنوں کی طرح پھوٹا کرتی تھیں۔ تھوڑی دیر تو وہ پھوہڑ پن سے بچے کو دودھ پلانے کی کوشش کرتی رہی۔ آنسو خشک ہو چکے تھے اور وہ کبھی کبھی ہنس رہی تھی جیسے اُسے کوئی گدگدا رہا ہو۔ پھر بی مغلانی کے ڈانٹنے پر وہ سہم گئی اور بچے کو چیتھڑوں میں لپیٹ کر الگ سیٹ کے نیچے رکھ دیا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بھابی جان کی چیخ نکل گئی۔

اتنے میں بی مغلانی بھابی جان کو تلوے سہلاتی رہیں۔ اس نے باتھ روم سے پانی لا کر ڈبہ کو صاف کرنا شروع کیا۔ بھابی جان کی زرکار سلیم شاہی دھو پونچھ کر کونے سے لگا کر کھڑی کر دی۔ پھر اس نے پانی اور چیتھڑوں کی مدد سے ڈبے سے جملہ زچگی کے نشانات دور کر ڈالے۔ اتنے میں ہم تینوں مقدس بی بیاں سیٹوں پر لدی احمقوں کی طرح اسے دیکھتی رہیں۔ اس کے بعد وہ بچہ کو چھاتی سے لگا کر باتھ روم کے دروازے کے سہارے ہو بیٹھی جیسے کوئی گھر کا معمولی کام کاج کر کے جی بہلاتے فرصت سے بیٹھ جائے اور چنے چباتے چباتے اونگھ گئی۔ پھر گاڑی کے دھچکے سے وہ چونک پڑی۔ گاڑی رکتے رکتے اس نے ڈبے کا دروازہ کھولا اور پیر تولتی اتر گئی۔

ٹکٹ چیکر نے پوچھا "کیوں ری ٹکٹ؟" اور اس نے مسرت سے بے تاب ہو کر جھولی پھیلا دی جیسے وہ کہیں سے جھڑبیری کے بیر چرا کر لائی ہو۔ ٹکٹ چیکر منہ پھاڑے کھڑا رہ گیا۔ اور وہ ہنستی پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی بھیڑ میں گم ہو گئی۔

"خدا کی سنوار ان خانگیوں کی صورت پر۔
یہ حرامی حلالی جنتی پھرتی ہیں موئی جادوگرنیاں۔"

بی مغلانی بڑبڑائیں۔ ریل نے ٹھوکر لی اور چل پڑی۔ بھابی جان کی سسکیاں ایک منحنی چیخ میں اُبھر آئیں "ہے ہے مولا خیر تو ہے بیگم دلہن!" بی مغلانی ان کا متغیر چہرہ دیکھ کر لرزیں۔

اور وہاں خیر غائب تھی!

اور بھابی جان کے ہونق چہرے پر بھائی جان کی دوسری شادی کے تاشے باجے خزاں برسانے لگے۔

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

نئی روح دنیا میں قدم رکھتے جھجک گئی اور منہ بسور کر لوٹ گئی۔ میری پھنے خاں رانی نے جو طلسم ہوش ربا قسم کی زچگی دیکھی تو مارے ہیبت کے حل گر گیا۔

بھول بھلیاں

شہد سے میٹھی، زہر سے کڑوی کہانی، یہ واقعات ہر کسی کے ساتھ پیش نہیں آتے

"لفٹ رائٹ۔ لفٹ رائٹ۔ کوئیک مارچ" اڑاڑادھم!! فوج کی فوج کرسیوں اور میزوں کی خندق اور کھائیوں میں دب گئی اور غل پڑا۔

"کیا اندھیر ہے۔ ساری کرسیوں کا چورا کیے دیتے ہیں۔ بیٹی رفیعہ ذرا مار یو تو ان مارے پیٹوں کو۔ بچی ننھی کو دودھ پلا رہی تھیں۔

میرا ہنسی کے مارے برا حال ہو گیا۔ بمشکل مجرموں کو کھینچ کھانچ نکالا۔ فوج کا کپتان تو بالکل چوہے کی طرح ایک آرام کرسی اور دو سٹولوں کے بیچ میں پچا پڑا تھا۔

"آں..... آں ستو بھیا نے کہا تھا فوج فوج کھیلو۔" رشید اپنی کاغذ کی ٹوپی سیدھی کرنے لگے اور منو اپنے چھلے ہوئے گھٹنے کو ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے گھور گھور کر سسک رہے تھے۔ اچھن چچا جان کے کوٹ میں سے باہر نکلنے کے لیے پھڑ پھڑا رہے تھے اور ان کا مفلر بری طرح پھانسی لگا رہا تھا۔ مگر کپتان صاحب ویسے ہی ڈٹے کھڑے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا تھا؟" میں نے کپتان صاحب کی سیاہی سے بنی ہوئی مونچھوں کو دیکھ کر کہا۔

"صلاح الدین اعظم رچرڈ شیر دل پر چڑھائی کر رہا تھا، منو کو ہنسی آ گئی اور وہ لیٹ گیا پھر کالی کرسی کھسک گئی اور بس یہ کپتان صاحب نہایت احتیاط سے مونچھیں نہ چھپکتے ہوئے بولے"۔

"اچھا۔ اور یہ اچھن؟"

"یہی تو رچرڈ ہیں، اور کیا شیر دل، یہ مفلر دیکھو ان کا، یہ شیر دل کے بال ہیں۔"

"اور جناب؟" میں نے چار فٹ کے کپتان کو نظروں سے ناپا۔

"ہم صلاح الدین اعظم،" وہ اکڑتے ہوئے چلے

"اور بھئی یہ میرا کوٹ تو اتارو، سیاہی لگ گئی تو خدا کی قسم مٹر کروں گی۔

"او ہو آپ کا کوٹ۔ بات یہ ہے کہ اس کے بالوں وار کا لر کو...... تو بیچئے نا اپنا کوٹ۔"

"رقو باجی ذرا یہ سوال بتا دیجیے۔" ستو اپنی سلیٹ میری ناک کے پاس لا کر بولے۔

"نا بھئی میں اس وقت سی رہی ہوں ذرا۔"

"پھر ہم آپ کو سینے بھی نہیں دیتے۔" صلّو نے میرے پیروں میں گدگدیاں کرنا شروع کیں۔

میں نے پیر سمیٹ لئے تو وہ میری کمر میں سر اڑا کر لیٹ گیا اور بکنا شروع کیا "پھٹ جائے اللہ کرے جھر جھر ہو جائے یہ کرتا۔ سوال تو بتاتی نہیں لیکے کفن سے جا رہی ہیں اپنا۔"

"چل یہاں سے پاجی ورنہ سوئی آتار دوں گی۔" اور وہ وہاں سے ہٹ کر میری البم الٹ پلٹ کرنے لگا۔

"یہ کون ہیں چڑیل جیسی..... کالی مائی..... اور یہ..... یہ....."

"صلّو بھیا اِدھر دے میری چیزیں۔" میں نے سوچا جن ہے یہ تو

"تو پھر سوال بتاؤ۔" اور وہ میرے پاس گھس کر بیٹھ گیا

"ارے ذرا ہٹ کر۔ گرمی کے مارے ویسے ہی اُبلے جا رہے ہیں۔"

"تو میں کیا کروں۔" اور وہ مجھ سے اور لپٹا۔

"میری باجی کیسی ——— ہاں گڑیا ذرا بتا دو پھر سوال۔" مجبوراً میں نے سوال کرنا شروع کیا۔

"اب یہ سوال سمجھا رہا ہے یا میرے بُندوں کا معائنہ ہو رہا ہے۔" اور وہ جلدی سے سلیٹ پر جھک گیا۔ میں بتا رہی تھی اور وہ بیوقوفوں کی طرح میرا منہ دیکھ رہا تھا۔

"اونہہ" میں چڑ گئی۔ "پڑھ رہے ہو یا منہ تکنے آئے ہو۔ صلّو دق نہ کرو۔ ورنہ چچی جان سے کہہ دوں گی۔"

"آپ کی تصویر بنا رہا ہوں۔ یہ دیکھئے آپ کے ہونٹھ بولنے میں ایسے ہلتے ہیں جیسے..... جیسے پتہ نہیں کیا۔ بس ہلتے ہیں۔" شرارت سے آنکھیں مسکائیں۔

"بھاگ یہاں سے اُلّو۔" میں نے سلیٹ دور پھینک دی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا الگ بیٹھ گیا اور میں اُٹھکر برآمدے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد دیکھتی ہوں کہ چلے آ رہے ہیں اپنا بستر بوریا سنبھالے۔ یا اللہ خیر۔!

"کیوں، تم پھر آ گئے یہاں۔"

"اور کیا۔ وہاں دل جو گھبراتا تھا۔" اور وہ پھر میرے پاس بیٹھنے لگا۔

"صلّو اگر تم مانو گے نہیں تو....."

"تو..... تو..... ای....." اُس نے منہ چڑایا۔ "ہم تمہارے پاس بیٹھتے ہیں تو اچھا پڑھا جاتا ہے۔"

"اچھا تو چپکے بیٹھو۔"

صلاح الدین میرے چچا کا اکلوتا سپوت تھا بلکہ آنکھ کا بھی تو ایک تارا تھا۔ اتنی لڑکیاں پیدا ہوئیں کہ چچا۔ چچی بولا گئے اور پھر آپ تشریف لائے جناب کی انگلی دیکھے تو بکرے صدقے کئے جانے لگیں منتیں مانی جائیں، گھر میں کوئی زور سے نہ بولے۔ جوتے اتار

کر چلو' برتن نہ کھڑکے۔ لاڈلے کی آنکھ کھل جائے گی۔ گھر میں اسی لیے کوئی کتّا نہ پلتا۔ مرغیاں نہ رکھی جاتیں کہ ننھے میاں کی کبھی نیند نہ خراب کر دیں اور ہم بیچارے نہ لاڈ جانیں نہ لاڈ کریں۔ پھر بھی ماں بہنوں کا لاڈ اُسے کڑوا لگنے لگتا تھا اور وہ سارے وقت مجھی سے الجھتا۔ لوگوں کے "تان واٹلنسی" سے وہ تنگ آ گیا تھا۔ یہی بات تھی کہ وہ جان جان کر مجھے چھیڑتا کیونکہ میں اُسے بُری طرح ڈانٹ دیتی اور کبھی کبھی چپت بھی رسید کر دیتی۔

لاڈلے پوت دُبلے اور سوکھے تو ہوتے ہی ہیں اور اوپر سے پتلی بانس جیسا قد و قامت تو نظر بھر کے نہ دیکھتیں' انھیں ڈر تھا کہ کہیں اونٹ صاحب کو نظر نہ لگ جائے اور یہاں یہ کہ جہاں لمبی لمبی ٹانگیں جھٹکتے آئے اور چھیڑے گئے۔ یہ عادت سی ہو گئی تھی' کہ کالج سے آئے اور امّاں کو بلائیں دے کر اور دادا کو نبض دکھا کر سیدھے میری جان پر نزول' کیا مجال جو گھڑی بھر نچلا بیٹھے یا بیٹھنے دے۔ بہنوں کو چھیڑا' کسی کے گدگدی کی' کسی کے گلے میں جھول گئے۔ کسی کے کندھے میں کاٹ لیا۔ میرے پاس آئے اور میں نے تھپڑ دیا۔

گھنٹوں ماں بہنیں بیٹھ کر ارمان بھرے ذکر کیا کرتیں۔ ہر دلچسپ اور پُرمسرت بات صلّو میاں کی شادی کے لئے اُٹھا کر رکھ دی جاتی۔

"صلّو کی شادی میں بناؤں گی۔ سب کی گوالیر کی چندیری کی ساڑھیاں اور بمبئی میں تو دلی جا کر کروں گی سہیلی کی شادی طرح اپنے دونوں طرف کے یہاں آ گئے اور بس۔ اس گھر میں تو......"

"اور امّاں اُسے جائیں گی لیلا ڈیلا ئی کو ناچ کے لیے"۔ ایک بہن بولی۔

"بھئی ہم تو سہرا وغیرہ سب باندھیں گے۔ نزاکت کی اچکن ماموں ابا جیسی اور......"

بہنوں کے لئے بھائی تھا گویا جگمگاتا ہوا ہیرا! میری اندھی آنکھوں میں جیسے اور چھ سات بھائی تھے۔ یہ بھی ایک لڑنے جھگڑنے' تو تو میں میں کرنے اور بات بے بات رعب جمانے والی ایک ادنیٰ ہستی تھی۔ میں ان کے ارمان بھرے دلوں کے بھڑکتے ہوئے جذبات سے کُڑھ جاتی۔ کاش میرے بھی اتنے بھائیوں کے بجائے ایک ہی ہوتا۔ ایک دُبلا پتلا' آئے دن مریض چھوٹا لڑکا' کتنا رونق معلوم ہوتا۔

"باجی خدا کے واسطے میں یہ ٹھیک ٹھاک دو" وہ اپنی پتلی گردن آگے بڑھا کر بولا۔ "چٹ پٹ ٹانکو' مجھے پیچ میں جانا ہے" ــــ میں ناول کے ایسے چٹکے پر پہنچ گئی تھی جہاں ہیرو ہیروئن کے بازوؤں تک پہنچ چکا تھا بھلا اس قدر غیر رومانی کام میں میرا کیا جی لگتا۔

باعث تقلید

اُردو ادب کی پہلی نسوانی آواز جس نے مردوں کو یقین دلایا کہ عورت کی معلومات صرف گھر کی چار دیواری تک محدود نہیں' اسے مواقع ملیں تو وہ مردوں سے زیادہ بہتر اور سچائی کے ساتھ ان معلومات کا اظہار کر سکتی ہے۔ اس بے باک' نڈر اور صداقت پسند عورت نے دنیائے ادب میں افسانے کو سوچ کی جو نئی ڈگر بخشی' وہ ترقی پسند اور ادیبوں کے لئے باعثِ تقلید بنی۔

رعنا فاروقی

"رابعہ سے کہو وہ ٹانک دے گی۔"

"نہیں ہم تو تم ہی سے ٹنکوائیں گے۔"

"میرے پاس سوئی بھی نہیں۔"

وہ دوڑ کر چچی جان کی بقچی اٹھا لایا۔ "لو یہ سوئی۔"

"تاگہ پروو۔"

"لاؤ میں پرو دوں۔" چچی سروتہ چھوڑ کر بولیں۔

"میں تو انہیں سے ٹنکواؤں گا۔ لو سوئی۔"

مجھے ضد آگئی۔ "راشدہ سے ٹنکواؤ" ہیرو آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے آخری دو لائنیں پھر سے پڑھنا پڑیں۔

"نہیں ہم تو تمہیں سے ٹنکوائیں گے۔ رکھو کتاب ادھر ورنہ پھاڑ دوں گا۔"

"پھاڑ دی۔ بھاگ جاؤ نہیں ٹانکتے —" میں نے کتاب دوسری طرف موڑ لی۔ اُسے بھی ضد آگئی۔

"آج یا تو تم سے بٹن ٹنکواؤں گا یا اپنا تمہارا خون بہا دوں گا۔"

"چل ہٹ بڑا وہ ہے نا۔ بہاؤ نا بہاؤ اپنا خون۔" ہیرے کی کنی کے خون بہانے کے ارادہ ہی کو دیکھ کر جبینیں لرز گئیں، ان کا بس چلتا تو وہ بٹن کی جگہ اپنی آنکھیں ٹانک دیتیں۔

"منو لاؤ میں ٹانک دوں ذرا سی دیر میں" راشدہ بولی۔

"کہہ دیا صلاح الدین اعظم ایک جو کہہ دیتے ہیں وہ ٹلتی نہیں — دیکھو باجی ٹانکتی ہو یا ......"

"یا کیا؟" میں نے تیوریاں چڑھائیں۔

"یہی کہ پیچ دیکھتے نہیں جاؤں گا اور ایک لفظ کتاب کا نہیں پڑھنے دوں گا اور موقع ملنے پر کتاب پار کر دوں گا — اور ...... اور ......"

مجھے ہنسی آگئی

"اوہو۔ تو لیس تو پھر پیاری سی بجو کی طرح ٹانک دو۔"

میں نے بھی سوچا وبال کاٹو میں نے تو بٹن ٹانکنا شروع کیا اور وہ مجھے دق کرنے لگا۔

دیکھو منو میرا ہاتھ ہل جائے گا تو سوئی کلیجہ میں اتر جائے گی۔"

"اتر جانے دو۔" اور اس نے پھر گدگدی کی۔

میں نے سوئی مذاق میں چبھونا چاہی۔ وہ جلدی سے ہٹا دھکے سے نہ جانے کیسے سوئی کی نوک چبھ گئی خون بھی نکلا اور غضب یہ کہ نوک غائب۔ سنتے ہیں کہ سوئی کی نوک خون میں گھر جاتی ہے دل میں جا پہونچتی ہے دم نکل جاتا ہے۔

"ارے نوک!" میرے منہ سے پریشانی میں نکلا۔

"میرے سینے میں اتر گئی اور اب خون میں چلی جائے گی اور پھر ..... پھر دل میں آ جائے گی۔ لو آپا جان ہم تو چلے۔"

چچی جان کو سکتہ ہو گیا۔ مگر وہ سنبھلیں اور چیخیں۔ رابعہ چیخی اور راشدہ چیخی۔ میرا یہ حال کہ مجرم کی طرح سوئی پکڑے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ صلاح الدین سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور لاچاری سے گریبان ٹٹولنے لگا۔

پھر جو ہڑبڑ مچا ہے تو خدا ہی جانتا ہے کہ مجھ پر کیا کچھ گزری۔ ڈاکٹر، حکیم اور نمازیں۔ اور میرا دل چاہے ڈوب مروں۔ آخر میں نے مذاق کیا ہی کیوں، اور وہ بھی اس کانچ کے گلاس سے ——"

کیا بتاؤں کیسی پشیمانی ہو رہی تھی۔ ایکسرے ہوا سارے جسم میں سوئی ڈھونڈ ڈالی۔ مگر خاک پتہ نہ چلا اور بھی مصیبت۔

چچی جان کے آنسو اور رابعہ راشدہ کا ٹہل ٹہل کر دعائیں مانگنا اور اوپر سے منو کا اترا اترا کر مرنے کی دھمکیاں دینا۔ میرے آنسو نکل آئے۔ منو نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔

"اب تو چین آگیا آپ کو۔"
میں نے سر جھکا لیا۔
"اچھا یہاں آیئے، ذرا میرے سر میں تیل تھپک دیجیے۔"
بھلا اب مجھ میں ہمت کہاں تھی جو انکار کروں۔ چپ چاپ سر میں تیل ڈالنا شروع کیا۔ صلّو فتحمندانہ انداز سے مجھے آنکھیں چڑھا چڑھا کر دیکھتا اور مسکراتا رہا۔
"دیکھا میرا حکم نہ ماننے کا نتیجہ؟" وہ میری انگلی میں چٹکی نوچ کر بولا۔ سوئی تو میرے گریبان ہی میں رہ گئی تھی۔
غصّہ کے مارے میرا خون کھول گیا۔
"اچھا جانے دو۔ اماں جان کا ہے کو مانیں گی میں نے سوئی پھینک بھی دی۔" میرے ہاتھ پھر ڈھیلے پڑ گئے۔ اور وہ اور ہنسا۔
"اچھا باجی تجھے بھی اس کی سزا نہ ملی تو...... خیر۔" میرا جی چاہا اس کے بال نوچ کر رو رو ڈھکیں دوں۔ "خدا سمجھے......"
"مجھے تم سے کام کروانے میں مزا آتا ہے۔ جب میں نوکر ہو جاؤں گا تو تمہیں اپنے پاس رکھوں گا۔"
"ہوش میں، میری جوتی رہتی ہے تیرے پاس۔"
"دیکھ لینا۔ میں تمہیں لے لوں گا ــــ گود لے لوں گا ــــ ہنستی کیوں ہو۔"
مجھے ہنسی آگئی۔
"اور پھر تمہیں ہوائی جہاز میں بٹھاؤں گا۔ ہاں......"
وہ آنکھیں گول کر بولا۔

میرے امتحان کے دن آگئے تھے اور میں کمرہ بند کر کے پڑھائی کرتی تھی۔ مگر صلّو کہیں مانتا تھا۔ جہاں میں پڑھنے چلی اور وہ بھی موجود۔ میں نے سنجیدگی سے منع کر دیا کہ "اگر

خوش قسمتی

یہ اُردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اُسے صنفِ نازک میں سے ایک ایسی لکھنے والی عصمت چغتائی میسّر آئی ہے، جس نے نہ صرف اُس روایتی بناوٹ، تکلف اور خوف کو یکسر دُور کر دیا، جس نے اس طبقے کی رُوح کو دبا رکھا تھا، بلکہ اپنی ژرف نگاہی اور حق پرستی سے ہمیں انسانی فطرت کی اُن نازک اور لطیف ترین کیفیتوں سے آشنا ہونے میں مدد دی، جن تک کسی تیز سے تیز مرد صاحبِ قلم کی رسائی محال نظر آتی ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد

تم نے دق کیا تو میں بورڈنگ چلی جاؤں گی۔" پڑھنے کے خیال سے چچا میاں کے گھر رہنا پڑا تھا۔
وہ خاموش پڑھا کرتا۔ مگر گھنٹہ آدھ گھنٹہ بعد بے چینی ہونے لگتی۔
"اب بھائی انٹرول ہو گا۔" وہ کتاب بند کر کے میرے پاس آن گھستا اور دس منٹ تک وہ اودھم مچاتا کہ خدا کی پناہ۔ شرارت میں اُسے کانٹے کا رحم ہو گیا تھا۔
"بات یہ ہے کہ جی چاہتا ہے کہ تمہیں کھا جاؤں۔" وہ ہنس کر دانت پیستا۔
"خود اپنی بوٹیاں چبا ڈالو۔" مگر وہ بری طرح لپٹ جاتا اور باوجود ڈھکیلنے کے تنگ کئے جاتا۔ کبھی مجھے غصّہ آجاتا۔ لیکن عموماً اگر وہ کمرہ میں نہ ہوتا تو کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی۔ گھر کی ساری چہل پہل اسی ایک انسان کے دم سے تھی۔ بچّوں کو چھیڑنا، بہنوں کو ڈرانا، کبھی پھر

فوراً لیٹ کر پیار کرنا اور منالینا۔

امتحان ختم ہوگئے اور گھر جانے کے خیال سے خوشی کے ساتھ ساتھ دُکھ بھی ہو رہا تھا۔

"کیوں جا رہی ہو چھٹیوں میں۔" وہ ایک دن بولا۔

"وہ میری اماں بیچاری اکیلی ہیں۔"

"اکیلی! جیسے انہیں بڑی تمہاری پروا ہے۔"

"ہوں اور نہیں تو تمہیں پروا ہوگی۔"

وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ "سچ کہتا ہوں بجو.... سچ کہتا ہوں، تم رہ جاؤ۔" اُس نے پیار سے میرے کندھے پر سر رکھدیا اور اپنی شوخی باہیں میرے گلے میں حمائل کردیں۔

"ہٹو تو.... خیر ہوگی تمہیں میری پروا، مگر اب تو جاؤں گی۔"

"مگر میں کہتا ہوں مت جاؤ۔" وہ ذرا ہٹ کر بولا۔

"بکواس مت کرو۔ جاؤ ذرا کسی کو بھیجو میرا سامان باندھ دے۔"

"اور میں کہتا ہوں تم نہیں جاسکتیں۔"

"ہنھ! بڑے لاٹ صاحب ہونا جو روک لوگے۔"

"یاد ہے وہ سوئی۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔

"مکار ہو تم..... کہیں کے۔"

دوسرے دن ملّو کو بخار چڑھا۔ سارے گھر پر جیسے آفت ٹوٹ پڑی۔ ذرا سا ملیریا اور یہ ادھم کہ گھر دم مٹنے کی اجازت نہ تھی۔

"اماں جان، بجو کو روک لیجئے آپ سے اکیلے تیمارداری نہ ہو سکے گی۔" جیسے سُور کو بڑی تیمارداری کی ضرورت تھی!

"ارے میاں بھلا وہ کیوں رُکیں گی۔" چچی اماں طنز سے بولیں۔ "میں حمیدہ کو تار دے کر بلالوں گی۔"

"نہیں اماں وہ اپنے بچے لیکر آن دھمکیں گی تو اور غل مچے گا۔" بجو تو خود رک رہی تھی۔ "اسکول میں پارٹی ہے۔ دوسرے جب ہم اچھے ہو جائیں گے تو سنیما دیکھنے چلیں گے۔"

"رک جاؤ نا کیا ہرج ہے۔" رابعہ نے رائے دی۔ اُسے چڑیل کو کیا پتہ کہ یہ مکاری کر رہا ہے بخار تو اتفاق سے آگیا ورنہ وہ کچھ اور کھیل مچاتا۔ رکنا ہی پڑا۔

"صلاح الدین اعظم کا حکم۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔

"میرے مونچھیں نکل آئیں جب تمہارے اوپر اصلی رعب پڑا کرے گا۔ لو اس بات پر ذرا سی برف کچل کر تو کھلا دو۔" چچی جان نے اس قدر ڈری ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا کہ میں جلدی سے تولیہ میں برف توڑنے لگی۔ کسی کا لاڈلا ہو تو ہم کیوں بھگتیں۔ مگر وہ تو بھگتنا پڑا۔

"بجو..... بجو....." کسی نے آہستہ سے مجھے پکارا۔

"کیا ہے؟" میں ڈر گئی۔

"ذرا سا پانی" معصوم نے اپنے پلنگ سے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ میں جلدی سے اٹھی۔ اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر پانی نکالا۔

"امّاں تھکی ہوئی ہیں..... بیٹھ جاؤ۔" اس نے سرہانے مجھے بٹھا لیا اور آہستہ آہستہ گلاس میں برف ہلانے لگا۔

اُسے بُری طرح پسینہ آرہا تھا اور ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ پانی پیکر وہ میری گود میں سر رکھکر لیٹ گیا۔

"بجّو!"

"کیا ہے؟"

"میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"چچی جان کو جگاؤں؟" میں نے چاہا آرام سے اُس کا سر تکیہ پر رکھدوں۔

"نہیں..... جاؤ مت!" اس نے اپنے پتلے پتلے ہاتھ میری کمر میں ڈال دیئے" دل گھبرا رہا ہے بجّو!" وہ تیزی سے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے اپنے کو چھڑانے کی کوشش نہ کی اور اُس کی پیشانی پونچھنے لگی، وہ اور بھی پریشان ہو گیا۔ اُس نے جلدی جلدی میرا نام لیکر بڑبڑانا شروع کیا۔ سسکیاں! وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ عجیب سوکھی سوکھی، اکڑی ہوئی سانسیں۔ میں سمجھی نہ جانے کم بخت کو سرسام ہو گیا اور اُسے لٹانے کی کوشش کرنے لگی۔

"بجو جاؤ مت..... میں مر جاؤں گا" اور بری طرح بچّوں کی طرح مجھ سے لپٹ گیا اور اُس کی آنکھیں! وہ جیسے..... نہ جانے آج مجھے ان آنکھوں میں کیا نظر آ رہا تھا۔ میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ شوخی سے تھرکنے کے بجائے چڑھی ہوئی اور گہری تھیں۔ کچھ پاگل سی! کچھ عجیب! مجھے تھوڑی دیر کے لیے یہ معلوم ہوا گویا اندھیرے

پرانی فصیلیں

عصمت کی شخصیت اُردو ادب کے لیے باعثِ فخر ہے۔ انہوں نے بعض ایسی پُرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دیئے ہیں۔ کہ جب تک وہ کھڑی تھیں، کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے۔ اُردو ادب میں جو امتیاز عصمت چغتائی کو حاصل ہے، اُس کا مُنکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہوگا۔

پطرس بخاری

پیچ دار راستوں میں پریشان چکّر لگا رہی ہوں اور کوئی دروازہ نہیں۔"

کوئی قریب کے پلنگ پر کلبلایا اور وہ جلدی سے چونک پڑا "جاؤ..... رابعہ جاگ گئی!" اُس نے خوف زدہ ہو کر مجھے دور دھکیل دیا" جاؤ جلدی؟" وہ خود دوڑ کر چادر میں چھپ گیا۔

میں پریشان لیٹ گئی۔ یا اللہ! کیا واقعی یہ پاگل ہو رہا ہے! "رابعہ جاگ گئی!" تو کیا ہوا؟ مجھے چچی جان پر رحم آنے لگا۔ خدا نخواستہ..... خیر.....

اور اس کے بعد اس میں ایک غیر معمولی انقلاب ہو گیا۔ وہی رات والی پاگل گہری اور چڑھی ہوئی آنکھیں کبھی بغیر بخار اور ہذیان کے بھی کچھ عجیب ہوتیں وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ چھیڑنے اور بڑھانے لگا مجھ سے ہر وقت الجھتا اور پھر بالکل پاگل ہو جاتا۔ وہ میرے قریب میں رہنے کے بہانے تلاشتا' ہر جگہ' ہر کمرہ ہر موڑ اور ہر کونے پر وہ میری تاک میں مجھے ڈرانے اور گدگدانے کے لیے چھپا رہتا۔ میں اس کی ضرورت سے

زیادہ توجہ سے کبھی بے طرح پریشان ہو جاتی اور کبھی مجھے وہ سب ایک اظہر لڑکے کی شرارتیں معلوم ہوتیں اور یہ شرارتیں کس تیزی سے بڑھ رہی تھیں!

دو سال بعد جب میں رابعہ کی شادی پر آئی تو منو کو صلاح الدین اعظم کہنا پڑا۔ اُفوہ ایک چھوٹا سا لچکتا ہوا کملایا سا پودا نوخیز درخت بن گیا تھا۔ خون کی حدت سے چہرہ سانولا ہو گیا تھا اور پتلے سوکھے زرد ہاتھ سخت گٹھیلی دار مضبوط شاخوں کی طرح، جھلسے ہوئے بالوں سے ڈھک گئے تھے اور آنکھیں تو بخدا بالکل پاگل ہو گئی تھیں۔ پتلیاں ناچتی بھی تھیں اور ایک دم سے جم کر گہری ہو جاتیں کہ فوراً آنکھ جھپک جائیے۔

"بجو کچھ میری مونچھوں کا رعب پڑتا ہے؟"

"خاک! اس قدر بُری شکل ہو گئی ہے!"

"اور تمہاری بڑی بھولی ہے نا۔" اس نے مجھے گدگدا چاہا۔ میں اس کے بڑے بڑے ہاتھ دیکھ کر لرز گئی۔

"ہٹو منو..... خدا کے لیے۔ تم سے ڈر لگتا ہے۔ دیکھو ہو گئے ہو بالکل!"

"ہاں!" اور وہ غرور سے اور پھیل گیا۔

"ارے میں ماروں گی منو.....!" اس نے زبردستی اپنا کھردرا گال میرے ہاتھ پر زور سے رگڑ دیا۔ سارا ہاتھ جھلا اٹھا جیسے لوہے کا برش، کبھی تو میں اکر چھپتی تھی نہ جانے کیوں۔

شادی کا گھر اور وہ بھی ہندوستانی طریق۔ گھر کیا ہوتا ہے ایک بھول بھلیاں کا راستہ، جس میں مزے سے آنکھ مچولی کھیلو۔ سر کو پیر کی خبر نہیں ہوتی اور نہ جانے کتنے کھلاڑی آنکھ مچولیاں کھیل رہے ہوتے ہیں۔ کبھی دو چوروں کی کسی کونے میں ٹکر ہو جاتی ہے تو پھر جھینپ! مزہ آجاتا ہے۔

معلوم ہوتا تھا کہ گھر کے ہر کونے، ہر دیوار کی آڑ میں، ہر زینہ پر کئی کئی صلاح الدین کھڑے ہیں۔ آپ کدھر بھی چلی جائیے ناممکن جو صلاح الدین نہ موجود ہو جائے۔ بعض وقت تو یہ معلوم ہوتا گویا آسمان ہی سے ٹپک پڑے میں عاجز آ کر رابعہ کے پاس گھس گئی۔ لو وہ تھوڑی دیر بعد لاڈلا بھیا بہن کی صورت دیکھنے کو موجود! اور پھر یہ کہ ہم دونوں رضائی میں بمشکل سمائے ہیں کہ جناب اپنے بےڈول ہاتھوں اور چوڑے کندھوں کے اسی رضائی میں گھسیں گے۔ کس سے شکایت کی جائے۔ کس کے آگے گلا کریں! یعنی ان جگر کے ٹکڑے کلیجے کی کس سے شکایت کی جائے اور کیا شکایت ہو۔ مگر کہ وہ سنجیدگی سے ڈانٹ دو آپ ہی شرم آئے گی مگر وہ سنجیدہ ہونے کا موقع بھی دے۔

"جاؤ منو سر میں درد ہے۔" جو یہ بہانہ کیا تو۔

"سر میں درد؟ اے اماں جان بام کہاں ہے۔ ذرا بجو کو بھیجئے۔ ڈاکٹر سے اسپرو لائیے" اور بھی کوئی شور کرے گا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ چلو رشو، حمید، منی کھسکو یہاں سے بجو کے سر میں درد ہے" دروازہ بند! یا اللہ! لیجئے سر کا درد غائب اور اماں جان سے ضروری کام نکل آیا۔

"کیوں بجو جھوٹی! کہہ رہی تھی سر میں درد ہے اور یہاں پوریاں تلی جا رہی ہیں"۔ لیجئے باورچی خانہ میں بھی موجود۔ اب بھاگ گئے۔

کبھی آنچ بگاڑ دی کبھی کچھ۔ اللہ، پھر وہی شرارتیں! باورچی جانتا ہے کہ میاں بے چین ہو رہے ہیں۔

"بی بی آپ بھی جائیے اور منو میاں بھی۔ ورنہ مجھ سے کھانا پک چکا!"

"منو مجھے تم سے ایک بڑی ضروری بات کہنی ہے" میں نے سوچا آج انہیں سنجیدگی سے ڈانٹوں۔

"کس سے؟ مجھ سے؟..... ارے میرے بھاگ!
ایسے خوش گویا تمغہ ملنے والا ہے۔

اب ضروری بات کہنے سے پہلے خود اس قدر ضروری خدمات انجام دینا شروع کیں کہ بھاگتے ہی بن پڑے۔ کیا لوگ اندھے ہوتے ہیں! دکھائی نہیں دیتا انہیں! آنکھ مچولی میں تو بڑے بڑے شاہ پکڑے جاتے ہیں اور صلّو جیا چور! دن دھاڑے ڈاکہ ڈالنے والے بچ نہ سکے۔ لوگ سمجھتے ہیں بچہ ہے۔

سینما میں لوگوں کو بس عورت ہی عورت دکھائی دیتی ہے خواہ ہزاروں مرد کام کر رہے ہوں" اور میں بھی عورت تھی۔ مجھے جلد معلوم ہو گیا کہ چند ایسے غیر جانبدار بھی ہیں جو فیصلہ کرتے وقت نہ کسی کے کلیجہ کا ٹکڑا دیکھیں نہ جگر کی ٹھنڈک، کھڑی دھار پڑتی ہے" تلوار کی مجھے تو الزام دے گی دنیا! یہ تو کوئی دیکھتا نہیں کہ فتنہ... غصہ سے آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔

"ہٹ جاؤ صلاح الدین۔ حد ہوتی ہے بیہودگی کی۔ مجھے یہ باتیں پسند نہیں۔"

"ایں" اُس کا منہ اُتر گیا۔ "کیا ہوا بجو؟"

"کچھ نہیں..... تمہیں معلوم ہے لوگ کیا کہتے ہیں؟"

"میرا بولنا..... میرا..... آپ کو بُرا لگتا ہے؟"

"ہاں مجھے بہت بُرا لگتا ہے۔ اچھی بات نہیں لوگ....."

"لوگ؟ کون لوگ؟ کون لوگ ہیں وہ مجھے بھی بتاؤ ذرا——"

"کوئی بھی ہوں وہ۔ میری اور تمہاری بہتری چاہنے والے۔"

"بہتری؟" وہ سرخ ہو گیا۔

"ہاں اسی میں بہتری ہے۔" اور میں تیزی سے چلی آئی۔ دل پر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ آخر کو میں نے کہہ

پہاڑی ندی کا پانی

عصمت کے فن میں سے خاموش آسودگی یا مسرتِ عالیہ کہیں نہیں ملے گی، بلکہ انسانی خون آپ کو رگوں میں دوڑتا ہوا نظر آئے گا، اس طرح دوڑتا ہوا جیسے پہاڑی ندی کا پانی دوڑتا ہے۔ کبھی ابلتا ہوا، کبھی اُبلتا ہوا، ٹکراتا ہوا اور رستہ چیرتا ہوا۔

پطرس بخاری

ہی دیا۔ عورت کے تو ہاتھ میں ہے خواہ وہ بدراہ ہو جائے خواہ عین موقع پر آنکھیں کھل جائیں اور اُسے عاقبت نظر آنے لگے۔ آنکھیں کھل گئیں اور خوب موقع پر کھلیں! میں دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی

صلاح الدین آیا میں حسب عادت چوکنی ہو گئی۔ مگر گزرا چلا گیا۔ اُس نے مجھے دیکھا تک نہیں! میرے دل پر گھونسہ سا لگا۔ خیر..... اُونہہ.... کیا ہے بہتری اسی میں ہے بلا سے جان چھوٹی۔ کسی وقت سکون ہی نہ تھا۔ اب تو..... خیر! اور گھر کے ہر کونے اور ہر موڑ پر اب کوئی بھی نہ تھا؟ گویا امن، چین اور سکون! لیکن یہ پھر پریشانی کیسی؟ ایک فکر سی، ایک پستی، گویا کمان اتر گئی، دھار کُھٹل ہو گئی۔ گویا کچھ ہے ہی نہیں۔ اب کوئی آپ کو دیکھ کر کھنچا نہیں چلا آتا۔ اب کسی کو شرارتیں نہیں سوجھتیں، اب کسی کی عجیب اور پاگل آنکھیں آپ کے پیچھے نہیں دوڑتیں۔ جائیے شوق سے جائیے۔ اندھیری کوٹھڑی میں بھی چلے جائیے، کوئی مزاحمت نہیں کرتا۔ چور ملتا بھی ہے تو آپ کو جھک کر آداب عرض کرتا ہے

اور سر جھکا کر چل دیتا ہے ایک طرف کو۔ اب کوئی آپ کے پاس گھس کر بیٹھنے کا شوقین نہیں۔ بلکہ وہ ..... وہ سامنے کمسن خوبصورت لڑکیوں کے جھرمٹ میں شرارت بھری آنکھیں نچا کر خراج تحسین وصول کر رہا ہے۔ کبھی بھولے سے بھی اگر آنکھ مل جاتی ہے تو سر جھک جاتا ہے ——— پہچانتا تک نہیں!

شادی کے گھر میں معلوم ہوتا ہے موت ہو گئی ہے ایک موت نہیں سینکڑوں موتیں۔ ہزاروں خیالات سینکڑوں جذبات، اور ان گنت مسکراہٹیں مردہ پڑی ہیں۔ گھر جائیں، بیاہ ہو کر رہا ہے۔

اور بچی تو معلوم ہوتا ہے کبھی تھیں ہی نہیں کوئی اپنی رابعہ اپنے دولہا کے خیال میں مست۔ حمیدہ کا بچہ مزدوریات زندگی سے فارغ نہیں ہو چکا۔ جی چاہا ہیچ شادی سے چلدوں کا رخ۔

دیکھنے والوں نے دیکھ لیا اور تاڑ بھی لیا۔
"لے یہ منّو کی اور تمہاری کیا ان بن ہو گئی ہے؟" چچی بولیں۔
"نہیں تو۔" میں جلدی سے بولی۔
"جھوٹ۔" منّو نے دبی آواز میں کہا اور کھانے کی پلیٹ پر جھک گیا۔
"اوئی۔ چھوٹوں سے کیا غصہ۔ چلو منّو بھی سے معافی مانگو۔"
"جی نہیں..... یہ خود مانگیں معافی۔" منّو اکڑ گئے
"معافی وافی کیسی؟ کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔" میں نے معاملہ کو سیدھا کرنا چاہا۔
"جی نہیں میری تو لڑائی ہے۔"
"یہ کیوں۔ آخر ہوا کیا؟"
"ہوا یہ کہ..... خواہ مخواہ ڈانٹنے لگیں....."
"کچھ بھی نہیں چچی جان یہ مجھے چھیڑ رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا مجھ سے مت بولو۔ بھلا میں اس سے لڑوں گی؟"
میں جلدی سے بولی۔
"نہیں امّاں جان..... کیسی بھولی بن رہی ہیں۔ ایسے انہوں نے تھوڑی کہا تھا....." اور میں ڈر سی گئی کہیں اس نے کہہ دیا سب کے سامنے تو کیا ہوگا۔ مجھے خیال ہوا کہ میری غلط فہمی ہوگی۔ شاید یہ بھی اس کی شرارتیں ہیں اور..... اور شاید یہ شرارتیں ہی ہوں لعنت ہے کہ میں اُسے اس قدر ذلیل سمجھی!
"مجھے ایسی بُری طرح کہنے لگیں..... ہنہ! جیسے میں کوئی ذرہ ہوں....."
"ارے میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔ لیجئے ملاپ ہو گیا اب؟"
"لو اسی بات پر ہاتھ ملاؤ۔ اوہ..... کس قدر سردی ہے۔ ساری رضائی آپ اوڑھے بیٹھی ہو یہ نہیں کہ کسی اور کو بھی اڑھا لو۔"
وہ رضائی میں گھس کر بیٹھ گیا اور میرے آتے چٹکیاں لیں کر ملاپ کرنے کا مزہ آگیا۔
"منّو خدا کا واسطہ۔ پھر کہو گے میں نے یہ کہا اور وہ کہا۔" چچی جان معصومیت سے مسکرا رہی تھیں
"کہا ہی کیسے تم نے۔ بولو ہاریں کہ نہیں۔"
"بابا میں تجھ سے جیتی اور نہ جیتنے کا شوق۔ بس۔"
وہ ہنسا، دنیا کی ہر چیز ہنس پڑی۔

اور پھر وہی آنکھ مچولی! وہی بھول بھلیاں! اور عاقبت؟ ایک دفعہ کو عاقبت بھی کھکھلا پڑی کونا کونا مسحور کن نغموں سے گونج اٹھا۔ کان گنگ ہو گئے اور آنکھوں میں ریت بھر گئی۔ میٹھی میٹھی کٹھک والی ریت!

اور اب قصور کس کا؟ قصور تو ہونا ہی ہوا کسی کا۔ تقدیر کا؟ بچاری تقدیر! بات یہ ہے کہ اللہ پاک اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ ..... وہ تاکہ دیکھے..... یہی کہ بس دیکھے! جیسے ہم

تماشہ دیکھتے ہیں! ڈر..... دھڑکا۔ بدنامی، ذلت، پریشانی، بربادی، تباہی اور..... اور سب کچھ ایسے ہی موقع کے تاک میں رہتے ہیں۔ کچی شاخ میں جھولا ڈالو تو آپ ہی پھر جائے گی۔ بھئی خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لینا چاہئیے کہ گدا گھر ور تو نہیں، تمہی رنگینی ضمانی نہیں ورنہ آپ ہی پخنی لگے گی۔

لڑائی پر جانے سے چند دن پہلے تشریف لائے۔ ننھا برآمدے میں رائٹ لفٹ رائٹ کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ایسے سٹپٹائے کہ بس۔

"کیسی چوڑی ہے مری فوج!" میں نے سوچا "بڑے بڑے ہل جاتے ہیں اسے دیکھ کر!"

"تم نے مجھے بتایا بھی نہیں!"

"کیا.....؟"

"یہ..... یہ.....؟" وہ ننھے کو گھورنے لگے۔

"اوہ یہ..... ہاں کوئی ایسی بتانے کی بات ہی کیا تھی۔ میں نے اسے یتیم خانہ سے لیا تھا۔ جی بہلتا ہے اس سے۔"

"مگر یہ..... سچ بتاؤ۔" کتنی گھبراہٹ اور کتنی التجا تھی۔

"کیا بتاؤں؟..... ہاں تم اپنی کہو، یہ جی جان نے لاڈلے بیٹے کو کیسے لڑائی پر بھیج دیا؟" میں نے بات پلٹی۔

"لڑائی پر..... وہ..... ہوگا..... تم پہلے یہ بتاؤ..... کہ..... یہ" وہ ننھے کی طرف مڑے

"سمجھ ہی میں نہیں آتا تمہاری تو..... کیا تو یتیم خانہ"

"ہوں..... منّو کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ کچھ کھوئی ہوئی سی کھسیانی سی صورت۔

"جی گھبرا رہا ہے؟" میں نے چھیڑا

اور ان کی رنگت بدل سی گئی۔ "بیچارا بچہ! مر گیا ہوگا اس کا باپ شاید!" تلخی سے کہا۔

"خاک تمہارے منہ میں۔ خدا نہ کرے۔" میں نے ننھے کو کلیجے سے لگا لیا۔

"ٹھائیں.....!" ننھے نے موقع پا کر بندوق چلائی۔

"ہائیں..... باجی..... ابا کو مارتا ہے۔" میں نے بندوق چھین لی۔

اور پھر آنکھوں میں وہی شرارت تڑپی..... پھر..... بلا کی گہری ہوگئیں..... کچھ پاگل!..... عجیب سی!..... ٹٹولنے کے باوجود اس بھول بھلیاں میں راستہ نہ ملا

شاہکار افسانوی تحریک

قافلہ ڈائجسٹ اس ادبی تحریک کے تحت ہر ماہ ایک خاص نمبر پیش کرتا ہے:-

۱۔ کرشن چندر نمبر ۱۰/-
۲۔ منٹو نمبر ۶/-
۳۔ عصمت چغتائی نمبر ۶/-
۴۔ شاہکار افسانہ نمبر ۶/-
۵۔ خلیل جبران نمبر ۲/-
۶۔ اردو کا عظیم افسانہ نمبر (اول) ۱۰/-
۷۔ اردو کا عظیم افسانہ نمبر (دوم) ۱۰/-

مکتبہ شاہکار پوسٹ بکس ۷۲۵ لاہور

پوری ایک صدی کے بعد

دنیائے ادب کی عظیم ترین دلچسپ ترین

داستانِ مسلسل

طلسمِ ہوشربا

ماہوار قسطوں میں

مکمل۔ بلا تلخیص۔ بصورتِ ڈائجسٹ

اب تک ۲۰ قسطوں میں

۴۲۲۳ صفحات شائع ہو چکے ہیں۔

قیمت ـــــ چھ روپے

عین ممکن ہے کہ وقت گزرنے پر اس عظیم داستان کا شاہکار ایڈیشن بھی نایاب ہو جائے۔ اس لیے آج ہی خط لکھ کر منگوا لیجیے

مکتبۂ شاہکار

پوسٹ بکس ۱۷۵۴ ـ لاہور

پلیتہ

ایک عمارت میں رہنے والے دو اجنبی رشتہ داروں کا عجیب و غریب فسانہ

مجھے معلوم تھا۔ وہ سو بٹا سو طوائف ہیں۔ وہ سُرخ مصنوعی بال، چست کپڑے اور دن رات مردوں کے ٹھٹھ۔ ناچ گانے اور موٹے مہین قہقہے۔ مجھے اپنے کمرے میں بیٹھے بٹھائے جھکولا کرتے تھے۔ ہم عورتیں بڑے سے بڑے پہلوانوں کو چت کر سکتی ہیں پر جب طوائف سے ٹکر ہوتی ہے تو ساری نسوانیت اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں لوری کے ساتھ ساتھ بچے کے دل میں یہ بات چپکا دیتی ہے کہ طوائف اژدہا ہے، سانپ ہے! کیا کچھ ہے!

اور یہی بچپن کی نفرت اب تک خون کے ذرّوں میں ناچ رہی ہے۔ ویسے ہزاروں عورتیں گزر جائیں۔ پتہ نہیں چلتا۔ لیکن طوائف کو سونگھ کر ہرن کی طرح بھڑک جاتی ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ یہ خوشبو پہلی دفعہ میں نے بہت بچپن میں سونگھی تھی۔ بھرائچ میں سید میاں کے مزار پہ جمعرات کو طوائفوں کا جمگھٹا ہوتا۔ اللہ کے پیارے بھی اس متبرک دن کچھ زیادہ ہی آ جاتے۔ ایک دن ایک پکی سی طوائف نے مجھے نہ جانے کس جذبہ کے ماتحت گود میں اٹھا لیا۔ وہ اس کے پھسلتے کپڑے اور مخصوص خوشبو میں بسا ہوا سینہ! میں جلدی سے اس کی گود سے پھسل آئی۔

اس دن مجھے سب نے تھو تھو خوب تھو تھو کر کے چھیڑا کہ ہے! بچاری کو رنڈی نے چھو لیا اور میں بھی اس ہتک کے احساس سے دیر تک روتی رہی۔ پھر ایک دن میری پھوپھی آئیں اور انہوں نے مجھے پیار کیا تو وہ پھسلتے ہوئے ریشمی کپڑے اور مہکتا ہوا سینا! نہ جانے کیوں میں فوراً مچل کر بھاگ آئی۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ اور میری رنگین پھوپھی مشکل سے مہینہ بھر رہی ہوں گی کہ دس بچوں کے باپ میرے ابا جان ان پہ کسی طرح عاشق ہو گئے۔ میری اماں بچاری بجھ کر رہ گئیں۔ بھلا پان بیڑی کی دکان کے سامنے کوئی شاندار ہوٹل کھول دے تو بچاری دکان کا جوبن کے دن کا؟ خیر ٹونے ٹوٹکے ہوئے، تب جا کر کہیں ان کے گردوں میں درد اٹھا اور وہ بھاگیں۔ ہاں تو میرا مطلب یہ ہے کہ ہم عورتیں طوائفوں کو

سونگھ کر ہی کھٹک جاتی ہیں۔ بقول کسے ان کا ٹھسا دیکھ کر ہی حفاظتی دیواریں کھڑی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ وہ کوٹھے سے اتر رہی تھیں اور میں چڑھ رہی تھی کہ میں نے انھیں سونگھ لیا۔ اسے ہے یہ میں کہاں آگئی؟ کیا کہے گی دنیا؟ میرے محکمہ والے کیا کہیں گے؟ ایک سے ایک بدمزاج بھرا پڑا ہے۔ محلہ والیوں سے زیادہ یہ محکمہ والے ایسی ویسی باتوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔

عید کا دن تھا۔ غریبی میں کیسی عید اور کیسا محرّم۔ کپڑے بھی نہ بدلے لیٹی اخبار دیکھتی رہی۔ پڑوسن کے یہاں چار بجے سے برتن کھڑک رہے تھے۔ ان بچاریوں کو نیاز نذر کی بڑی فکر پڑی رہتی۔ بستر پہ لیٹی ناشتہ کر رہی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹایا اور قبل اس کے کہ میں سنبھلوں وہ آن دھمکیں!

عام طور پہ کسے معلوم رہتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے اور میری عمر میں یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی طوائف دندناتی چلی آئی ہو۔ لہذا میں گھبرا کر رہ گئی۔

"اے ہے میں نے کہا کہیں تم ناشتہ نہ کر چکو۔ کیا پشتم پشتم سویاں بگھار رہی ہیں؟" وہ اپنے چست کپڑوں میں سے پھنکاریں۔ کمبخت کو یہ بھی سوچنے کی فرصت نہ تھی کہ تنگ کپڑے پہننے کے دن کبھی کے جا چکے تھے۔ اور خمیری آٹے کو ٹھسوں سے گٹنے سے نہایت ناہموار سطح ہو جاتی ہے۔

"میں صبح کے وقت مٹھاس نہیں کھاتی۔" میں نے غرور سے گرہستن بننے کی کوشش کی۔

"اوئی آج عید کے دن بھی مٹھاس نہیں کھاتی۔ بھئی تمہیں ہماری قسم تھوڑی سی ضرور چکھو۔" وہ نہایت بے تکلفی سے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

یا اللہ! کیا یہ مجھے بھی طوائف سمجھ کر تبرک کے ذریعے میرے گناہ دھونے آئی تھیں۔ اب یہ کیسے بتاؤں کہ میں قطعی نیک اور پارسا ہوں۔ اور پھر قسم! اوہ معبود یہ ڈہی تو اس کے ہزاروں عاشقوں کی چھوڑی ہوئی قسم تھی جو یہ میرے حلق میں ٹھونس رہی تھی! میں جل اٹھی۔ لیکن جب وہ بے حیائی سے مصر ہی ہو گئیں تو میں نے دو چمچے چکھ لیے۔

"باورچی نے کہا کہ یہ بیوی مسلمان ہے، بس میرا جی ملنے کو پھڑک رہا تھا۔۔۔۔ مگر تم تو سارا دن غائب رہتی ہو۔" کسی نے انہیں پکارا اور وہ چلی گئیں۔

میں نے دو چمچے اور کھائے۔ یا خدا! جی چاہا حلق میں انگلی ڈال کر سب قے کر دوں۔ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں طوائف کی کمائی کھا رہی تھی۔ عصمت فروشی کی جمع کی ہوئی گھناؤنی دولت۔ فاحشہ بدکار کا پیسہ؟

مگر پھر میرے دل میں نہایت بے شرمی کے باغیانہ خیالات ناچنے لگے۔ یہ رنڈی کا پیشہ بھی تو اپنے باپ دادا ہی کا پیشہ ہے۔ میرے ایک چچا تھے جنہوں نے تین ہفتہ میں تیس ہزار روپیہ ریڈی بازی میں اڑا دیا تھا۔ اس سے مجھے کیا کہ میری چچی رنڈی کون تھی۔ ان لال بالوں والی ہی کی کوئی بہن بھانجی ہو گی۔ میں نے اور شوق سے سویاں کھانی شروع کیں۔ جیسے میں پھینکا ہوا مال سمیٹ

رہی تھی۔ مجھے ایک قسم کا اطمینان سا مل رہا تھا۔ میں ایک امیر کو کچھ کھٹورا سا غریب بنا رہی تھی۔ ایک چمچہ اور لیا اور میرا منہ کیوڑہ اور میوہ میں گھلی ہوئی سویوں سے بھر گیا۔ ایک بڑا سا سالم پستہ میری ڈاڑھ کے نیچے بیچ سے آ گیا۔ چکنائی کی ننھی بوندیں منہ میں بچھ کنے لگیں۔ جیسے میں نے کسی موٹے سے بنیئے کو چبا ڈالا۔ مگر فوراً ہی مجھے اس کی چپل کے خیال سے ابکائی آ گئی۔ مجھے وہی اطمینان محسوس ہو رہا تھا جو انگریزی کپڑے جلاتے وقت بلوائیوں کو ہوتا ہے۔ ہماری انتقام پسند آنکھیں ان خالی کھوکھلی کپڑوں میں اپنی مرضی کے موافق تخیلی جسم دیکھ کر سکون محسوس کرتی ہیں۔

میں نے سرہانے کی میز سے میٹرک کے امتحان کی کاپیاں اٹھا کر دیکھنا شروع کیں۔ کیسی عید اور کیسی بقر عید۔ ابھی تین سو کاپیاں اور دیکھنا تھیں مگر میرا دماغ جب بھٹکنا شروع کر دیتا ہے تو ہزار گھیروں پکڑے میں نہیں آتا۔ جل کر میں نے نحوی بدقسمتوں کو فیل کر دیا۔ پھر کاپیاں دور پھینک کر انگڑائیاں لینے لگی۔ یہ میاں کی اب وبھکا بھی کیا عجیب ہے جیسے بڑے سے گیلے تولیہ میں فضا لپٹی اونگھ رہی ہے۔ تھکی تھکی نیند، اعضا بھاری اور پھسلنے جیسے کسی نے سرنشی لگا کر ہلکا سا سکھا دیا ہو۔ ایک جھلایا ہوا سرور سا۔ اور پھر پڑوسن کے یہاں سے قہقہوں کے گرم گرم جھکے!

بدنصیب! مجھے پڑوسن پر رحم آنے لگا۔ ممکن ہے غریب اپنا جوہر عصمت لٹانے پہ مجبور ہو گئی ہو۔ شاید کسی ظالم نے اس کی عزت لوٹ لی ہو۔ اور پھر وہ کھسیا کر سر بازار بکھیرنے لگی اور

عصمت کا سراپا

عصمت کی شکل و صورت دلفریب نہیں، لیکن دل نشین ضرور ہے۔ اس سے پہلی ملاقات کے نقش ابھی تک میرے دل و دماغ میں محفوظ ہیں۔ بہت ہی سادہ لباس میں تھی۔ چھوٹی کنی کی سفید دھوتی، سفید زمین کا کالی کھڑی لکیروں والا چست بلاؤز، ہاتھ میں چھوٹا پرس، پاؤں میں بغیر ایڑی کا براؤن چپل، چھوٹی چھوٹی مگر تیز اور متجسس آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک، چھوٹے مگر گھنگھریالے بال ——— ٹیڑھی مانگ۔ ذرا سا مسکرائے پر بھی گالوں میں گڑھے پڑ پڑ جاتے تھے۔

سعادت حسن منٹو

مجھے اس پر پیار آ گیا۔ جب کبھی ہم سب بچے اماں سے کوئی کھانے پینے کی چیز جھپٹنے لگتے تو وہ بھی کھسیا کر ٹوکرے کا ٹوکرا پٹخ دیتی تھیں۔ کہ "لو نامرادو ٹھگسو۔ آپ مروگے۔!"

لیکن ہمیشہ نیک خیال کے ساتھ بدخیال ضرور میرے دماغ میں رینگ آیا کرتا ہے اور جونہی بچارا نیک خیال اونگھا بدلے پھن اٹھایا۔ یقیناً یہ سرخ بالوں والی طوائف تو جان بوجھ کر شوقیہ بنی ہوگی سستی کے مارے اور دنیا کا کچھ کام نہ ہو سکا مزے سے یہ پیشہ اختیار کر لیا۔ ہاں اور کیا! بھلا پڑوسن سے کیا سلائی ہوتی یا چکی پستی۔ سو جھمیلے ہیں دنیا کے اور پیشوں میں۔ میاں بیوی، بچے، ساس، نند کی تو میں بھلا کون بھگتے ——— بھلا یہ جوبن قائم رہتا جو پڑوسن کے بھی دو چار

عصمت کو سماج سے نہیں، شخصیتوں بلکہ اشخاص سے شغف ہے، اُن کے جوش و خروش سے، اُن کی تھرتھراہٹ اور کپکپی سے۔ ان کی باہمی کشمکش عداوت اور فریب کاری سے، جو انسان پر جب طاری ہوتی ہے تو جسم پھڑکنے لگتا ہے۔

پطرس بخاری

مس اکس نندیں ہوتیں۔ توبہ کیجیے!

ایک دن جیسے ہی فلیٹ پر پہنچی۔ پیڑوسن کے یہاں کسی کے چیخنے چلانے کی آواز آئی۔ سارے دن کی تھکن اس پر گھڑی بھر کو چین نہیں۔ سکول سے آکر جب تک کئی گھنٹے مردے کی طرح نہ پڑے رہو۔ تھکن نہیں اترتی۔ معلوم ہوتا ہے۔ کلاس میں لڑکیوں نے بھیجے کو گنے کی گنڈیری کی طرح مزے لے لے کر چبایا اور تھوک دیا۔ بڑی مشکل سے اس چوسی ہوئی گنڈیری کو تازہ کیجیے۔ صبح پھر وہ نکیلے دانتوں کے گھسے! سال میں ۲۶۰ دن یہی عمل جاری رکھیے۔ اس کے بعد۔ اس کے بعد پھر وہی چوسی ہوئی گنڈیری کے پھوک۔

دروازہ کھلا اور وہ ایڑیاں ٹھمکاتی چلی آئیں۔ آتے ہی گر گئیں۔

"میں تو عاجز آگئی ہوں نگاسے۔ اللہ جانتا ہے، ایسی بھی کیا سکول کی پڑھائی کہ ناس لگ گیا۔"

اہو! تو گویا زنڈیوں کی لڑکیوں کے بھی ناس ہی قدر ذی ہوش ہوتے ہیں کہ مر سکیں خوب تو آپ بھی چلیں اعتراض کرنے!

"تو کیوں بھیجتی ہیں سکول۔ اٹھا لیجیے۔"

"اوئی اُٹھالوں؟۔ لو اور سنو۔ اے بی آجکل بے پڑھی لکھی کو کون پوچھتا ہے۔ آج کل تو بس گریجویٹ کرتی میم چاہیئے۔"

یہ مجھے آج معلوم ہوا کہ اس پیشے میں بھی تعلیم یافتہ ہونے کی ضرورت ہے۔ شیکسپیئر اور ورڈس ورتھ کے حوالوں کی بھی ضرورتیں آتی ہیں۔

"کیا بات ہوئی؟"

اے وہ میں نے کہا۔ بیٹی نگار آج کھڑا پاجامہ پہن۔ کہ نہیں۔ جو بات ہے نہیں۔ بس وہ موئی فراخیں چڑھالو۔ میں نے کہا، تم سمجھاؤ تو شاید مان جائے۔ بات یہ ہے کہ کچھ لوگ دلی سے آرہے ہیں۔" انہوں نے رازدارانہ انداز میں کہا اور میرا جی چاہا ان کا چقندر جیسا منہ کھسوٹ لوں، جی؟ یعنی میں سمجھاؤں؟ خوب تو گویا مجھے بی۔ٹی میں رنڈیوں کی لڑکیوں کو پیشہ کے ہتھکنڈے ہی سکھائے گئے تھے۔ اب بھلا بتائیے یہ کیسے سکھاؤں کہ بھئی دلی والوں کے لیے پاجامہ پہنو، کلکتہ والوں کے لیے ساڑھی اور لاہور والے شلوار پسند کرتے ہیں۔ خوب! اور دوسرے مجھے یہ نگار مالتی سرے سے بکسی لگتی تھی۔ یعنی یہ کیا۔ یہ ہندو مسلم اتحاد یا فساد کا نمونہ ہے یا کیا؟ بڑے بڑے لیڈر چت ہو گئے۔ اور یہاں ایک محترمہ کی جدت پسندی نے ہندو مسلم سب کو گڈمڈ کرکے رکھ دیا۔ مگر میری عادت ہے کہ میں ہمیشہ ہر شخص کو مجبور سمجھ لیتی ہوں۔ شاید لال بالوں والی سیٹھانی بھی مجبور ہی ہو گئی ہوں۔ گڑبڑ میں یاد نہ رہا ہو اور بجائے کسی کی حق تلفی کرنے کے انہوں نے دونوں ہی کا خیال رکھا۔ خیر!

"تم کبھی ہماری طرف نہیں آتیں۔" انہوں نے ڈھٹائی سے کہا۔ قبل اس کے کہ میں دو کھا جواب دوں بولیں۔ "نگار نے نئے توڑے سیکھے ہیں۔"

اگر مجھے کسی وقت پیار آتا ہے تو اس وقت جبکہ وہ ناچ رہی ہو۔ اس وقت وہ مجھے عین میں اس محنتی مزدور کی طرح معلوم ہوتی ہے جو پیٹ کی خاطر سرمایہ داری کے کولہو میں بیل کی طرح جتا ہوتا ہو یا جیسے کوئی گرہستن چکی پیس رہی ہو۔ رقص کرنا مذاق نہیں۔ بوٹی بوٹی ہل جاتی ہے جیسے دس سیر آناج پیس لیا ہو۔ مگر مجھے طوائف کی زندگی کے دوسرے رُخ سے گھن اس لیے نہیں کہ وہ کچھ مختلف ہے۔ بالکل نہیں — بلکہ۔ یا کچھ ضرورت سے مشکل ہے۔ یہ بات نہیں۔ بلکہ یونہی۔

دوسرے دن ہمت کر کے میں سیٹھانی کے فلیٹ میں چلی گئی کہ دیکھوں اندر سے ان لوگوں کے گھر کیسے ہوتے ہیں۔ اُفوہ۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ کسی چھوٹے موٹے راجہ یا وزیر کا گھر۔ قد آدم تصویریں۔ برہنہ عورتوں کے مجسمے۔ یہ طوائفیں ننگی عورتوں کی تصویریں بھلا کیوں اپنے گھر میں رکھتی ہیں۔ بھلا اس سے کیا فائدہ سیٹھانی تو شائد اپنے جسم کی بھیانک سلوٹوں کو ان سڈول مجسموں کی آڑ میں دکھانا چاہتی ہے۔ ہوگا کوئی گرُ ان لوگوں کا۔

نگار مجھے دیکھ کر ایسے شرمائی۔ گویا ابھی انڈا کھٹک کر باہر نکلی ہے اور بڑی دیر تک نخرے کرنے کے بعد آئی۔ سیٹھانی نے ڈانٹا تو خیر دیکادر لگا کر ناچنے لگی۔

یہ رنڈیاں! اُف۔ میں نے تو سنا تھا کہ ان کے جسموں کو گھن لگ جاتا ہے۔ مگر سیٹھانی تو موہے کی لاٹھ رکھی ہیتی اور اولاد تو خدا کی پناہ۔ کیا چھریرا تیلا مرچدار جسم، جیسے ناگن انگڑائیاں لے رہی ہے۔ جب کلائی پہ کلائی تھم کی گرہ باندھ کر وہ پنجوں سے توڑے لیتی تو اس کی ننھی ننھی ٹھمکوروں سے ساری دنیا بلکورے لینے لگتی۔ میرا دل لرز اٹھا اُف یہ ناگن نہ جانے کتنوں کو ڈسے گی۔ نہ جانے کتنے شکار شکنجے میں ٹھونسے گی۔ ویسے تو عورت دوسری عورت سے وقت بے وقت جل ہی جاتی ہے مگر طوائف سے تو خدا کی پناہ۔ عورت تو اپنا حصہ یعنی ایک مرد لے کر بازار سے ہٹ جاتی ہے۔ مگر طوائف سے تو چھٹکارا نہیں جیسے دکان سے اناج لیتے وقت عوام تو حسب ضرورت

ایسے سیدھے مقولے

معیبت تو یہ ہے کہ عورت کے بارے میں ان نامعقول مقولوں نے مٹی کم کر رکھی ہے اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ جتنا مردوں نے عورت کو سمجھنے کا دعویٰ کیا ہے وہ اتنا عورتوں نے مردوں کے متعلق کبھی کوئی قول اپنی عقل سے نہیں بنایا۔ مردوں نے کہا "مرد ظالم ہوتا ہے" وہ چپ چاپ ظلم سہنے لگیں۔ مردوں نے کہا "عورت ڈرپوک ہوتی ہے" وہ چوہیا تک سے ڈرنے لگیں۔ پھر فرمایا: "وقت پڑے تو عورت جان پر کھیل جاتی ہے" بس جھٹ سے جان پر کھیل گئیں۔

عصمت چغتائی

لے کر ہٹ جاتے ہیں۔ مگر خاص موٹے بھر بھر بورے یہ خانوں کے نکلیجے ہیں آباد رہتے ہیں۔ نتیجہ ؟ — اگر اکنا مکس پڑھی ہے تو بس سمجھ لیجئے اناج کی کمی۔ تو یہ ہماری جنگ جو صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ یہ بھی مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ ہے۔ دکھ جھیلیں بی فاختہ اور کوّے میوہ کھائیں کہتے ہیں۔ ایک دن ایسا دکھتا ہوا آئے گا کہ سارے مزدور سرمایہ داروں کو پیس کر پھینک دیں گے اور ان کا سارا سرمایہ چھین لیں گے۔ شاید عورتیں بھی اسی طرح حملہ کر کے ایک دن طوائفوں کا "سرمایہ" چھین لیں۔ شاید!

شام ہوئی تو گاہک آنے لگے۔ مارے شرم کے میں سکڑی ایک طرف کو بیٹھی رہی کہ موقع ملے تو اڑنچھو کریں۔ پر مجھے بھی ان میں ایک نہ سمجھ لیں اور یہی ہوا کہ ایک بجھے ہوئے سے ایڈیٹر صاحب انہوں نے میرے سر چپکا دیے۔ کمبخت میں کچھ بول بھی نہ سکی اور اس نے میرا سودا ابھی کر دیا۔

تھوڑی سی دیر میں پورا ہال بھر گیا۔ رنگین عورتیں اور عیاش مرد۔ زور کے قہقہے چلنے لگے ایک کونے میں چار چھ تے بیٹھ کر پینا اور جوا شروع کر دیا۔ دوسری طرف نگار تھیر سے میں ادھر سے اُدھر چمک رہی تھی۔ اس پر لوگوں کی خاص توجہ تھی۔ ایک ادھیڑ سا مرد تو اسے گود میں گھسیٹ لیتا تھا اور وہ ہنس ہنس کر انہیں مار رہی تھی۔

مگر سماں تو سیٹھانی نے باندھ رکھا تھا۔ گہرے رنگ کے بھڑک دار کپڑے جو دن کو پیلے پھیکے لگ رہے تھے اس وقت بہار دے رہے تھے۔ پاؤڈر سرخی سے لیس جیسے چوکتی کی دلہن دو چار کمسن لڑکوں میں گھری ہوئی نازک چہلیں کر رہی تھی۔ اس وقت بلا کی کمسن اور حسین معلوم ہو رہی تھی۔ میں متحیر سی تھی کہ جوانی عمر سے ہوتی ہے یا اداؤں سے۔ اور ادھر وہ ایڈیٹر صاحب بیٹھے چبا رہے تھے۔ انتہائی ترقی پسندانہ باتیں اور اس خوبصورتی سے کہ میں ہکلا ہکلا کے رہ جاؤں۔ ان کی پوری توجہ ان برہنہ تصویروں کی طرف تھی جو میرے بہت ہی قریب ٹنگی تھیں۔ بلکہ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے ہی جسم پہ چپکی ہوئی ہیں۔ بار بار وہ انگلیوں سے ایسی تصویروں کے خطوط چھو کر ان کے حسن و قبح پہ بحث کر رہے تھے جس کے جواب میں گھبرا کر مجھے اپنے بٹوے میں کوئی نہایت ہی ضروری چیز ڈھونڈنا پڑتی تھی۔ گھما پھرا کر وہ عورتوں کے سینوں کے اُدق مسئلہ پہ لے آتے تھے اور آنکھوں میں میٹھی میٹھی نمی پیدا کر کے اپنے سوکھے ہاتھوں سے سانچے ڈھال ڈھال تشریح کر رہے تھے۔ باوجود اس قدر ڈھیٹ ہونے کے کئی دفعہ مجھے قالین کے نقش و نگار گھورنے پڑے۔ ہر جنبش پہ یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ میرے جسم کو آٹے کی طرح خوب پیروں سے گوندھ کر بھیانک سا پتلا بناتے ہیں۔ پھر بگاڑ دیتے ہیں۔ انہیں مجھے اس طرح نچوڑنے میں کچھ مزا آ رہا تھا۔ کیونکہ وہ برابر مسکرا رہے تھے۔ جل کر کئی دفعہ جی میں آیا کہ ان کے بھی کسی حصۂ جسم کا ایسا مذاق اڑاؤں کہ ایک دفعہ تو غلیظ مسکراہٹ سے بھری آنکھ بھی جھینپ جائے مگر تہذیب نے زبان پکڑ لی۔

عصمت کو برف کھانے کا بہت شوق ہے۔ بالکل بچوں کی طرح ڈلے ہاتھ میں لئے دانتوں سے کٹا کٹ کاٹتی رہتی ہے۔ اُس نے اپنے بعض افسانے بھی برف کھا کھا کر لکھے ہیں۔ چارپائی پر کہنیوں کے بل پراوندھی لیٹی ہے۔ سامنے تکیے پر کاپی کھلی ہے۔ ایک ہاتھ میں فاؤنٹین پن ہے اور دوسرے ہاتھ میں برف کی ڈلی۔ ریڈیو اونچے سُروں پر چلّا رہا ہے، مگر اس کا قلم اور منہ دونوں کھٹا کھٹ چل رہے ہیں۔

سعادت حسن منٹو

موقع پا کر میں لپکی اپنے کمرے کی طرف۔ گیلری میں ایک فوجی نوجوان نگار کو بری طرح جھنجوڑ رہا تھا اور وہ اُوں اُوں کر کے اسے گھسوٹ رہی تھی۔

پلنگ پر لیٹ کر نہ تو نیند ہی آئی اور نہ ہی کچھ کام ہو سکا۔ دوسرے دن انسپکٹرس آنے والی تھی۔ مجھے اس کو رجھانے کے لیے سو سو بناؤ کرنا تھے۔ سبق مؤثر ہو۔ اندازِ گفتگو مرعوب کن، رُعب، مدبرانہ اور چال ڈھال میں نرمی آمیز دبدبہ —— جماعت کی توجہ، بورڈ کا استعمال۔ سوال و جواب کی اہمیت —— میرے معزز پیشے کے شریفانہ گُر ایک ایک کر کے لیے میں یوں ہی ورزش کرنے لگی۔ پھر ایک دم مجھے خیال آیا جو کوئی مجھے اس طرح دیکھ لے تو۔ کسی کی موجودگی کے خیال سے مجھے ایک دم تنہائی کا شدید احساس ہونے لگا۔ میں کتنی اکیلی ہوں سوائے ان قہقہوں کے جو مہیب چمگادڑوں کی طرح سیٹھانی کے فلیٹ سے نڑھک نڑھک کر میرے دماغ سے ٹکرا رہے تھے۔ گھنگروؤں کی جھنکار اور تالیوں کی آوازیں ایک بارگی میرے جسم میں رینگ کر ہزاروں تنبھنوں کی طرح سیٹھانی پھڑپھڑانے لگیں اور پھر پدی نے دماغ میں کروٹیں لینا شروع کیں۔

اگر ان کرتوتوں کا ایک رُخ بھی کسی کو دکھائی دے جائے تو۔ تو نہ جانے کیا ہو۔ میں اسی خوف سے لرزا کرتی ہوں۔ شاید یہی کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے سیٹھانی بن سنور کر اپنے گاہکوں کو پیٹ کی خاطر لبھاتی ہیں۔ میں بھی کیل کانٹے سے درست ہو کر اپنے گاہکوں کے دربار میں جاتی ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ میری عقل —— وہی چوسی ہوئی گنڈیری۔ —— اور سیٹھانی —— یعنی کمل رس کا گھڑا۔ میں دماغ بیچتی ہوں اور سیٹھانی جسم! اور میرے دماغ کا مول سیکنڈ ہینڈ ٹائر کے برابر یعنی ستر روپیہ۔ اور سیٹھانی اپنی ایک انگڑائی میں اتنا کما لیتی ہیں کہ میرے ابا حکومت برطانیہ کے اعلیٰ افسر ہونے کے باوجود ساری عمر میں نہ کما سکے۔ ہم دونوں ہی بازار میں اپنے اپنے خوانچے لگائے بیٹھی ہیں۔ مال مختلف مگر مقصد وہی میرے مرجھاتے ہوئے دماغ کی حیثیت ان کے وسیع جسم کے آگے ایسی ہی ہے۔ جیسے پان بیڑی کی دکان کے آگے کرکٹ کلب —— یقیناً میرا سودا برا رہا۔ اور میں جلنے لگی۔ اپنے تخیل سے بھڑکائی ہوئی آگ میں۔ لوگوں کو طوائفوں پر رحم آتا ہے۔ ان کے سدھار کی فکریں ہیں۔ یہ تہیں کہ وہ تائب ہو جائیں۔ نہیں بلکہ جو بری گت سے ہیں ان کے دن پھر جائیں۔ ان کے میلے کپڑے زرق برق

ہوجائیں ۔ سڑے بسے گندی نالیوں کے پاس جو مکان ہیں وہ "میرین ڈرائیو" پہ پہنچ جائیں ۔ گاہک آئیں مگر نہ اتنے کہ ان کا جی میلا ہوجائے اور یہاں تنخواہ کا گریڈ ہر سال گرجائے کچھ پرواہ نہیں ۔ طالب علموں یا دوسرے طبقوں میں دوزخ کے دعویداروں کی تعداد دگنی ہوجائے ۔ ہیڈ معلمہ چوسن ڈالے ۔ دفتر کے کلرک ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ممبر ڈکار جائیں ۔ کچھ پرواہ نہیں ۔ استانیاں بچوں کے دماغ بنا رہی ہیں اور طوائفیں لاوارثوں کے دل کی ٹھنڈک ۔ دونوں ہی اپنا اپنا کام کر رہی ہیں ۔ پھر — پھر یہ کیوں ؟

جب رات اتنی دماغ کشتی لڑی ہو تو انسپکٹرس کے سامنے کیا تازہ دم ادا پلیں ۔ نتیجہ یہ کہ اس سال جو مستقل ہونے کی امیدیں تھیں رخصت جو مسلسل روح فرسائی کا ارمان تھا ختم ! اُف جس نے اپنی زندگی ہی قوم پر قربان ہونے کے لیے وقف کردی ہو .... وہ .... گر قوم ان ادھ مری گایوں سے گھن کھا چکی ہے ۔ یہ بیمار بکریاں — ان سے قوم کو قے آتی ہے ۔

دوسرے دن سیٹھانی پھر آن پہنچی اور مجھے ایسے فصیحت کرنے لگیں کہ کوئی میں بھی ان کے پردے کی ہوں ۔ اللہ اندھا دھند زندگی گزار رہی ہوں ۔

" اے ہے بس ہر وقت پڑھنا ۔ اللہ مارا دماغ بھی بل جاتا ہے ۔"

میں سمٹ کر چپ ہو رہی ۔

" دیکھو تو کیا شکل نکل آئی ہے ۔" انہوں نے رحم کھانا شروع کیا ۔ اور میرے دل میں بغاوت کا بھوت ناچا ۔ یہ مجھے کیوں چھیڑتی ہے خواہ مخواہ ۔ یا اللہ میں کہاں آگئی ؟ اوپر سے تو یہ عمارت بالکل شریفوں کے رہنے کی معلوم ہوتی ہے ۔ بورڈ پر نام بھی شریفوں جیسے ہیں : مس کوٹینو ۔ مس اکر مسز عبداللہ ... مس رشید ... مسز ...

" وہ حمید صاحب تم سے پھر ملنے کو کہتے تھے ۔" یہ وہی ایڈیٹر صاحب تھے ! ارے تو کیا اس نے واقعی مجھ سے پیشہ کرانے کا پکا فیصلہ کر لیا ؟ یعنی اپنے گاہکوں میں سے مریل مریل چھانٹ کر مجھے دیتی جائے گی ؟

" بھئی آج تمہیں ضرور سینما لے کر جاؤں گی ۔"

وہ اٹھلائیں ۔

" مگر مجھے تو ۔" واضح رہے کہ میرا پیشہ باعزت ہونے کے علاوہ کافی محنت طلب ہے ۔

" ارے ہٹاؤ بھی تمہیں تو ہر وقت کام ہی رہتا ہے ۔ حمید صاحب تمہارے لیے خاص طور پہ پاس لائے ہیں اور تم ہو کہ ٹال رہی ہو ۔ ارے یہی تو ہنسنے بولنے کی عمر ہے ۔"

یا مولا ۔ تو اب میرا مہذب پیشہ ختم اور یہ "ہنسنے بولنے" کا پیشہ شروع ——

توبہ اگر میری اماں بچاری کو معلوم ہو تو کیا حال ہو ان کا —— کہ ان کی نیک بیٹی کو بہکایا جا رہا ہے ۔ اور یہاں تو سودے بھی ہوگئے ۔ آج پاس آ گئے ، کل بنارسی ساڑھی ، پرسوں ہیرے کے بندے اور اترسوں وہ خود مع اپنے مصورانہ خیالات کے ۔ اور وہ پھر ان کے وہ کھردرے سوکھے ہاتھوں سے سانچے بنا بنا کر .... اللہ !

میں نے رکھائی سے انکار کر دیا اور وہ مضمحل سی بڑبڑاتی چلی گئیں ۔

" توبہ ایسا بھی کیا —— سبھی تو کہتے ہیں ۔ اتنا پڑھنا لکھنا بھی اچھا نہیں

لڑکیوں کا ——— "

جی ہاں! کیوں نہیں ——— پڑھ لکھ کر کریں گی ہی کیا ——— آپ کا لطیف پیشہ سلامت رہے۔ کیا ضرورت ہے کہ دماغ پچی کرے کوئی؟ میری سمجھ میں نہ آیا کہ باوجود اتنی بدمزاجی کے مجھ میں کیا دلچسپی تھی جو بار بار پڑوسن آتی تھیں!

میں کاپیاں درست کرنے لگی۔ یا خدا یہ فیل ہونے والے بھی جان جان کر جلاتے ہیں۔ جی چاہتا ہے۔ صفر سے بھی کوئی ذلیل تعداد ہو تو وہ نکال کر دوں انہیں۔ مری کمبخت جی چاہا جو فیل نہیں ہوئیں، ان کو بھی فیل کر دوں — تاکہ سب کی سب سیٹھانی کی طرح تباہی کے غار میں گر پڑیں۔ پھر ایک دم سے میں نے سوچا نہیں۔ یہ تو نہایت عجیب سزا ہو گی۔ ——— بہتر یہی ہے کہ میں انہیں اچھی طرح قوم کی خدمت کے لیے باہمت اور محنتی استانیاں بنا دوں ——— تاکہ ——— وہ بھی ——— آگے سوچنے کی طاقت زنگ کھا کر رہ گئی۔

سیٹھانی اور نگار ہنستی کھلکھلاتی حمید صاحب اور دو چار اور بھٹکتے ہوئے عاشقوں کے ساتھ سینما گئیں۔ جب وہ آئیں تب بھی میں جاگ رہی تھی۔ جہاں غنودگی آئی اور عفریتوں نے دانت نکال کر حملہ کیا۔ بھلا اس طرح کون کام کر سکتا ہے دو چار دن اور رہی رنڈی کے پڑوس میں تو نہ جانے کیا ہو۔ میرے خیالات دن بدن الجھتے جا رہے تھے۔ خود اپنے ضمیر سے بات کرتے ڈر لگتا تھا کہ نہ جانے کمبخت کیا بول اٹھے۔

میں سر پکڑے پلنگ پہ بیٹھی رہی۔ تھکی

بلاخیزی

عصمت کے افسانوں کے مطالعے سے ایک اور بات جو ذہن میں آتی ہے، وہ ہے گھوڑ دوڑ۔ یعنی رفتار، حرکت، سبک خرامی اور تیز گامی۔ نہ صرف افسانہ دوڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے بلکہ فقرے، کنایے اور اشارے اور آوازیں اور کردار اور جذبات اور احساسات ایک طوفان کی سی بلاخیزی کے ساتھ چلتے اور آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔

کرشن چندر

ہاری سیٹھانی سو گئی تھی ——— فلیٹ پہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چند واہیات خیالات دل میں جاگے ——— ذرا ڈھیل دی تو ریلا کا ریلا ٹوٹ پڑا ——— قہقہہ پہ قہقہہ میرے دماغ میں سے ابلنے لگا مگر میرا چہرہ نہ ہنسا . . . عزت، پاکبازی . . . . گندے انڈے کی طرح بوٹے کے نیچے دبائے بیٹھے رہو . . . . تو کیا اس میں سرخاب نکلے گا؟ اور پھر تماشہ یہ کہ کوئی بھی اس گندے انڈے کی سیوا کا پھل نہیں دیتا ——— قوم کو ذرا بھی احساس نہیں کہ ایک دیوی یوں پارسائی کا پشتارہ اٹھائے تو یہ جی چاہا اٹھا کر بیچ سڑک پہ ایسی جگہ چھوڑ دوں کہ ہر آنے جانے والا غلاظت سے متعفن جائے۔ یہ مجھے کیا ہو رہا تھا ——— یہ سب اس

وندڈی کے پڑوس میں رہنے سے ہوا ! مجھے فوراً اپنی سہیلی بنیا یاد آگئی ! اُف بنیا کتنی حسین اور چلبلی تھی اور وہ پھر مسلسل نو سال پڑھاتی رہی اور پھر ایک دم بوکھلا کر اس نے ایک غلیظ بڈھے سے شادی کر لی۔ ... وہ تو کہتی تھی کہ وہ اس کی قومی خدمات کو دیکھ کر اس پہ عاشق ہو گئی تھی وہ سولہ برس جیل کاٹ کر آیا تھا اور کسی زمانہ میں حسین بھی تھا۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ بنیا قوم کی خدمت کی آڑ لے رہی ہے جیسے سیٹھانی برہنہ تصویروں کی آڑ لیتی ہے —— دراصل بھوک میں کواڑ پاٹ پٹ ہو جاتے ہیں۔

میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ فلیٹ بدل دوں گی۔ ورنہ جوہر بے بہا کیچڑ میں جا پڑے گا اور وہ دولت جس کے پیچھے مشرقی عورت جان دے دیتی ہے مٹی میں مل جائے گی۔ دنیا میں عورت کے پاس یہ عصمت ہی تو ایک شے ہے جسے کوئی پیٹ کی خاطر لٹاتی ہے تو کوئی اس کی خاطر جان لٹا دیتی ہے۔ لے دے کر یہی ایک ترپ کا اِکّا ہے جو ہر داؤں پہ مار سکتی ہے۔

تھک ہار کر خیالات میں اُلجھی سونے کی کوشش کرنے لگی۔

صبح اٹھ کر میں جب نیچے جانے لگی تو سیٹھانی پل والے سے کھڑی الجھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر غیروں کی طرح منہ پھیر لیا۔ فخر سے میرا سر اونچا ہو گیا۔ آخر کو اسے معلوم ہو ہی گیا کہ میں شریف ہوں —— اور وہ بازاری جنس !

اس کے دو چار دن کے بعد کا ذکر ہے کہ میرے ماموں زاد بھائی اور اس کی بیوی آئے۔ جب سے میں نے یہ فلیٹ لیا تھا میں ڈر رہی تھی کہ وہ شاید یہ سن کر چراغ پا ہوں کہ میں ایسے پڑوس میں رہتی ہوں۔ جیسے ہی وہ آئے سیٹھانی کے فلیٹ سے قہقہے بڑی بڑی چٹانوں کی طرح لڑھک لڑھک کر گرنے لگے۔ میں نے اٹھ کر نفرت سے دروازہ بھیڑ دیا۔

" کمبخت ہر وقت بدتمیزیاں ہوتی رہتی ہیں۔"

" کہاں ؟"

" یہاں — کمبخت ایک طوائف رہتی ہے۔ ہر وقت ٹھٹھے لگے رہتے ہیں ۔"

" طوائف ؟ — یہاں ؟ — مگر یہ تو نگار کی آواز تھی ۔" وہ چونکے۔

" ہاں — آپ جانتے ہیں انہیں ۔؟" میں نے معنی خیز نظروں سے ان کی بیوی کو دیکھا۔

" ہاں ہاں بھئی — ارے تم نہیں ملیں ان سے — میں نے تو نگار کے ٹانسلز کا آپریشن کیا تھا ۔ ارے یہ تو بڑے خاندانی لوگ ہیں ۔"

" یہ — یہ — سیٹھانی — "

" ہاں بھئی — سیٹھ عبداللہ کی بیوی — سر عبدالکریم کے خاندان میں سے ہیں — اور — رضیہ کی خالہ لگتی ہیں — "

" ممانی ۔" رضیہ بولیں۔

اور میں حیرت زدہ ان عبرتناک زلزلوں کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ سن رہ گئی ۔ جیسے میں نے کسی مقدس کتاب کو ٹھوکر مار دی ہو — اور کفارہ — ؟ — کفارہ میرے امکان سے باہر ہو ۔"

" تو — تو وہ کوئی دوسرا فلیٹ ہوگا ۔" میں نے ہکلا کر کہا۔

ننّھی کی نانی

معاشرے کا ایک ایسا حقیقی کردار، جو افسانہ بن کر امر ہو گیا

ننّھی کی نانی کا ماں باپ کا نام تو اللہ جانے کیا تھا۔ لوگوں نے کبھی انھیں اس نام سے یاد نہ کیا۔ جب چھوٹی سی گلیوں میں ناک سڑسڑاتی پھرتی تھیں تو بفاتی کی لونڈیا کے نام سے پکاری گئیں۔ پھر کچھ دن بشیرے کی بہو کہلائیں پھر "بسم اللہ کی ماں" کے لقب سے یاد کی جانے لگیں۔ اور جب بسم اللہ جاپے کے اندر ہی ننّھی کو چھوڑ کر چل بسی تو وہ "ننّھی کی نانی" کے نام سے آخری دم تک پہچانی گئیں۔

دنیا کا کوئی ایسا پیشہ نہ تھا جو زندگی میں "ننّھی کی نانی" نے اختیار نہ کیا۔ کٹورا گلاس پکڑنے کی عمر سے وہ تیرے میرے گھر میں دو وقت کی روٹی اور پرانے کپڑوں کے عوض اوپر کے کام پر دھرلی گئیں۔ یہ اوپر کا کام کتنا نیچا ہوتا ہے۔ پنکھے کھینچنے کو دنے کی عمر سے کام پر جوت دیئے جانے والے ہی جانتے ہیں۔ ننّھے میاں کے آگے جھنجھنا بجانے کی غیر دلچسپ ڈیوٹی سے لے کر بڑے سرکار کے سر کی مالش تک اوپر کے کام کی فہرست میں آجاتی ہے۔

زندگی کی دوڑ بھاگ میں کچھ بھونا تلنا بھی آگیا اور زندگی کے کچھ سال ماماگیری میں بیت گئے۔ پر جب دال میں چھپکلی بگھار دی اور روٹیوں میں مکھیاں پرونے لگیں تو مجبوراً ریٹائر ہونا پڑا۔

اس کے بعد تو ننّھی کی نانی بس لگائی بجھائی کرنے ادھر کی بات اُدھر پہنچانے کے سوا اور کسی کرم کی نہ رہیں۔ یہ لگائی بجھائی کا پیشہ بھی خاصہ منافع بخش ہوتا ہے۔ محلّہ میں کھٹ پٹ چلتی رہتی ہے۔ مخالف کیمپ میں جاکر اگر ہوشیاری سے مخبری کی جائے تو خوب خوب خاطر مدارات ہوتی ہے۔ لیکن یہ پیشہ کے دن چلتا' نانی لُتری کہلانے لگیں اور دال گلتی نہ پا کر نانی نے آخری اور مفید ترین پیشہ یعنی مہذب طریقہ پر بھیک مانگنا شروع کردی۔

کھانے کے وقت نانی ناک پھیلا کر سونگھتیں کہ کس گھر میں کیا پک رہا ہے۔ بہترین خوشبو کی ڈور پکڑ کر وہ گھر میں آن بیٹھتیں۔

"اے بیوی گھیّاں ڈالی ہیں گوش میں۔" وہ بے تکلفی سے پوچھتیں۔

"نہیں بوا گھیّاں تھوڑی آجکل ملیں کہاں ہیں۔ آلو ڈالے ہیں۔"

"اے سبحان اللہ۔ کیا خوشبو ہے۔ اللہ رکھے بسم اللہ کے باوا کو آلوؤں سے عشق تھا۔ روز یہی کہ بسم اللہ کی ماں آلو گوشت۔ جب دیکھو آلو گوشت ہے..... اب تو مہینوں گزر جاویں آلو گوشت جو آنکھوں سے بھی دیکھ جاوے..... اے بیوی کو تمیں چھوڑ دیا؟" وہ ایک دم فکر مند ہو جاتیں۔

"نہیں بُوا کوتھمیر نگوڑا سب مارا گیا موا سقّے کا کتا کیاری میں لوٹ گیا۔"

"ہے ہے بغیر کوتھمیر کے بھلا آلو گوشت کیا خاک مزہ دے گا۔ حکیم جی کے یہاں منوں لگا ہے۔"

"اے نہیں نانی حکیم جی کے لونڈے نے کل شبّن میاں کی پتنگ میں کنکی لگا دی۔ اس پر میں نے کہا خبردار جو پیچھے پہ قدم رکھا تو......"

"اے میں کوئی تمہارے نام سے تھوڑی مانگوں گی۔" اور نانی برقع سنبھال سلیپریں سٹپٹاتی حکیم جی کے یہاں جا پہنچتیں، دھوپ کھانے کے بہانے کھسکتی کھسکتی کیاری کے پاس منڈیر تک جا پہنچ جاتیں۔ پہلے ایک پتی توڑ کر سونگھنے کے بہانے چٹکی میں مسلتیں۔ حکیم جی کی بہو کی آنکھ بچی اور مارا نانی نے کوتھمیر پر ہاتھ۔ کوتھمیر مہیا کرنے کے بعد ظاہر ہے دو نوالے کی حقدار ہو ہی جاتیں۔

نانی اپنے ہاتھ کی صفائی کے لیے سارے محلّے میں مشہور تھیں۔ کھانے پینے کی چیز دیکھی اور لقمہ مار گئیں۔ بچّے کے دودھ کی پتیلی منہ سے لگائی دو گھونٹ غٹ لیے۔ شکر کی پھنکی مار لی۔ گڑ کی ڈلی تالو سے چپکائی مزے سے دھوپ میں بیٹھی چوس رہی ہیں۔ ڈلی اٹھائی نیفے میں اُڑس لی۔ دو چپاتیاں لیں اور آدھی نیفے کے ادھر آدھی اُدھر اُڑس کے موٹا کرتا آہستہ آہستہ حسبِ معمول کراہتی کونکتی کھسک گئیں۔ سب جانتے تھے۔ پر کسی کو منہ کھولنے کی ہمت نہ تھی کیونکہ نانی کے بوڑھے ہاتھوں میں بجلی کی سی سُرعت تھی اور بے چبائے نگل جانے میں وہ کوئی عیب نہ سمجھتی تھیں۔ وہ ہرے ذرا سے شبہے پر ہی قیل مچانے پر تل جاتی تھیں اور اتنی قسمیں کھاتی تھیں۔ قرآن اٹھانے کی دھمکیاں دیتی تھیں کہ توبہ بھلی، اب کون اُن سے جھوٹا قرآن اٹھوا کر اپنی قبر میں بھی کیڑے پڑوائے۔

لُتری، چور اور چکمہ باز ہونے کے علاوہ نانی پرلے درجہ کی جھوٹی بھی تھیں۔ سب سے بڑا جھوٹ تو ان کا وہ برقعہ تھا جو ہر دم اُن کے اوپر سوار رہتا تھا۔ کبھی اس برقعہ میں نقاب بھی تھی پر جوں جوں محلہ کے بڑے بوڑھے چل بسے یا نیم اندھے ہو گئے تو نانی نے نقاب کو خیرباد کہہ دیا۔ مگر گنگوروں دار فیشن ایبل قبر کی ٹوپی اُن کی کھوپڑی پر چپکی رہتی۔ آگے چاہے قمیض کرتے کے نیچے بنیان نہ ہو پر پیچھے برقعہ بادشاہوں کی جھول کی طرح لہراتا رہے اور یہ برقعہ صرف ستر ڈھانکنے کے لیے ہی نہیں تھا بلکہ دنیا کا ہر ممکن اور ناممکن کام اسی سے لیا جاتا تھا۔ اوڑھنے بچھانے اور گٹھری مٹھری کر کے تکیہ بنانے کے علاوہ جب نانی کبھی خیر سے نہاتیں تو اسے تولیہ کے طور پر استعمال کرتیں۔ پنجوقتہ نماز کے لیے جانماز اور جب محلہ کے کتّے دانت نکوسیں تو اُن سے بچاؤ کے لیے اچھی خاصی ڈھال۔ کتا پنڈلی پر لپکا اور نانی کے برقعہ کا گھیر اُس کے منہ پر پھٹکارا۔ نانی کو برقعہ بہت پیارا تھا فرصت میں بیٹھ کر حسرت سے اس کے بڑھاپے پر بسورا کرتیں۔ جہاں کوئی چندی کتر لی اور احتیاطاً پیوند چپکا لیا۔ وہ اس دن کے خیال سے ہی لرز اٹھتی تھیں جب یہ برقعہ بھی چل بسے گا۔ آٹھ گز ململ کفن کو جڑ جاوے یہی بہت جانو۔

نانی کا کوئی مستقل ہیڈ کوارٹر نہیں، سپاہی جیسی زندگی ہے آج اس کے دالان میں تو کل اُس کی صحنچی میں جہاں جگہ ملی پڑاؤ ڈال دیا جب دھتکار پڑی کوچ کر کے آگے چل پڑیں۔ آدھا برقعہ اوڑھا آدھا بچھایا اللہ کا نام لیا۔

مگر برقعہ سے بھی زیادہ وہ جس کی فکر میں گھلتی تھیں وہ تھی ان کی اکلوتی نواسی نمّی۔ کٹر کٹ مرغی کی طرح نانی پر پھیلائے اُسے پروں تلے دابے رہتیں۔ کیا مجال جو نظر سے اوجھل ہو جائے مگر جب ہاتھ پیروں نے جواب دے دیا اور محلہ والے جو کتنے ہو گئے اُن کی جوتیوں کی کھسر پھسر سن کر ہی چاق چوبند ہو کر مورچہ پر ڈٹ جاتے۔ ڈھٹائی سے نانی کے اشارے کنایے سے ملنگے کو تنگ آن ستا کر جاتے۔ تو نانی کو اس کے سوا کوئی چارا نہ رہا کہ نمّی کو اُس کے آبائی پیشے یعنی اُڑ کے کام پر لگا دیں۔ بڑے سوچ بچار کے بعد انھوں نے اُسے ڈپٹی صاحب کے یہاں روٹی

کپڑا اور ڈیڑھ دو پیسہ جہیز پر چھوڑ ہی دیا۔ پر وہ بردم سائے کی طرح لگی رہتیں۔ ننھی نظر سے اوجھل ہوئی اور وہ بلبلائیں۔ پر نصیب کا لکھا کہیں بوڑھے ہاتھوں سے مٹا ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ڈپٹیائن، اپنے بھائی کے گھر بیٹے کا پیغام لے کر گئی ہوئی سرکار خس خانہ میں قیلولہ فرما رہے تھے۔ ننھی پنکھے کی دوڑی تھامے اونگھ رہی تھی۔ پنکھا رک گیا اور سرکار کی نیند ٹوٹ گئی۔ شیطان جاگ اٹھا اور ننھی کی قسمت سو گئی۔

کہتے ہیں بڑھاپے کے آسیب سے بچنے کے لیے مختلف ادویات اور طلاؤں کے ساتھ حکیم بید چوزوں کی یخنی بھی تجویز فرماتے ہیں۔ نو برس کی ننھی چوزہ ہی تو تھی۔

مگر جب ننھی کی نانی کی آنکھ کھلی تو ننھی غائب۔ محلہ چھان مارا کوئی سراغ نہ ملا مگر رات کو جب نانی تھکی ماندی کوٹھری کو لوٹی تو کونے میں دیوار سے لگی ہوئی ننھی زخمی چڑیا کی طرح اپنی پھیکی پھیکی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ نانی کی گھگی بندھ گئی اور اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے وہ اسے گالیاں دینے لگی۔ "مالزادی اُچھا چھکا۔ میاں آن کو مری ہے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے پنڈلیاں سوج گئیں، ٹھہر تو جا سرکار سے کیسی چار چوٹ کی مار لگواتی ہوں۔"

مگر ننھی کی چوٹ زیادہ دیر نہ چھپ سکی۔ نانی سر پہ دوہتڑ مار مار کر جنگھاڑنے لگی۔ پڑوسن نے سنا تو سر پکڑ کر رہ گئیں۔ اگر صاحبزادے کی لغزش ہوتی تو شاید کچھ ڈانٹ ڈپٹ ہو جاتی۔ مگر ڈپٹی صاحب ...... محلے کے کھیا تین نواسوں کے نانا۔ پنجوقتہ نمازی۔ ابھی پچھلے دنوں مسجد میں چٹائیاں اور لوٹے رکھوائے۔ منہ سے پھوٹنے والی بات نہیں۔

لوگوں کے رحم و کرم کی عادی نانی نے آنسو پی کر ننھی کی کمر سینکی آٹے گڑ کا حلوا کھلا کر اپنی جان کو صبر کر کے بیٹھ رہی۔ دو چار دن لوٹ پیٹ کر ننھی اٹھ کھڑی ہوئی اور چند دنوں ہی میں سب کچھ بھول بھال گئی۔

مگر محلہ کی شریف زادیاں نہ بھولیں۔ چھپ چھپ کر ننھی کو بلاتیں۔

ثریا نے جھنڈے گاڑ دیئے اور لقول کسے "محبوبۂ عالم"، بن گئی۔ کسی زمانے میں جتنے عاشق اکیلی ثریا کے ہر گلی کوچے میں پائے جاتے تھے کسی کسی ہیروئن کو نصیب نہیں ہوئے۔ ابھی بچی ہی تھی کہ موتی لال بھٹا سن کے سہگل اور پرتھوی راج کے مقابل ہیروئن بنا دی گئی۔ ایکٹنگ سے زیادہ اُس کی آواز کا جادو تھا جس نے دلوں کو موہ لیا۔ اُس وقت لتا اتنی چھائی ہوئی نہ تھی شمشاد بیگم کی آواز ہی ہر گیت میں سنائی دیتی تھی۔ لیکن ثریا اور نور جہاں چونکہ اپنے گیت خود گاتی تھیں، اس لیے انہوں نے رونما، شنشی اور کانن بالا کے ریکارڈ توڑ دیئے۔ ہر پوسٹر پر ثریا کی صورت، جدھر دیکھو ثریا ہی ثریا۔

عصمت چغتائی — "دو نیند کی ماتی"

"نہیں ...... نانی مارے گی!" ننھی ٹالتی۔

"لے یہ چوڑیاں پہن لیجو۔ نانی کو کیا خبر ہو گی ......"

بیویاں بے قرار ہو کر پھسلاتیں ......

"کیا ہوا ...... کیسے ہوا ......" کی تفصیل پوچھی جاتی۔ ننھی کچی کچی معصوم تفصیلیں دیتی۔ بیویاں ناکوں پہ دوپٹے رکھ کر کھلکھلاتیں۔

ننھی بھول گئی ...... مگر قدرت نہ بھول سکی۔ کچی کلی قبل از وقت توڑ کر کھلانے سے پنکھڑیاں جھڑ جاتی ہیں ...... ٹھونٹھ رہ جاتا ہے۔ ننھی کے چہرے پر سے بھی نہ جانے کتنی معصوم پنکھڑیاں جھڑ گئیں۔ چہرے پر پھٹکار اور روڑا پن۔ ننھی بچی سے لڑکی نہیں بلکہ چھلانگ مار کر ایک دم عورت بن گئی۔ وہ قدرت کے مشاق ہاتھوں کی سنواری بھرپور عورت نہیں بلکہ ٹیڑھی میڑھی عورت جس پر کسی دیونے دو گز لمبا پاؤں رکھ دیا ہو۔ ٹھنگنی۔ موٹی۔ کچوراسی جیسے کچی مٹی کا کھلونا کمہار کے گھٹنے

> خواجہ احمد عباس مرد یا سماج کو دنیا کی ہر بلا کا ذمہ دار ٹھہرا کر اُن کے پیچھے ڈنڈا لے کر پھرنے کا قائل نہیں۔ وہ اصلی دشمن کو عرصہ ہوا، پہچان چکا ہے۔ نہ مرد بے وفا اور ظالم ہے، نہ عورت ناقص العقل۔ دال چاول بے وفا ہیں۔ گھی دغاباز ہے۔ کوئلے چال باز ہیں، اور وہ جن کے پاس رزق کی کنجی ہے، سب سے زیادہ ناقص العقل اور بے رحم معشوق ہیں۔ — عصمت چغتائی

تلے دب گیا ہو۔

میل صافی سے کوئی ناک پونچھے چاہے کولہے، کون پوچھتا ہے۔ راہ چلتے اُس کے چٹکیاں بھرتے، مٹھائی کے دونے پکڑاتے، ننھی کی آنکھوں میں شیطان تھرک اٹھتا...... مگر اب نانی بجائے اُسے حلوے مانڈے ٹھسانے کے اُس کا دھوبی گھاٹ کرتی، مگر میل صافی کی دھول بھی نہ جھڑتی۔ جانو، ربڑ کی گیند ٹپا کھایا اور اُچھل گئی۔

چند سال ہی میں ننھی کی چوکڑی سے محلہ لرز اٹھا۔ سا کہ ڈپٹی صاحب اور صاحبزادے میں کچھ تن گئی۔ پھر سنا مسجد کے ملا جی کو زچوا کھمار نے مارتے مارتے چھوڑا۔ پھر سنا صدیقی پہلوان کا بھانجہ مستقل ہو گیا۔

آئے دن ننھی کی ناک کٹتے کٹتے بچتی اور گلیوں میں لٹھ پونگا ہوتا۔

اور پھر ننھی کے تلوے جلنے لگے۔ پیر دھونے کی رتی بھر جگہ نہ رہی۔ صدیقی پہلوان کے بھانجے کی پہلوانی اور ننھی کی جوانی نے محلہ والوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ سنتے ہیں دِلّی، بمبئی میں اس مال کی تھوک میں کھپت ہے۔ شاید دونوں وہیں چلے گئے۔

جس دن ننھی بھاگی اس دن نانی کے فرشتوں کو بھی شبہ نہ ہوا۔ دو تین دن سے نگوڑی چپ چپ سی تھی۔ نانی سے بدزبانی بھی نہ کی۔ چپ چاپ آپ ہی آپ بیٹھی ہوا میں گھورا کرتی۔

"اے ننھی روٹی کھا لے۔" نانی کہتی۔

"نانی بی بھوک نہیں!"

"اے ننھی اب دیر ہو گئی سو جا۔"

"نانی بی نیند نہیں آتی۔"

رات کو نانی کے پیر دبانے لگی۔

"نانی بی...... اے نانی بی "سبحانک اللّٰھم" سُن لو یاد ہے کہ نہیں۔ نانی نے سُنا فرفر یاد!"

"جا بیٹی اب سو جا۔" نانی نے کروٹ لے لی۔

"اری مرتی کیوں نہیں۔" نانی نے تھوڑی دیر بعد اُسے صحن میں کھٹ پٹ کرتے سُن کر کہا۔ "کبھی خانگی نے اب آنگن بھی پلید کرنا شروع کیا۔ کون حرامی ہے جسے آج گھر میں گھسا لائی ہے۔" پر صحن میں گھور گھور کر دیکھنے پر نانی سہم کر رہ گئی۔ ننھی عشاء کی نماز پڑھ رہی تھی اور صبح ننھی غائب ہو گئی۔

کبھی کوئی دور دیس سے آتا ہے تو خبر آ جاتی ہے کوئی کہتا ہے ننھی کو ایک بڑے نواب صاحب نے ڈال لیا ہے تم تم ہے۔ منوں سونا ہے۔ بیگموں کی طرح رہتی ہے۔

کوئی کہتا ہے، ہیرا منڈی میں دیکھا تھا۔

کوئی کہتا ہے فارس روڈ پر کسی نے اُسے سوناگاچی میں دیکھا۔

مگر نانی کہتی ہے ننھی کو ہیضہ ہوا تھا۔ چار گھڑی لوٹ پوٹ کر مر گئی۔

ننھی کا سوگ منانے کے بعد نانی کچھ خبطن بھی ہو گئیں۔ لوگ راہ چلتے چھیڑ خانی کرتے۔

"اے نانی نکاح کر لو......" بھابی جان چھیڑتیں۔

"کس سے کلّوں؟ لا اپنے خصم سے کرا دے۔" نانی بگڑتیں۔

"اے نانی ملا جی سے کر لو۔ اللہ قسم تم پر جان دیتے ہیں۔" اور نانی کی مغلظات شروع ہو جاتیں۔ وہ وہ پینترے گالیوں میں نکالتیں کہ لوگ بھونچکے رہ جاتے۔

"مل تو جائے بھڑوا...... ڈاڑھی نہ اکھیڑلوں تو کہنا۔" مگر جب ملا جی کبھی گلی کُوچے میں مل جاتے تو نانی سچ مچ شرما

سی جاتیں۔

علاوہ محلے کے لڑکوں بالوں کے نانی کے ازلی دشمن تو موئے نگوڑے بندر تھے جو پیڑھیوں سے اسی محلے میں پلتے بڑھتے آئے تھے۔ جو ہر فرد کا کچا کٹھا جانتے تھے۔ مرد خطرناک ہوتے ہیں اور بچے بدذات مگر عورتیں تو صرف ڈرپوک ہوتی ہیں۔ پر نانی بھی انھیں بندروں میں پل کر بڑھیا ہوئی تھیں۔ انھوں نے بندروں کو ڈرانے کے لیے کسی بچے کی غلیل ہتھیائی تھی۔ اور سر پہ برقعہ کا گپڑ باندھ کر وہ غلیل تان کر جب اچکتیں تو بندر تھوڑی دیر کو ششدر ضرور رہ جاتے اور پھر بے توجہی سے ٹہلنے لگتے۔

اور بندروں سے آئے دن ان کی باسی ٹکڑوں پر چخ چلتی رہتی۔ محلے میں جہاں کہیں شادی بیاہ چھلّا چالیسواں ہوتا، نانی جھوٹے ٹکڑوں کا ٹھیکہ لے لیتیں۔ نذر خیرات بٹتی تو بھی چار چار مرتبہ جھگڑ کے حصہ لیتیں۔ منوں کھانا بٹور لانے کے بعد وہ اُسے حسرت سے تکتیں! کاش ان کے پیٹ میں بھی اللہ پاک نے کچھ اونٹ جیسا انتظام کیا ہوتا تو کتنے مزے رہتے۔ مزے سے چار دن کی خوراک معدے میں بھر لیتیں چھٹی ہوتی۔ مگر اللہ پاک نے رزق کا اتنا اوٹ پٹانگ انتظام کرنے کے بعد پیٹ کی مشین کیوں اس قدر ناقص بنا ڈالی کہ ایک دو وقت کے کھانے سے زیادہ ذخیرہ جمع کرنے کا ٹھور ٹھکانا نہیں۔ اس لیے نانی ٹاٹ کے بسیروں پر جھوٹے ٹکڑے پھیلا کر سکھاتیں پھر انھیں مٹکوں میں بھر لیتیں۔ جب بھوک لگی ذرا سے سوکھے ٹکڑے چور مُر کئے پانی کا چھینٹا دیا چٹکی بھر نون مرچ بُرکا اور لذیذ ملغوبہ تیار۔ لیکن گرمیوں اور برسات کے دنوں میں بارہا یہ نسخہ اُن پر ہیضہ طاری کر چکا تھا۔ چنانچہ لبی جانے پر طوعاً کرہاً اُن ٹکڑوں کو اونے پونے بیچ ڈالتیں تاکہ لوگ اپنے کتوں اور بکریوں وغیرہ کو کھلاویں۔ مگر عموماً کتوں اور بکریوں کے معدے نانی کے ڈھیٹ معدے کا مقابلہ نہ کر پاتے اور لوگ مول تو کیا تحفتہً بھی ان فواکہات کو قبولنے پر تیار نہ ہوتے۔ وہی عزیز

خواجہ احمد عباس

باچھو، ڈھیر ساری بہنوں کا اکلوتا بھائی۔ اپنی نسل کا واحد ساربان جو بے عیب، نہایت معمولی مگر چکنی مٹی کا بنا ہوا ہے۔ عجیب چوں چوں کا مربہ ہے۔ آدمی کیا، پنجشاخہ ہے۔ ایک طرف تو ایسا کٹر ہے کہ شراب نہیں پیتا۔ سگرٹ جلاتا ہے مگر دھواں پھیپھڑوں تک نہیں کھینچتا۔ پان تمباکو سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ فلیش کھیلتا ہے، مگر بے دلی سے صرف لنگروں کا ساتھ دینے کے لئے۔ پینے پلانے کی دعوتوں میں بیٹھا بور ہوا کرتا ہے۔

عصمت چغتائی۔ ”باچھو“

از جان جوٹھے ٹکڑے۔ جنھیں بٹورنے کے لیے نانی کو ہزاروں صلواتیں اور ٹھوکریں سہنا پڑتیں اور جنھیں دھوپ میں سکھانے کے لیے انھیں پوری بندر جاتی سے جہاد مول لینا پڑتا۔ جہاں ٹکڑے پھیلائے گئے اور بندروں کے قبیلے کو بے تار برقی خبر پہنچی۔ اب کیا ہے غول در غول دیواروں پر ڈٹے بیٹھے ہیں۔ کھپریلوں پر دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔ چھپّر کھسوٹ رہے ہیں اور آتے جاتے پہ خوخیا رہے ہیں۔ نانی بھی اس وقت مردِ میدان بنی سر پہ برقعہ کا ڈھاٹا باندھے ہاتھ میں غلیل لیے مورچہ پر ڈٹ جاتیں۔ سارا دن ”لگے۔ لگے“ کر کے شام کو بچا کھچا کوڑا بٹور بندروں کی جان کو کوستی نانی اپنی کوٹھری میں تھک کر سو رہتیں۔

بندروں کو اُن سے کچھ ذاتی قسم کی پرخاش ہو گئی تھی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو کیوں جہان بھر کی نعمتوں کو چھوڑ کر صرف نانی کے ٹکڑوں پر ہی حملہ آور ہوتے اور کیوں بدذات لال بھبھوکے والا ان ہی کا عزیز از جان تکیہ لے بھاگتا۔ وہ تکیہ جو نانی کے بعد

گوشت کے پُتلے

عصمت اپنی تخلیقات میں کوئی معیاری ہستیاں پیش نہیں کرتیں۔ وہ محض گوشت اور خون کے پتلے ہمارے سامنے لا کھڑے کرتی ہیں جن میں محاسن و معائب کا ویسا ہی قدرتی امتزاج ہوتا ہے اور کمزوریوں اور خوبیوں کی ویسی ہی نفسیاتی ترکیب پائی جاتی ہے جیسی حقیقی دنیا میں دیکھنے والوں کو قدم قدم پر ملتی ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد

نانی کا واحد عزیز اور پیارا دنیا میں رہ گیا تھا وہ تکیہ جو برقعہ کے ساتھ اُن کی جان پر ہمیشہ سوار رہتا تھا۔ جس کی سیونوں کو وہ ہر وقت پکا "ٹانکہ" مارتی رہتی تھیں۔ بارہا نانی کسی کونے کھدرے میں بیٹھی تکیے سے ایسے کھیلا کرتیں جیسے وہ ننھی سی بچی ہوں اور وہ تکیہ اُن کی گڑیا۔ وہ اپنے سارے دکھ اُس تکیے ہی سے کہہ کر جی ہلکا کر لیا کرتی تھیں۔ جتنا جتنا انھیں تکیہ پر لاڈ آتا وہ اس کے ٹانکے پکے کرتی جاتیں۔

قسمت کے کھیل دیکھئے نانی منڈیر سے لگی بوتھ کی آڑ میں تینوں سے جوئیں چن رہی تھیں کہ بندر دھم سے کودا اور تکیہ لے یہ جا وہ جا۔ ایسا معلوم ہوا کوئی نانی کا کلیجہ نوچ کر لے گیا۔ وہ دھاڑیں اور چلائیں کہ سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔

بندروں کا قاعدہ ہے کہ آنکھ بچی اور کٹورا گلاس لے بھاگے اور چھجے پر بیٹھے دونوں ہاتھوں سے کٹورا دیوار پر گھس رہے ہیں۔ کٹورے کا مالک نیچے کھڑا چمکار رہا ہے۔ پیاز دے روٹی دے جب بندر میاں کا پیٹ بھر گیا کٹورا پھینک اپنی راہ لی۔ نانی نے مٹھی بھر ٹکڑے لا دیئے پر حرامی بندر نے تکیہ نہ چھوڑنا تھا نہ چھوڑا۔ سو جتن کئے گئے مگر اُس کا جی نہ پگھلا اور اُس نے مزے سے تکیہ کے غلاف پیاز کے چھلکوں کی طرح اتارنے شروع کئے۔ دبی غلاف جنھیں نانی نے چندھی آنکھوں سے گھور گھور کر پکے ٹانکوں سے گونتھا تھا۔ جوں جوں غلاف اترتے جاتے نانی کی بدحواسی اور بلبلاہٹ میں زیادتی ہوتی جاتی اور آخری غلاف بھی اتر گیا۔ اور بندر نے ایک ایک کرکے چھجے پر سے ٹپکانا شروع کئے۔ روئی کے گلے نہیں بلکہ شبن کی نقتوئی۔ جو ستھے کا انگوچھا ... جیبنہ بی کی انگیا...... منی بی کی گڑیا کا غرارہ۔ رحمت کی اوڑھنی اور خیراتی کا چھتا......

خیرن کے لونڈے کا فلیچر ..... منشی جی کا مغلر اور ابراہیم کی قمیض کی آستین مع کف!

صدیق کی تہمد کا ٹکڑا۔ آمنہ بی کی سرمہ دانی اور لفافس کی کجلوٹی۔ سکینہ بی کی افشاں کی ڈبیہ ۔۔۔ ملاجی کی تسبیح کا امام اور باقر میاں کی سجدہ گاہ۔

بسم اللہ کا سوکھا ہرا نال اور کلاوہ میں بندھی ہوئی ننھی کی پہلی سالگرہ کی ہلدی کی گانٹھ، دوب اور چاندی کا چھلا۔ اور بشیر خاں کا گلٹ کا تمغہ جو اُسے جنگ سے زندہ لوٹ آنے پر سرکارِ عالیہ سے ملا تھا۔

مگر کسی نے ان چیزوں کو نہ دیکھا۔ بس دیکھا تو اُس چوری کے مال کو جسے سالہا سال کی چھاپہ ماری کے بعد نانی نے مکھ لوٹ جوڑا تھا۔

"چور ۔۔۔ بے ایمان ..... کمینی۔"

"نکالو بڑھیا کو محلے سے۔"

"پولیس میں دے دو۔"

"ارے اس کی تو شک بھی کھولو اس میں نہ جانے کیا کیا ہو گا۔" غرض جو جس کے منہ میں آیا کہہ گیا۔

نانی کی چیخیں ایک دم رُک گئیں۔ آنسو خشک۔ سر نیچا اور زبان گنگ! کاٹو تو خون نہیں۔ رات بھی جوں کی توں دو توں گھٹنے مٹھیوں میں دابے بل بل کر سوکھی سوکھی ہچکیاں لیتی رہیں کبھی اپنے ماں باپ کا نام لے کر کبھی میاں کو یاد کرکے کبھی بسم اللہ اور ننھی کو پکار کر بَین کرتیں ...... دم بھر کو اونگھ جاتی پھر جیسے

پرانے ناسوروں میں پھونٹے چٹخنے لگتے اور وہ بلبلا کر چونک اٹھتیں، کبھی جھکی پھکی روتیں کبھی خود سے باتیں کرنے لگتیں، پھر آپ ہی آپ مسکرا اٹھتیں اور پھر تاریکی میں سے کوئی پرانی یاد کا بھالا کھینچ مارتا اور وہ بیمار کتے کی طرح نیم انسانی آواز سے سارے محلے کو چونکا دیتیں۔ دو دن اسی حالت میں بیت گئے محلہ والوں کو آہستہ آہستہ احساس ندامت ہونا شروع ہوا۔ کسی کو بھی تو ان چیزوں کی اشد ضرورت نہ تھی۔ برسوں کی کھوئی چیزوں کو کبھی کا رو پیٹ کر بھول چکے تھے۔ وہ بچارے خود کون سے لکھ پتی تھے۔ تنکے کا بوجھ بھی ایسے موقع پر انسان کو شہتیر کی طرح لگتا ہے۔ لوگ ان چیزوں کے بغیر زندہ تھے۔ شبن کی فتوی آپ سردیوں سے دھینگا مشتی کرنے کے قابل کہاں تھی، وہ اُس کے ملنے کے انتظار میں اپنی بڑھوار تھوڑی روک بیٹھا تھا۔ حسینہ بی نے انگیا چولی کی اہمیت کو بیکار سمجھ کر اُسے خیرباد کہہ دیا تھا۔ منی کی گڑیا کا غرارہ کس مصرف کا وہ تو کبھی کی گڑیوں کی عمر سے گزر کر ہنڈکلیوں کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ محلے والوں کو نانی کی جان لینا تھوڑی منظور تھی۔

پرانے زمانہ میں ایک دیو تھا۔ اُس دیو کی جان تھی ایک بھونرے میں، سات سمندر پار ایک غار میں ایک صندوق تھا۔ اُس صندوق میں ایک صندوق اور اُس صندوق میں ایک ڈبیہ تھی جس میں ایک بھونرا تھا۔ ایک بہادر شہزادہ آیا...... اور اُس نے پہلے بھونرے کی ایک ٹانگ توڑ دی، اُدھر دیو کی ایک ٹانگ جادو کے زور سے ٹوٹ گئی پھر اُس نے دوسری ٹانگ توڑی اور دیو کی دوسری ٹانگ بھی ٹوٹ گئی پھر اُس نے بھونرے کو مسل ڈالا اور دیو مر گیا۔

نانی کی جان بھی تکیہ میں تھی اور بندر نے وہ جادو کا تکیہ دانتوں سے چیر ڈالا۔ اور نانی کے کلیجے میں گرم سلاخ اُتر گئی۔

دنیا کا کوئی دکھ کوئی ذلّت کوئی بدنامی ایسی نہ تھی جو نصیب نے نانی کو نہ بخشی ہو۔ جب سہاگ کی چوڑیوں پر پتھر گرا تھا تو سمجھی تھیں اب کوئی دن کی مہمان ہیں پر جب بسم اللہ کو کفن پہنانے لگیں تو یقین ہو گیا کہ اونٹ کی پیٹھ پہ یہ آخری تنکا ہے اور جب ننھی منہ پر کالکھ لگا گئی تو نانی سمجھیں لبس یہ آخری گھاؤ ہے۔

زمانہ بھر کی بیمار بال، پیدائش کے وقت سے جیسیں سات بار تو چیچک نے اُن کی صورت پہ جھاڑو پھیری۔ ہر سال تیج تہوار کے موقع پر ہیضہ کا حملہ ہوتا۔

تیرا میرا گو موت دھوتے دھوتے انگلیوں کے پورے سڑ گئے۔ برتن مانجھتے ہتھیلیاں چھلنی ہو گئیں۔ ہر سال اندھیرے اُجالے اونچی نیچی سیڑھیوں سے لڑھک پڑتیں۔ دو چار دن لوٹ پوٹ کر پھر گھٹنے لگتیں۔ پچھلے جنم میں نانی ضرور کتے کی کلّی رہی ہوں گی۔ جبھی تو اتنی سخت جان تھیں۔ موت کا کیا واسطہ جو اُن کے قریب پھٹک جائے۔ لبیریاں لگائے پھریں گی مگر مردہ کا کپڑا اُن سے نہ چھو جائے۔ کبھی مرنے والا سلوٹوں میں موت نہ چھپا گیا ہو جو نانی کی پالی نانی کو آن دبوچے۔ مگر یوں عاقبت بندروں کے ہاتھوں لٹے گی اُس کی کسے خبر تھی۔ صبح سویرے بہشتی مشک ڈالنے گیا تو دیکھا نانی کھیرل کی سیڑھیوں پر اکڑوں بیٹھی ہیں منہ کھلا ہے۔ مکھیاں نیم وا آنکھوں کے کونوں میں گھس رہی ہیں۔ یوں نانی کو سوتا دیکھ کر لوگ انھیں مردہ سمجھ کر ڈر جایا کرتے تھے۔ مگر نانی ہمیشہ بڑ بڑا کر بلغم تھوکتی جاگ پڑتی تھیں اور ہنسنے والے کو ہزار صلواتیں سناڈالتی تھیں مگر اُس دن سیڑھیوں پہ اکڑوں بیٹھی ہوئی نانی دنیا کو ایک منتقل گالی دے کر چل بسیں۔ زندگی میں کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ کروٹ کروٹ کانٹے تھے۔ مرنے کے بعد کفن میں بھی نانی اکڑوں لٹائی گئی۔ ہزار کھینچ تان پر بھی اکڑا ہوا جسم سیدھا نہ ہوا۔

دو ہاتھ

رام اوتار خاکروب کی ماں کو آپیٹ بھرنے کے لئے دو ہاتھوں کی ضرورت تھی۔ دنیا خواہ کچھ بھی کہے

رام اوتار لام پر سے واپس آرہا تھا۔ بوڑھی مہترانی ابا میاں سے چٹھی پڑھوانے آئی تھی۔ رام اوتار کو چھٹی مل گئی۔ جنگ ختم ہوگئی تھی نا! اس لئے رام اوتار تین سال بعد واپس آرہا تھا۔ بوڑھی مہترانی کی چیپڑ بھری آنکھوں میں آنسو ٹمٹما رہے تھے۔ مارے شکر گزاری کے وہ دوڑ دوڑ کر سب کے پاؤں چھو رہی تھی۔ جیسے ان پیروں کے مالکوں نے ہی اس کا اکلوتا پوت لام سے زندہ سلامت منگوا لیا۔

بڑھیا پچاس برس کی ہوگی، پر ستر کی معلوم ہوتی تھی۔ دس بارہ کچے پکے بچے جنے اُن میں سے بس رام اوتار ہی بڑی منتوں، مرادوں سے جیا تھا۔ ابھی اس کی شادی رچائے سال بھر بھی نہیں بیتا تھا کہ رام اوتار کی پکار آگئی۔ مہترانی نے بہت واویلا مچائی مگر کچھ نہ چلی اور جب رام اوتار وردی پہن کر آخری بار اس کے پیر چھونے آیا تو اس کی شان و شوکت سے بے انتہا مرعوب ہوئی جیسے وہ کرنل ہی تو ہو گیا تھا۔

شاگرد پیشے میں نوکر مسکرا رہے تھے۔ رام اوتار کے آنے کے بعد جو ڈرامہ ہونے کی امید تھی سب اسی پہ آس لگائے بیٹھے تھے۔ حالانکہ رام اوتار لام پر توپ بندوق چھوڑنے نہیں گیا تھا۔ پھر بھی سپاہیوں کا میل اٹھاتے اٹھاتے اس میں کچھ سپاہیانہ آن بان اور اکڑ پیدا ہو گئی ہوگی۔ بھوری وردی ڈانٹ کر وہ پرانا رام اوتر وا واقعی نہ رہا ہوگا۔ ناممکن ہے وہ گوری کے کرتوت گنے اور اس کا جوان خون ہتک سے کھول نہ اٹھے۔

بیاہ کر آئی ہے تو کیا مسمسی تھی گوری۔ جب تک رام اوتار رہا اس کا گھونگھٹ فٹ بھر لمبا رہا اور کسی نے اس کے رُخ پر نور کا جلوہ نہ دیکھا جب خصم گیا تو گیا بلک بلک کر رو دی تھی۔ جیسے اس کی مانگ کا سیندور ہمیشہ کے لئے اڑ رہا ہو۔ تھوڑے دن روئی روئی آنکھیں لئے سر جھکائے میلے کی ٹوکری ڈھوتی پھری۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے گھونگھٹ کی لمبائی کم ہونے لگی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے یہ سارا بسنت رت کا کیا دھرا ہے۔ کچھ صاف گو کہتے تھے۔ گوری تھی ہی چھنال۔ رام اوتار کے جاتے ہی قیامت ہو گئی۔ کمبخت ہر وقت ہی ہی۔ ہر وقت اٹھلانا۔ کمر پہ میلے کی ٹوکری لے کر کانسے کے کڑے چھنکاتی جدھر سے نکل جاتی لوگ

بدحواس ہو جاتے۔ دھوبی کے ہاتھ سے صابن کی بٹی پھسل کر حوض میں گر جاتی۔ باورچی کی نظر توے پر سلگتی ہوئی روٹی سے اُچٹ جاتی۔ بہشتی کا ڈول کنوئیں میں ڈوبتا ہی چلا جاتا۔ چپراسیوں تک کی بلا لگی پگڑیاں ڈھیلی ہو کر گردن میں جھولنے لگتی اور جب یہ سراپا قیامت گھونگھٹ میں سے بان پھینکتی گذر جاتی تو پورا شاگرد پیشہ ایک بے جان لاش کی طرح سکتے میں رہ جاتا۔ پھر ایک دم چونک کر وہ ایک دوسرے کی درگت پر طعنہ زنی کرنے لگتے۔ دھوبن مارے غصّے کے کلف کی کونڈی لوٹ دیتی۔ چپراسن چھاتی سے چمٹے لونڈے کے بے بات زحمو کے جڑنے لگتی۔ اور باورچی کی تیسری بیوی پر ہسٹریا کا دورہ پڑ جاتا۔

نام کی گوری تھی۔ پر کمبخت سیاہ بہت تھی جیسے الٹے توے پر کسی پھاوڑیا نے پراٹھے تل کر چمکتا ہوا چھوڑ دیا ہو۔ چوڑی پھکنا سی ناک، پھیلا ہوا دہانہ دانت مانجھنے کا اس کی سات پشت نے فیشن ہی چھوڑ دیا تھا۔ آنکھوں میں پلیوں کا جل تھوپنے کے بعد بھی داہنی آنکھ کا بھینگاپن اوجھل نہ ہو سکا پھر بھی ٹیڑھی آنکھ سے نہ جانے کیسے زہر میں بجھے تیر پھینکتی تھی کر نشانے پر بیٹھ ہی جاتے تھے۔ کمر بھی لچک دار نہ تھی۔ خاصی گٹھلا سی تھی۔ جھوٹن کھا کھا کر دنبہ ہو رہی تھی۔ چوڑے بھینس کے سے کھُر۔ جدھر سے نکل جاتی۔ کڑوے تیل کی سڑاند چھوڑ جاتی۔ ہاں آواز میں بلا کی کوک تھی۔ تیج تیوہار پر لہک کر کجریاں گاتی تو اس کی آواز سب سے اونچی لہراتی چلی جاتی۔

بڑھیا مہترانی یعنی اس کی ساس بیٹے کے جاتے ہی اس سے بے طرح بدگمان ہو گئی۔ بیٹھے بٹھائے احتیاطاً گالیاں دے دیتی اس پر نظر رکھنے کے لئے پیچھے پیچھے پھرتی۔ مگر بڑھیا اب ٹوٹ چکی تھی۔ چالیس برس میلا ڈھونے سے اس کی کمر مستقل طور پر ایک طرف لچک کر دہیں ختم ہو گئی تھی۔ ہماری پرانی مہترانی تھی۔ ہم لوگوں کے آنول نال اسی نے گاڑے تھے۔ جونہی اماں کے درد لگتے مہترانی دہلیز پر آ کر بیٹھ جاتی اور بعض وقت لیڈی ڈاکٹر تک کو نہائت مفید ہدایتیں دیتی بلائیات کو دفع کرنے کے لئے کچھ منتر تعویذ بھی لا کر پٹی سے باندھ دیتی مہترانی کی گھر میں خاصی بزرگانہ حیثیت تھی۔

اتنی لاڈلی مہترانی کی بہو یکایک لوگوں کی آنکھوں میں کانٹا بن گئی۔ چپراسن اور باورچن کی تو اور بات تھی۔ ہماری اچھی بھلی بھاوجوں کا ماتھا اسے اٹھلاتے دیکھ کر ٹھنک جاتا۔ اگر وہ اس کمرے میں جھاڑو دینے جاتی جس میں ان کے میاں ہوتے تو وہ ہڑبڑا کر دودھ پیتے بچے کے منہ سے چھاتی چھین کر بھاگتیں کہ کہیں وہ ڈائن ان کے شوہروں پہ ٹونا ٹوٹکا نہ کر رہی ہو۔

گوری کیا تھی۔ بس ایک مرکنا لمبے لمبے سینگوں والا بجار تھا کہ چھوٹا پھرتا تھا۔ لوگ اپنے کانچ کے برتن بھانڈے دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر کلیجے سے لگاتے اور جب حالات نے نازک صورت پکڑ لی تو شاگرد پیشے کی مہیلاؤں کا ایک باقاعدہ وفد اماں کے دربار میں حاضر ہوا۔ بڑے زور شور سے خطرہ اور اس کے خوفناک نتائج پر بحث ہوئی۔ پتی رکھشا کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں سب بھاوجوں نے شد و مد سے ووٹ دیئے اور اماں کو صدر اعزازی کا عہدہ سونپا گیا، ساری خواتین حسب مراتب زمین، پیڑھیوں اور پلنگ کی ادوائن پر بیٹھیں۔ پان کے ٹکڑے تقسیم ہوئے اور بڑھیا کو بلایا گیا۔ نہائت اطمینان سے بچوں کے منہ میں دودھ دے کر سبھا میں خاموشی

قائم کی گئی، اور مقدمہ پیش ہوا۔

"کیوں ری چڑیل، تونے بہو قطامہ کو چھوٹ دے رکھی ہے کہ ہماری چھاتیوں پہ کودوں دلے۔ ارادہ کیا ہے تیرا، کیا منہ کالا کرائے گی؟"

مہترانی تو بھری ہی بیٹھی تھی، پھوٹ پڑی —

"کیا کروں، بیگم صاحب حرام خور کو چار چوٹ کی مار بھی دے لے تو۔ روٹی بھی کھانے کو نا دیئے۔ پہ رانڈ میرے تو بس کی نہیں۔"

"اسے روٹی کی کیا کمی ہے اُسے" باورچن نے اینٹھا پھینکا۔ سہارن پور کی خاندانی باورچن اور پھر تیسری بیوی — کیا تیہا تھا کہ اللہ کی پناہ۔ پھر چپراسن مالن اور دھوبن نے مقدمہ کو اور سنگین بنا دیا۔ بیچاری مہترانی بیٹھی سب کی لتاڑ سنتی اور اپنی خارش زدہ پنڈلیاں کھجلاتی رہی۔

"بیگم صاحب آپ جیسی تباؤ دیسے کرتے سے ہوئے نا تھوڑی یہ کیا کروں کا رانڈ کا ٹینٹوا دبائے دیوں۔ یہ"

ٹینٹوا دبنے کے حسین خیال سے محیلوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور سب کو بڑھیا سے بے انتہا ہمدردی پیدا ہو گئی۔

اماں نے رائے دی — "موئی کو میکے پھنکوا دے"

"اے بیگم صاحب! کہیں ایسا ہو سکے ہے؟" مہترانی نے بتایا کہ بہو مفت ہاتھ نہیں آئی ہے۔ ساری عمر کی کمائی پورے دو سو جھونکے ہیں تب مسٹنڈی ہاتھ آئی ہے۔ اتنے پیسوں میں تو دو گائیں آجاتیں۔ مزے سے بھر کلی دودھ دیتیں۔ پہ یہ رانڈ تو دولتیاں ہی دیتی ہے اگر اسے میکے بھیج دیا گیا تو اس کا باپ اسے فوراً دوسرے مہتر کے ہاتھ بیچ دے گا۔ بہو صرف بیٹے کے بستر کی زینت ہی تو نہیں، دو ہاتھوں والی ہے پر

چار آدمیوں کا کام نپٹاتی ہے۔ رام اوتار کے جانے کے بعد بڑھیا سے اتنا کام کیا سنبھلتا۔ یہ بڑھاپا تو اب بہو کے دو ہاتھوں کے صدقے میں بیت رہا ہے۔

محیلیں کوئی ناسمجھ نہ تھیں۔ معاملہ اخلاقیات سے ہٹ کر اقتصادیات پر آ گیا تھا۔ واقعی بہو کا وجود بڑھیا کے لئے لازمی تھا۔ دو سو روپے کا مال کس کا دل ہے کر پھینک دے۔ ان دو سو کے علاوہ بیاہ پر جوتے سے لے کر خرچ کیا تھا۔ ججمان کھلائے تھے۔ برادری کو راضی کیا تھا یہ سارا خرچہ کہاں سے آئے گا۔ رام اوتار کی جو تنخواہ ملتی تھی وہ ساری ادھار میں ڈوب جاتی تھی۔ ایسی موٹی تازی بہو اب تو چار سو سے کم میں نہ ملے گی۔ پوری کوٹھی کی صفائی کے بعد اور آس پاس کی چار کوٹھیاں نمٹاتی ہے۔ رانڈ کام میں چوکس ہے ویسے۔

پھر بھی اماں نے الٹی میٹم دے دیا کہ "اگر اس لچی کا جلد از جلد کوئی انتظام نہ کیا گیا تو کوٹھی کے احاطہ میں نہیں رہنے دیا جائے گا۔"

بڑھیا نے بہت واویلا مچائی اور جا کر بہو کو منہ بھر کر گالیاں دیں۔ جھونٹے پکڑ کر مارا پیٹا بھی۔ بہو اس کی زر خرید تھی پٹتی رہی۔ بڑبڑاتی رہی اور دوسرے دن انتقاماً سارے محلے کی دھجیاں بکھیر دیں۔ باورچی، بہشتی، دھوبی اور چپراسیوں نے تو اپنی بیویوں کی مرمت کی۔ یہاں تک کہ بہو کے معاملہ پر میری مہذب بھابیوں اور شریف بھائیوں میں بھی کھٹ پٹ ہو گئی اور بھابیوں کے میکے تار جانے لگے۔ غرض بہو ہمارے خاندان کے لئے سوئی کا کانٹا بن گئی۔

مگر دو چار دن کے بعد بوڑھی مہترانی کے دیور کا لڑکا رام رتی اپنی تائی سے ملنے آیا۔ اور پھر وہیں رہ پڑا۔ دو چار کوٹھیوں میں کام بڑھ گیا تھا سو وہ بھی

اس نے سنبھال لیا۔ اپنے گاؤں میں آوارہ ہی تو گھومتا تھا۔ اس کی بہو ابھی نابالغ تھی۔ اس لیے گونا نہیں ہوا تھا۔

رتی رام کے آتے ہی موسم ایک دم لوٹ پوٹ کر بالکل ہی بدل گیا جیسے گھنگھور گھٹائیں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ تتر بتر ہو گئیں۔ بہو کے قہقہے خاموش ہو گئے۔ کانسے کے کڑے گونگے ہو گئے ۲ د جیسے غبارے سے ہوا نکل جائے تو وہ چپ چاپ جھولنے لگتا ہے۔ ایسے بہو کا گھونگھٹ جھولتے جھولتے نیچے کی طرف بڑھنے لگا۔ اب وہ بجائے بے تھتے بیل کے نہایت شرمیلی بہو بن گئی۔ جملہ مہیلاؤں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسٹاف کے مردوں سے اُسے چھیڑتے بھی تو وہ چھوئی موئی کی طرح لجا جاتی اور زیادہ آنکھ دکھاتے تو وہ گھونگھٹ میں سے بھیگی آنکھ کو اور ترچھا کر کے رتی رام کی طرف دیکھتی جو فوراً باز دکھلا۔ متے آکر ڈٹ جاتا۔ بڑھیا پرسکون انداز میں دہلیز پر ادھ کھلی آنکھوں سے یہ طربیہ ڈرامہ دیکھتی اور گڑگڑی پیا کرتی۔ چاروں طرف ٹھنڈا ٹھنڈا سکون چھا گیا جیسے پھوڑے کا مواد نکل گیا ہو۔

مگر اب کے بہو کے خلاف ایک نیا محاذ قائم ہو گیا اور وہ حملے کی مہر جاتی پر مشتمل تھا۔ بات یہ بات باورچی جو اسے پراٹھے تل کر دیا کرتا تھا کونڈی صاف نہ کرنے پر گالیاں دینا۔ دھوبی کو شکایت تھی کہ وہ کلف لگا کر کپڑے رسی پر ڈالتا ہے۔ یہ حرام زادی خاک اڑانے آ جاتی ہے۔ جیپراسی مردانے میں دس دس مرتبہ جھاڑو دلوا کے پھر بھی وہاں کی غلاظت کا رونا روئے رہتے۔ بہشتی جو اس کے ہاتھ دھلانے کے لیے کئی سکیں لیے تیار رہتا تھا اب گھنٹوں صحن میں چھڑکاؤ کرنے کو کہتی مگر ٹالتا رہتا۔ تاکہ وہ سوکھی زمین

> عصمت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح پُر پیچ طور دشوار گزار نظر آتے ہیں۔ مجھے یہ افسانے اُس جوہر سے متشابہ معلوم ہوتے ہیں جو عورت میں ہے۔ اُس کی رُوح میں ہے۔ اُس کے دل میں ہے۔ اُس کے ظاہر میں ہے، اُس کے باطن میں ہے۔ (کرشن چندر)

پر جھاڑو دے تو چپراسی گرد اڑانے کے جرم میں اسے گالیاں دے سکے۔

مگر بہو سر جھکائے سب کی ڈانٹ پھٹکار ایک کان سنتی دوسرے کان اڑا دیتی۔ نہ جانے ساس سے کیا جا کر کہہ دیتی کہ وہ کائیں کائیں کر کے سب کا بھیجا چاٹنے لگتی۔ اب اس کی نظر میں بہو نہایت پارسا اور نیک ہو چکی تھی۔

پھر ایک دن داڑھی والے داروغہ جی جو تمام نوکروں کے سردار تھے اور اباّ کے خاص مشیر سمجھے جاتے تھے۔ اباّ کے حضور میں دست بستہ حاضر ہوئے۔ اور اس بھیانک بدمعاشی اور غلاظت کا رونا رونے لگے۔ جو بہو اور رتی رام کے ناجائز تعلقات سے سارے شاگرد پیشے کو گندہ کر رہی تھی۔ اباّ جی نے معاملہ سیشن سپرد کر دیا۔ یعنی امّاں کو پکڑا دیا۔ مہیلاؤں کی سبھا پھر سے چوڑی اور بڑھیا کو بلا کر اس کے لتے لئے گئے۔ "اری نگوڑی خبر بھی ہے یہ تیری بہو قطامہ کیا گل کھلا رہی ہے؟"

مہترانی نے ایسے چندھرا کر دیکھا جیسے کچھ نہیں سمجھتی غریب کہ کس کا ذکر ہو رہا ہے اور جب اسے صاف صاف بتایا گیا کہ چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ بہو اور رتی رام کے تعلقات نازیبا حد تک خراب ہو چکے ہیں۔ دونوں بہت ہی قابلِ اعتراض حالتوں میں پکڑے گئے ہیں تو اس پہ بڑھیا بجائے اپنی بہتری چاہنے والوں

کا شکریہ ادا کرنے کے بہت چراغ پا ہوئی۔ بڑا واویلا مچانے لگی۔ کہ رام اوتر وا ہوتا تو ان لوگوں کی خبر لیتا۔ جو اس کی معصوم بہو پر تہمت لگاتے ہیں۔ بہو نگوڑی تو اب چپ چاپ رام اوتار کی یاد میں آنسو بہایا کرتی ہے۔ کام کاج بھی جان توڑ کر کرتی ہے۔ کسی کو شکایت نہیں ہوتی۔ ٹھٹھول بھی نہیں کرتی۔ لوگ اس کے ناحق دشمن ہو گئے ہیں۔ بہت سمجھایا مگر وہ ماتم کرنے لگی کہ ساری دنیا اس کی جان کی لاگو ہو گئی ہے۔ آخر بڑھیا اور اس کی معصوم بہو نے لوگوں کا کیا بگاڑا ہے۔ وہ تو کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ وہ تو سب کی رازدار ہے۔ آج تک اس نے کسی کا بھانڈا نہیں پھوڑا اسے کیا ضرورت جو کسی کے پھٹے میں پیر اڑاتی پھرے۔ کو ٹھیوں کے پچھواڑے کیا نہیں ہوتا مہترانی سے کسی کا میلا نہیں چھپتا۔ ان بوڑھے ہاتھوں نے بڑے لوگوں کے گناہ دفن کئے ہیں۔ یہ دو ہاتھ چاہیں تو رانیوں کے تخت الٹ دیں۔ پر نہیں اسے کسی سے بغض نہیں اگر اس کے گلے پر چھری دبائی گئی تو شاید غلطی ہو جائے ویسے وہ کسی کے راز اپنے بوڑھے کلیجے سے باہر نہیں نکلنے دے گی۔

اس کا تیہا دیکھ کر فوراً چھری دبانے والوں کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے ساری چیلیں میں اس کی ٹچ کرنے لگیں۔ بہو کچھ بھی کرتی تھی ان کے اپنے قلعے تو محفوظ تھے تو پھر شکایت کیسی؟ پھر کچھ دن ہوئے بہو کے عشق کا چرچا کم ہونے لگا۔ لوگ کچھ بھولنے لگے مگر تاڑنے والوں نے تاڑ لیا کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ بہو کا بھاری بھرکم جسم بھی دال کے کالے کو زیادہ دن نہ چھپا سکا اور لوگ شدومد سے بڑھیا کو سمجھانے لگے۔ مگر اس نے سموضوع پر بڑھیا بالکل اڑن گھائیاں بتانے لگی۔ بالکل ایسے بن جاتی جیسے ایک دم اونچا سننے لگی ہے۔

اب وہ زیادہ تر کھاٹ پر لیٹی بہو اور راتی رام پر حکم چلایا کرتی۔ کبھی کھانستی چھینکتی باہر دھوپ میں آ بیٹھتی۔ تو وہ دونوں اس کی ایسی دیکھ ریکھ کرتے جیسے وہ کوئی پٹ رانی ہو۔

بھلی بیویوں نے اسے بہت سمجھایا۔ راتی رام کا منہ کالا کر وا دو اس سے پہلے کہ رام اوتار لوٹ کر آئے۔ بہو کا علاج کروا ڈال۔ وہ خود اس فن میں ماہر تھی۔ دو دن میں صفائی ہو سکتی تھی۔ مگر بڑھیا نے کچھ سمجھ کر ہی نہ دیا۔ بالکل ادھر ادھر کی شکایتیں کرنے لگی کہ اس کے گھٹنوں میں پہلے سے زیادہ اینٹھن ہوتی ہے نیز کوٹھیوں میں لوگ بہت ہی زیادہ بادی چیزیں کھانے لگے ہیں۔ کسی نہ کسی کوٹھی میں دست لگے ہی رہتے ہیں۔ اس کی ٹال مٹول پر ناصحین جل کر مرنڈ ہو گئے۔ مانا کہ بہو عورت ذات ہے، نادان ہے، بھولی۔ بڑی بڑی شریف زادیوں سے خطا ہو جاتی ہے لیکن ان کی اعلیٰ خاندان کی معزز ساسیں یوں کان میں تیل ڈال کر نہیں بیٹھ جاتیں۔ پر نہ جانے پر بڑھیا کیوں سٹھیا گئی تھی۔ جس بلا کو وہ بڑی آسانی سے کوٹھی کے کوڑے کی تہہ میں دفن کر سکتی تھی اُسے آنکھیں میچے پلنے دے رہی تھی۔

رام اتر وا سے آنے کا انتظار تھا۔ ہر وقت دھمکیاں تو دیتی رہتی تھی۔

"آن دے رام اتروا کا کہاں گی۔ توری ہڈی پسلی ایک کر دیہے۔" اور اب رام اتروا لام سے زندہ واپس آ رہا تھا۔ فضا نے سانس روک لی تھی۔ لوگ ایک مہیب ہنگامے کے منتظر تھے۔

مگر لوگوں کو سخت کوفت ہوئی۔ جب بہو نے لونڈا جنا۔ بجائے اُسے زہر دینے کے بڑھیا مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں۔ رام اوتار کے جانے کے

دوسال بعد پوتا ہوتے پر قطعی متعجب نہ تھی۔ گھر گھر پیچھے پرانے پڑ گئے، اور بدھائی سمیٹتی پھری اس کا بھلا چاہنے والوں نے اسے حساب لگا کر بہتیرا سمجھایا کہ یہ لونڈا رام اوتار کا ہو ہی نہیں سکتا مگر بڑھیا نے قطعی سمجھ کر نہ دیا۔ اس کا کہنا تھا۔ "اوساڑھ میں رام اوتار لام پہ گیا۔ جب بڑھیا پیلی کوٹھی کے نئے انگریزی وضع کے مہینے میں سنڈاس میں گر پڑی تھی۔ اب چیت لگ رہا ہے اور جیٹھ کے مہینے میں بڑھیا کو لو لگی تھی۔ مگر بال بال بچ گئی تھی۔ جبھی سے اس کے گھٹنوں کا درد بڑھ گیا۔ ور وید جی پورے حرامی ہیں۔ دوا میں کھریا ملا کر دیتے ہیں۔" اس کے بعد وہ بالکل اصل سوال سے ہٹ کر خیلاؤں کی طرح اوّل فول بکنے لگتی۔ کس کے دماغ میں اتنا بوتا تھا کہ وہ بات اس کائیاں بڑھیا کو سمجھاتا جسے نہ سمجھنے کا وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

لونڈا پیدا ہوا تو اس نے رام اوتار کو چٹھی لکھوائی۔ "رام اوتار کو بعد چما پیار کے معلوم ہو کہ یہاں سب کشل ہیں اور تمہاری کشلتا بھگوان سے نیک چاہتے ہیں اور تمہارے گھر میں پوت پیدا ہوا ہے۔ سو تم اس خط کو تار سمجھو اور جلدی سے آجاؤ۔"

لوگ سمجھتے تھے کہ رام اوتار ضرور چراغ پا ہوگا مگر سب کی امیدوں پر اوس پڑ گئی جب رام اوتار کا مسرت سے لبریز خط آیا کہ وہ لونڈے کے لئے موزے اور بنیان لا رہا ہے۔ جنگ ختم ہوگئی اور اب بس وہ آنے ہی والا تھا۔ بڑھیا پوتے کو گھٹنے پر لٹکائے کھاٹ پر بیٹھی راج کیا کرتی۔ بھلا اس سے زیادہ حسین بڑھاپا کیا ہوگا کہ ساری کوٹھیوں کا کام تُرت پھرت ہو رہا ہو مہاجن کا سود پابندی سے چک رہا ہو اور گھٹنے پر پوتا سو رہا ہو۔

خیر لوگوں نے سوچا رام اوتار آئے گا۔ اصلیت معلوم ہوگی تب دیکھ لیا جائے گا اور اب رام اوتار جنگ جیت کر آ رہا تھا۔ آخر کو سپاہی ہے کیوں نہ خون کھولے گا۔ لوگوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ شاگرد پیشے کی فضا جو بہو کی توتا چشمی کی وجہ سے سو گئی تھی۔ دو چار خون ہونے اور ناکیں کٹنے کی آس میں جاگ اٹھی۔

لونڈا سال بھر کا ہوگا۔ جب رام اوتار لوٹا۔ شاگرد پیشے میں کھلبلی مچ گئی۔ باورچی نے ہانڈی میں ڈھیر سا پانی جھونک دیا تاکہ اطمینان سے بیٹھ کا لطف اٹھائے۔ دھوبی نے کلف کا برتن اتار کر منڈیر پر رکھ دیا اور بہشتی نے ڈول کنوئیں کے پاس پٹک دیا۔

رام اوتار کو دیکھتے ہی بڑھیا اس کی کمر سے لپٹ کر چنگھاڑنے لگی مگر دوسرے لمحے کھیسیں کاڑھ کے لونڈے کو رام اوتار کی گود میں دے کر ایسے ہنسنے لگی جیسے کبھی روئی ہی نہ ہو۔

رام اوتار لونڈے کو دیکھ کر ایسے شرمانے لگا جیسے وہی اس کا باپ ہو۔ جھٹ پٹ اس نے صندوق کھول کر سامان نکالنا شروع کیا۔ لوگ سمجھے کھکری یا چاقو نکال رہا ہے۔ مگر جب اس نے اس میں سے لال بنیائن اور پیلے موزے نکالے تو سارے محلے کی قوت مردانہ پہ ضرب کاری لگی۔ ہت تیرے کی، سالا سپاہی بنتا ہے ہیجڑا زمانے بھر کا۔

اور بہو۔ سمٹی سمٹائی جیسے نئی نویلی دلہن۔ کانسی کی

آپ کی رائے اور مشورے کا منتظر۔
مدیر "قافلہ"

تھالی میں پانی بھر کر، رام اوتار کے بدبودار فوجی بوٹ اتارے اور چرن دھو کر پیئے۔

لوگوں نے رام اوتار کو سمجھایا۔ پھبتیاں کسیں۔ اسے گاؤدی کہا۔ مگر وہ گاؤدی کی طرح کھیسیں کاڑھے ہنستا رہا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو۔ رتی رام کا گونا ہونے والا تھا، سو وہ چلا گیا۔

رام اوتار کی اس حرکت پر تعجب سے زیادہ لوگوں کو غصہ آیا۔ ہمارے آبا جو عام طور پر نوکروں کی باتوں میں دلچسپی نہیں لیا کرتے تھے وہ بھی جز بز ہوگئے۔ اپنی ساری قانون دانی کا داؤ لگا کر رام اوتار کو قائل کرنے پر تل گئے۔

"کیوں بے تو تین سال بعد لوٹا ہے نا؟"

"معلوم نہیں حجور، تھوڑا کم جیادہ... اتنا ہی رہا ہوگا۔"

"اور تیرا لونڈا سال بھر کا ہے۔"

"اتنا ہی لگے ہے سرکار، پر بڑا بدماس ہے سسر" رام اوتار شرمائے۔

"ابے تو حساب لگا لے۔"

"حساب؟... کیا لگاؤں سرکار" رام اوتار نے مرگھلی آواز میں کہا۔

"اُلو کے پٹھے یہ کیسے ہوا؟"

"اب جے میں کا جانوں سرکار... بھگوان کی دین ہے۔"

"بھگوان کی دین! تیرا سر... یہ لونڈا تیرا نہیں ہو سکتا۔"

آبا نے اسے چاروں اور سے گھیر کر قائل کرنا چاہا۔ کر لونڈا حرامی ہے تو وہ کچھ کچھ قائل سا ہوگیا۔ پھر مری ہوئی آواز میں احمقوں کی طرح بولا۔

"تو اب کا کروں سرکار۔ حرامجادی کو میں نے بڑی مار دی" وہ غصے سے بپھر کر بولا۔

"ابے ترا اُلو کا پٹھا ہے تو... نکال باہر کیوں نہیں کرتا کمبخت کو۔"

"نہیں سرکار، کہیں ایسا ہو سکے ہے" رام اوتار گھگھیانے لگا۔

"کیوں بے؟"

"حجور، ڈھائی تین سو پھر سگائی کے لئے کہاں سے لاؤں گا اور برادری جمانے میں سو دو سو الگ کھرچ ہو جائیں گے۔"

"کیوں بے، تجھے برادری کیوں کھلانی پڑے گی؟ بہو کی بدمعاشی کا تاوان تجھے کیوں بھگتنا پڑے گا۔"

"جے میں نہ جانوں سرکار۔ ہمارے میں ایسا ہووے ہے۔"

"مگر لونڈا تیرا نہیں رام اوتار... اس حرامی رتی رام کا ہے۔" آبا نے عاجز آکر سمجھایا۔

"تو کا ہوا سرکار... میرا بھائی ہوتا ہے رتی رام کوئی گیر نہیں، اپنا ہی کھون ہے۔"

"نرا اُلو کا پٹھا ہے۔" ابا بھنا اٹھے۔

"سرکار، لونڈا بڑا ہو جاوے گا اپنا کام سمیٹے گا" رام اوتار نے گڑگڑا کر سمجھایا۔ "وہ دو ہاتھ لگائے گا، سو اپنا بڑھاپا تیر ہو جائے گا۔" ندامت سے رام اوتار کا سر جھک گیا۔

اور نہ جانے کیوں، ایک دم رام اوتار کے ساتھ ساتھ آبا کا سر بھی جھک گیا۔ جیسے ان کے ذہن پر لاکھوں کروڑوں ہاتھ چھا گئے۔... یہ ہاتھ حرامی ہیں نہ حلالی یہ تو بس جیتے جاگتے ہاتھ ہیں جو دنیا کے چہرے سے غلاظت دھو رہے ہیں اُس کے بڑھاپے کا بوجھ اٹھا رہے ہیں۔

یہ ننھے ننھے مٹی میں لتھڑے ہوئے سیاہ ہاتھ دھرتی کی مانگ میں سیندور سجا رہے ہیں۔

گھر والی

ایک منکوحہ لڑکی کی کہانی، جس کا نکاح مولوی صاحب نے تسلیم نہ کیا

جس دن مرزا کی نئی نوکرانی لاجو گھر میں آئی تو سارے محلے میں کھلبلی مچ گئی۔ مہتر جو مشکل سے دو جھاڑو میں مار کے بھاگ لیتا تھا، اب زمین چھیلے پھینکتا تھا۔ گوالا، جو پانی میں دودھ کا چھینٹا دے کے سرمندہ جایا کرتا تھا، اب گھر سے گڑھا ہوا دودھ لانے لگا۔ ایسا گاڑھا کہ ربڑی کا گمان ہوتا تھا۔

پتہ نہیں کس ارمان بھری نے لاجو نام رکھا تھا۔ لاج اور شرم کا لاجو کی دنیا میں کوئی معرف نہ تھا۔ نہ جانے کہاں اور کس کے پیٹ سے نکل، سڑکوں پر رُل کر پلی، تیرے میرے ٹکڑے کھا کر اس قابل ہوگئی کر چھین جھپٹ کے پیٹ بھر سکے۔ جب سیانی ہوگئی تو اس کا جسم اس کی واحد دولت ثابت ہوا۔ جلد ہی ہم عمر آوارہ لونڈوں کی محبت میں زندگی کے اچھوتے راز جان گئی اور شتر بے مہار بن گئی۔

مول تول کی اسے قطعی عادت نہ تھی، کچھ ہاتھ لگ گیا تو کیا کہنے۔ نقد نہ سہی ادھار سہی، جو ادھار کی بھی توفیق نہ ہو تو خیرات سہی۔

"کیوں ری، تجھے شرم نہیں آتی؟" لوگ اس سے پوچھتے۔

"آتی ہے۔" وہ بے حیائی سے شرما جاتی۔

"ایک دن گھٹا کھائے گی۔"

لاجو کو کب پروہ تھی؟ وہ تو گھٹا میٹھا ایک سانس میں ڈکار جانے کی عادی تھی۔ صورت بلا کی معصوم پائی تھی۔ آنکھیں بلا کا جل کے کاجل بھری۔ چھوٹے چھوٹے دانت، میٹھا رنگ۔ کیا پھکیت قسم کی دو بلانے والی چال پائی تھی کہ دیکھنے والوں کی نیا بکی رک جاتیں اور آنکھیں بچو اس کرنے لگتیں۔

مرزا کنوارے تھے۔ ہاتھ سے روٹیاں تھوپتے تھوپتے اُلو ہو گئے تھے۔ چھوٹی سی بساط خانے کی دوکان تھی، جسے وہ جنرل اسٹور کہتے تھے۔ گھر جا کر شادی کرانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ کبھی بیوپار ایسا مندا ہوتا کہ دیوالہ نکلنے کی نوبت آ جاتی، کبھی ایسی لوٹ کے بکری ہوتی کہ سر اٹھانے کی مہلت نہ ملتی، سر پر سہرا بندھوانے کی تو بات ہی کیا۔

بخشی کو لاجو ایک بس اسٹاپ پر ملی تھی۔ بیوی پورے دنوں سے تھی، نوکرانی کی ضرورت تھی۔ جب بچہ ہوگیا تو اسے مار کے نکال دیا۔ لاجو تو پٹنے اور نکلنے کی عادی تھی مگر بخشی کو کچھ اس کی لت سی پڑ گئی تھی لیکن اب اسے سمندر پار بڑے مصر کے کی نوکری مل گئی تھی، اس لیے اس نے سوچا کہ لاؤ بھئی اسے مرزا کے ہاں ڈال آئیں۔ کنجریوں میں مٹی پلید کراتے ہیں، ذرا یہ مفت کا مال بھی چکھ دیکھیں۔

"لاحول ولاقوۃ میں نیچ عورتوں کو گھر میں ڈالنے کا قائل نہیں"، مرزا بدک گئے۔

"ارے میاں ہٹائیے بھی، سارا کام کاج کرے گی سو گھاتے میں"، بخشی نے سمجھایا۔

"نہیں بھئی یہ لعنت کہاں میرے سر منڈھے جاتے ہو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟"

"میرا اکیلے کا ٹکٹ آیا ہے، معدے کہنے کا نہیں آیا"۔

اتنے میں لاجو باورچی خانے پر دھاوا بول چکی تھی۔ لنگے کو لنگوٹ کی طرح کَسے، لمبا بانس جس کے سر پر جھاڑو بندھی تھی، لئے سارے گھر میں گھماتی پھر رہی تھی۔ بخشی نے جب اسے مرزا کے فیصلے کی اطلاع دی تو اس نے بالکل نوٹس نہیں لیا۔ اُس سے ہتھیلیاں جھاڑ کر جانے کو کہا اور خود نل پر پانی پینے چلی۔

"اگر تو کہے تو واپس گھر پہنچا دوں"۔

"چل دور ہو! تو میرا خصم ہے جو مجھے چھوڑ آئے گا! جا اپنا راستہ لے۔ ہم میاں سے نمٹ لیں گے"۔

بخشی نے موٹی موٹی گالیاں دیں کہ حرّافہ اکڑتی کاہے پہ ہے۔ لاجو نے اُس سے بھی تگڑی گالیاں دیں کہ بخشی جیسے لنگے کو بھی پسینہ چھوٹ گیا۔

بخشی کے جانے کے بعد مرزا کی ایسی سٹی گم ہوئی کہ دم ناک دم بھاگ لئے۔ مسجد میں بیٹھے دیر تک سوچتے رہے بے کار خرچ بڑھے گا۔ چوری الگ کرے گی۔ کیا بلا سر آ پڑی۔ مغرب کی نماز کے بعد گھر لوٹے تو دم بخود رہ گئے۔ جیسے بی اماں مرحوم واپس تشریف لے آئی ہوں۔ گھر چندن ہو رہا تھا۔ پانی پینے کا کورا مٹکا جس پر منجھا ہوا کٹورا جھلملا رہا تھا۔ لالٹین صاف جگمگاتی۔ —

"میاں کھانا تیار دوں؟" لاجو نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔

"کھانا؟"

"تیار ہے گرم گرم روٹی ڈالتی ہوں ابھی۔ آپ بیٹھئے"۔ بغیر جواب سنے وہ رسوئی میں چلی گئی۔

آلو پالک کی ترکاری، دھلی مونگ کی دال، زیرہ اور پیاز سے بگھاری ہوئی۔ بس اماں جی کے ہاتھ سے کھائی تھی۔ گلے میں نوالہ اٹکنے لگا۔

"پیسے کہاں سے لائی؟" انہوں نے پوچھا

"بنئے سے سامان اُدھار لے آئی"۔

"میں تمہاری واپسی کا کرایہ دے دوں گا"۔

"واپسی؟"

"ہاں میری..... حیثیت نہیں"۔

"کون مانگے ہے تنخواہ؟"

"مگر......"

"زیادہ مرچیں تو نہیں"۔ لاجو نے پھلکا رکابی میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ گویا بات ختم۔

جی ہاں کہہ دیں "نیک بخت سر سے پیر تک مرچیں ہی مرچیں لگی ہوئی ہیں"۔ مگر لاجو چپا چپ تاوے سے پھلکے لانے میں لگی ہوئی تھی جیسے رسوئی میں کوئی بیٹھا پکا پکا کے دے رہا ہو۔

"خیر صبح دیکھا جائے گا"۔ مرزا یہ سوچ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ مگر پہلی دفعہ ایک جوان عورت گھر میں سو رہی تھی، نہ جانے کیسا لگ رہا تھا۔ تھکے ہوئے تھے سو گئے۔

"نا میاں میں نہ جانے کی"۔ صبح کو جب انہوں نے اس کے جانے کی بات چھیڑی تو لاجو نے الٹی میٹم دے دیا۔

"مگر......"

"کیا میرے ہاتھ کا کھانا پسند نا آیا؟"

"یہ بات نہیں"۔

"گھر کی جھاڑو بہاڑو نا کی؟"

"وہ تو سب ٹھیک ہے مگر......"

"تو پھر کون سی سیاہی ہوئی؟" لاجو گرم ہو گئی۔

پہلی ہی نظر میں لاجو دل دے بیٹھی تھی۔ مرزا کو نہیں گھر کو۔ بغیر مالکن کا گھر اپنا ہی ہو آتا۔ گھر مرد کا تھوڑا ہی ہوتا ہے، وہ تو مہمان ہوتا ہے۔ بخشی تو آو کیڑیوں بھرا کباب تھا۔ الگ کوٹھا کرکے رکھا تھا اور کوٹھا بھی کم بخت نندی کمار کی بھینس کا طبلہ، بھینس

نئے اقوال

جب یہ معلوم ہے کہ آج نہیں تو کل عورتوں کو مردوں ہی کے ساتھ کام کرنا ہے تو ہمیں نئے اقوال بنانا پڑیں گے۔ مثلاً (۱) کالج اور سکول میں تم نہ ماں ہو نہ بیٹی نہ معشوقہ۔ صرف طالب علم۔ اور باقی پروفیسر اور دوسرے طلبا ہیں۔ (۲) دفتر میں نہ تم محبت میں باوفا نہ بے وفا — سیدھی طرح کام کرو اور نخرے بھول جاؤ۔ (۳) تمہارے گرد جو لوگ بھی بیٹھے ہیں، سب انسان ہیں۔ نہ مرد ہیں نہ عورتیں افسر ہیں یا کلرک۔ تم نہ کمزور ہو نہ طاقتور۔ نہ صنف نازک نہ صنف کرخت۔ تمہارا وہی کام ہے جس کے لئے تنخواہ لیتے ہو۔

عصمت چغتائی

تو کبھی کی خدا کو پیاری ہو چکی تھی مگر ایسی بو چھوڑ گئی تھی کہ لاجو کی رگ رگ میں رچ گئی تھی اور اوپر سے نخرے کرتا تھا سو الگ۔ یہاں گھر کی رانی تو وہی تھی۔

مرزا نرے بھوندو تھے، یہ لاجو نے دیکھتے ہی تاڑ لیا تھا، واقعی مہمانوں کی طرح آتے، چپ چاپ جو آگے رکھ دیتی کھا لیتے۔ چلتے وقت پیسے دے جاتے۔ دو چار مرتبہ حساب پوچھا، پھر اطمینان ہو گیا کہ لوٹتی نہیں۔ صبح کے گئے شام کو آتے۔

لاجو دن بھر گھر کو سنوارتی، آنگن میں نہاتی، کبھی جی چاہتا تو پڑوس میں رامو کی دادی کے پاس جا بیٹھتی، رامو مرزا کے سٹور میں کام کرتا تھا۔ لاجو پر فوراً نرم ہو گیا، تیرہ چودہ برس کا ہو گا مونہہ پر دھڑیوں جہاسے، بری صحبت میں مٹی ہو گیا تھا۔ اسی نے بتایا کہ مرزا اکثر کنجری کے ہاں جاتے ہیں۔

لاجو کو بہت برا لگا۔ بے کار کا خرچ۔ ڈاکنیں ہوتی ہیں یہ کنجریاں! آخر وہ خود کس مرض کی دوا تھی؟ آج تک جہاں رہی سب ہی خدمات خوش اسلوبی سے سنبھالیں۔ لاجو کو آئے ہفتہ گزر گیا تھا۔ ایسی بے قدری اس کی کہیں نہیں ہوئی۔ مرد عورت کے رشتہ کو اس نے ہمیشہ فراخ دلی سے دیکھا۔ پیار ہی اسکے لئے سب سے حسین تجربہ تھا۔ کچی عمر سے اسے اس پیار سے دل چسپی پیدا ہو گئی تھی۔ نہ ماں بلی نہ دادی نانی جو اونچ نیچ سمجھاتیں۔ اس معاملے میں لاجو بالکل پڑوس کی بلی تھی جو بلوں کے التفات کو اپنا حق سمجھتی تھی۔

ادھر اُدھر سے بہت پیغامات اسے مل رہے تھے مگر وہ مرزا کی نوکرانی تھی۔ اس نے اوروں کو ٹال دیا کہ لوگ ہنسیں گے مرزا پر!

مرزا اوپر سے برف کا تودہ بنے بیٹھے تھے، اندر لیجا ور دل کے جوالا مکھی دہک رہا تھا۔ جان بوجھ کر گھر سے کٹے کٹے رہتے۔ عجیب دل کا عالم تھا۔ کچھ محلے کے من چلوں کا بھی ان کی وحشت میں ہاتھ تھا۔ جدھر دیکھو لاجو کا چرچا۔ آج اس نے دودھ والے کا منہ گھسوٹا۔ کل پٹواری کے ٹٹو پر گوبر اٹھا کے دے مارا۔ جدھر جاتی لوگ ہتھیلی پر دل لے کے دوڑے پڑتے تھے۔ سکول کے ماسٹر جی گلی میں مل جاتے تو اسے ٹکٹکی دینے پر مُصر ہو جاتے۔ مسجد سے نکلتے ہوئے ملاجی بھی اس کے کڑوں کی آواز سن کر آیۃ الکرسی پڑھنے لگتے۔ مرزا کچھ چڑے ہوئے سے گھر میں گھسے۔ لاجو اسی دم نہا کر اٹھی تھی۔ گیلے بال شانوں پر پڑے تھے چولہا پھونکنے کی وجہ سے گال تمتما رہے تھے آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ میاں کو بے وقت آتا دیکھ کر دانت نکوس دیئے۔ مرزا ہڑبڑا کر گرتے سے بچے۔

سر جھکا کر روٹی کھائی۔ پھر چھڑی اٹھا کر مسجد میں جا بیٹھے مگر دل گھر میں پڑا تھا۔ پتہ نہیں میٹھے بتاشے گھر کیوں ایک دم یاد آنے لگا تھا۔ لوٹے تو لاجو دروازے پر کھڑی کسی سے جھگڑ رہی تھی۔ مرزا کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔

"کون تھا؟" انہوں نے شکی شوہر کی طرح پوچھا۔

"دگھوا۔"

"رگھوا؟" برسوں سے دودھ لیتے تھے مگر گوالے کا نام بھی نہیں معلوم تھا۔

"دودھ والا۔ حقہ تازہ کر دوں میاں؟" لاجو ٹہلتے لگی۔

"نہیں۔ کیا کہتا تھا؟"

"پوچھتا تھا، کتنا دودھ لاؤں؟"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا۔ تیری ارتھی اُٹھے، جتنا روز لاتا ہے۔"

"پھر؟" مرزا کا جی سلگنے لگا۔

"پھر میں نے کہا، حرامی اپنی ماں بہنیا کو دودھ پلا۔"

"اُلو کا پٹھا۔ بڑا حرامی ہے یہ رگھوا۔ بند کر دو دودھ، ہم اسٹور سے واپسی پر لے آئیں گے۔"

رات کا کھانا کھانے کے بعد مرزا نے بڑے ٹھسّے کے ساتھ کلف دار کرتہ پہنا، عطر کی پھریری کان میں اٹکائی اور چھڑی سنبھال کر کھنکارتے ہوئے چل دیئے۔ لاجو جل بھن کر کباب ہوگئی۔ پتی ورتا کی طرح گم صم دیکھتی رہی اور من ہی من میں اس کنجری کو کوستی رہی۔ وہ مرزا کو پسند نہیں، ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔

کنجری اپنے دوسرے گاہک کو نمٹا رہی تھی۔ مرزا بخرے کے لالہ کی دکان پر جا بیٹھے۔ مہنگائی اور سیاسی اُلٹ پھیر پر جی جلا کے واپس جھنجھلائے ہوئے لوٹے تو گیارہ بج چکے تھے۔ پانی کی صراحی سرہانے رکھی ہوئی تھی مگر دھیان نہ گیا۔ باورچی خانے والے ایک درے میں مٹکا رکھا تھا۔ غٹ غٹا کر ٹھنڈا پانی پیا، مگر جی کی آگ اور بھڑک اٹھی۔

لاجو کی چکنی سنہری ٹانگ دروازے کے آڑ سے جھانک رہی تھی۔ بے ڈھنگی سی کروٹ پر اس کے کپڑے کسمسائے اور ٹانگ اور لپس گئی۔ مرزا نے ایک گلاس اور چڑھایا اور لاحول کا ورد کرتے ہوئے پلنگ پر گر پڑے۔

کر ذہنیں ریسے کر جسم پھیل گیا، ڈی بی پی کر پیٹ نقارہ ہو گیا دروازے کے پیچھے سے ٹانگ کچھ اور بھی اٹھنگے لگنے لگی۔ ان جانے خوف کو دبوچنے لگے، یہ ٹھونڈ مچائے گی نامراد! مگر شیطان نے پیچھے سے دھکیلنا شروع کیا۔ اپنے پلنگ سے اِک درے تک نہ جانے کتنے میل کے چکر کاٹ چکے تھے۔ اب ان میں دم نہیں تھا۔

پھر ایک نہایت بھولا بھالا سا خیال اُن کے دل میں سر اٹھانے لگا۔ اگر لاجو کی ٹانگ اتنی کھلی نہ رہے تو انہیں اتنی پیاس نہ لگے۔ اس خیال نے جیسے ہی پھن اٹھایا، اُن کی ہمت بڑھ گئی۔ نامراد جاگ گئی تو نہ جانے کیا سمجھے گی مگر اپنے بچاؤ کی خاطر خطرہ بھی تو مول لینا ہی پڑتا ہے۔

جوتے پٹی تلے چھوڑے اور دبے پاؤں دم سادھ کے آگے بڑھے۔ چٹکی سے لہنگے کی گوٹ پکڑ کر کھینچ دی۔ دوسرے لمحے انہیں پچھتاوا بھی ہونے لگا۔ شاید غریب کو گرمی تنگ دے رہی ہو۔ تھوڑی دیر غیر فیصلہ کن انداز میں کھڑے کانپتے رہے۔ پھر دل پر پتھر رکھ کر واپس مڑے۔

ابھی لاجو کے ٹھٹکتے قدم چوکھٹ تک نہ پہنچے تھے کہ قیامت

مختار بخاری
کا
شعری مجموعہ
شیشہ و سنگ
چھپ کر تیار ہے۔
دیدہ زیب کتابت
خوشنما طباعت
نفیس کاغذ
قیمت -/۱۰
مکتبہ شاہکار، کلفٹن کالونی لاہور
لاہور، فون: 854103

ٹوٹ پڑی۔ ایک لوٹ لگا کر لاجو نے انہیں جالیا۔ مرزا کی گھگھی بندھ گئی۔ مرزا کے ساتھ زندگی میں ایسی بے جا کبھی نہ ہوئی تھی وہ ہائیں ہائیں کرتے رہ گئے اور لاجو نے ان کی لاج لوٹ لی۔

صبح کو مرزا لاجو سے ایسے شرما رہے تھے جیسے نئی بیاہی دلہن! لاجو سینہ زور فاتح کی طرح کچری گنگنا رہی تھی اور پراٹھوں میں گھی کی تہیں جما رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں رات کی بات کا کوئی عکس نہ تھا۔ ویسے ہی روزانہ کی طرح دہلیز پر بیٹھی مکھیاں اڑاتی رہی۔ مرزا ڈر رہے تھے کہ اب وہ انگلی پکڑتے پہنچا پکڑے گی۔

دوپہر کو جب وہ ان کے لیے کھانا لے کے دکان پر آئی تو اُس کی چال میں عجیب ساٹھسکا تھا۔ لاجو کو دیکھ کر لوگ خواہ مخواہ بھی چیزوں کا بھاؤ پوچھنے آجایا کرتے تھے۔ مارے باندھے کچھ خریدنا بھی پڑ جاتا۔ بغیر کہے لاجو فوراً سامان تول ناپ کر دینے لگتی۔ ہر چیز کے ساتھ ڈھیروں مسکراہٹیں اور نخرے بھی باندھ دیتی۔ اتنی سی دیر میں وہ اتنی بکری کر جاتی کہ مرزا سے صبح سے شام تک نہ ہو پاتی۔ آج یہ بات انہیں بڑی ناگوار گزر رہی تھی۔

مگر اب تو جو مرزا کے سوراجہ کے نہیں۔ کیا یوٹی چڑھ گئی اور رنگ نکل آیا۔ لوگ وجہ جانتے تھے اور جلے مرتے تھے۔ مرزا کی بھی دن بدن بوکھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ جتنی وہ ان کی خدمت گزاری کرتی گئی یہ اس کے دیوانے ہوتے گئے اور ان کے دل میں دنیا کا خوف بڑھتا گیا۔ انہیں لاجو کی بے تکلفیوں کا مدہوش کن تجربہ تھا۔ پورے درجہ کی بے حیا تھی۔ کھانا لاتی تو بازار میں بھونچال آجاتا۔ کسی کی چسکی بجتی، کسی کو ٹھینگا دکھاتی تھرکتی، کولہے مٹکاتی، کلائیاں جھاڑتی ہوئی آتی تو مرزا کا خون کھول اٹھتا۔

"تم کھانا لے کر نہ آیا کرو۔"

"کاہے کو؟" لاجو کا منہ اتر گیا۔ سارے دن اکیلی بولا جاتی تھی۔ بازار میں ذرا رنگ جمتا تھا۔ ہنسی دل لگی چلتی تھی۔

جب وہ کھانا لے کر نہیں آئی تو مرزا کے دل میں طرح طرح کے شبہ اٹھنے لگے۔ نہ جانے کیا گل کھیل رہی ہوگی مُردار! وہ وقت بے وقت جاسوسی کرتے آدھمکتے۔ وہ فوراً ان کی تھکی آنکھ

جذبات کا اونچا مچان

شاہجہان نے اپنی محبوبہ کی یاد قائم رکھنے کے لیے تاج محل بنوایا۔ عصمت نے اپنے محبوب بھائی کی یاد میں "دوزخی" لکھا۔ شاہجہان نے دوسروں سے پتھر اٹھوائے۔ انہیں ترشوایا اور اپنی محبوبہ کی لاش پہ عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی۔ عصمت نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے خواہرانہ جذبات چن چن کر ایک اونچا مچان تیار کیا اور اس پہ نرم نرم ہاتھوں سے اپنے بھائی کی نعش رکھ دی۔ تاج شاہجہان کی محبت کا برہنہ مرمریں اشتہار معلوم ہوتا ہے، لیکن "دوزخی" عصمت کی محبت کا نہایت ہی لطیف اور حسین اشارہ ہے۔ وہ جنت جو اس مضمون میں آباد ہے، عنوان اس کا اشتہار نہیں دیتا۔

سعادت حسن منٹو

پر مصر ہو جاتی۔ ایسی پھنکیٹ لونڈیا سے خوف نہ آئے گا۔

ایک دن جو لوٹے ایک دم گھر پہنچے تو دیکھا لاجو ردی کاغذ والے کو بے نقط سنا رہی ہے اور ردی والا دانت نکوسے شربت کے سے گھونٹ گٹک رہا ہے۔ مرزا کو دیکھا تو بھاگا۔ مرزا نے لپک کے گردن ناپی۔ کس کس کے دو چھانپڑ لگائے اور دی ایک لات!

"کیا قصہ تھا؟" مرزا کے نتھنے پھڑپھڑانے لگے۔

"موت پڑا دس آنے سیر کے دے رہا تھا۔ میں نے کہا اپنی اماں کو دے جا کے حرام زادے۔" ردی کا کھلا بھاؤ آٹھ آنے سیر تھا۔

"تم سے کس نے کہا ہے ردی بیچنے کو؟" مرزا بڑبڑائے اور پیر کھینچ کر تسمے کھولنے لگے۔

مگر اُس دن تو اُن کے جلال کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے لاجو کو گلی کے لونڈوں کے ساتھ کبڈی کھیلتے دیکھا۔ اس کا لہنگا ہوا میں قلانچیں مار رہا تھا۔ بچے تو کبڈی کھیل رہے تھے: بچوں کے

باپ بیٹے کی فیاضی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ سب ہی باری باری اُسے کوٹھا دلانے کی پیشکش کر چکے تھے۔ جو لاجو نے ٹھکرا دی تھی۔ مرزا نہایت نخوت سے سر نیوڑھائے گزر گئے۔ لوگ اُن پر ہنس رہے تھے۔ میاں جی کا غرّا تو دیکھو جیسے وہ اُن کی بیاہتا ہی تو ہے۔

لاجو ان کی جان کو روگ کی طرح چمٹ گئی تھی اُس کی جُدائی کے خیال سے ہی پسینے چھوٹنے لگتے تھے۔ اسٹور میں ان کا بالکل جی نہ لگتا۔ سارے وقت لاجو کا خیال ستاتا۔ نہ جانے کب کسی بھاری پیشکش پر نامراد کی رال ٹپک پڑے۔

"میاں نکاح کیوں نا پڑھوا لیتے۔" انہوں نے میرن میاں سے دکھڑا رویا تو انہوں نے رائے دی۔

"لاحول ولا قوۃ! نکاح جیسی مقدس رسم کو اس قحبہ سے کیسے وابستہ کیا جا سکتا ہے؟ زمانے بھر میں لہنگا اچھال کر اب وہ اُن کی دلہن کیسے بن سکتی ہے؟" مگر شام کو جب واپسی پر لاجو غائب ملی تو ان کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ لالہ کمبخت بہت دنوں سے سونگھ رہا تھا۔ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی، اُس نے پکار کر سب کے سامنے کہا تھا کہ کوٹھا نہیں' وہ کہے تو بنگلہ لے دوں گا۔ میرن میاں بڑے دوست بنتے تھے۔ لیکن چپکے سے انہوں نے بھی حسب حیثیت نذرانہ پیش کیا تھا۔

مرزا بوکھلائے ہوئے بیٹھے تھے کہ لاجو واپس آ گئی۔ وہ رامو کی دادی کی پیٹھ مُلنے گئی تھی۔

اس دن مرزا نے فیصلہ کر لیا کہ خاندان کی ناک کٹے یا سلامت رہے لاجو کو نکاح میں لانا پڑے گا۔

"کاہے کو میاں؟" جب مرزا نے اپنی تجویز پیش کی تو لاجو بوکھلا گئی۔

"کیوں؟ کیا کہیں اور ویسے اُڑانے کا ارادہ ہے؟" مرزا بگڑ گئے۔

"تھو! میں کاہے کو اُڑاؤں ویسے!"

"وہ لالہ بھی بنگلہ دلانے کو کہتا ہے۔"

"میں تھو کوں بھی نا اس کے بنگلے پہ۔ جوتی مار دی میں نے اس کے تھوبڑے پر۔"

"تو پھر؟"

مگر لاجو نہ سمجھا سکی کہ بیاہ کرنے کی ضرورت ہے؟ وہ تو جنم سے اُن کی ہے اور اُن کی ہی رہے گی' پھر ایسی کون سی خطا ہوئی جو میاں کو نکاح کی ضرورت محسوس ہوئی؟ پر ایسا مالک تو نہ جانے کتنے جنم بھر گنے پر ملتا ہے۔ لاجو نے بڑی ٹھوکریں کھائی تھیں۔ مرزا اُسے فرشتہ معلوم ہوتے تھے۔ اس کے سب مالک اس کے عاشق بن جاتے تھے' پھر اسے چار چوٹ کی مار دیا کرتے تھے۔ مرزا نے کبھی اُسے پھول کی چھڑی بھی نہ چھوائی اور پیار بھی جی بھر کے کیا۔ دو جوڑے بنوائے اور سونے کی مندریاں دلائیں۔ سچے سونے کا زیور تو اس کی سات پیڑھی نے نہ پہنا ہوگا۔

انہوں نے رامو کی دادی سے کہا۔ وہ بھی حیرت میں پڑ گئی۔

"اے میاں کاہے کو گلے میں گھنٹی باندھو۔ کیا مسٹری نخرے کرنے لگی ہے؟ تو مار دیو چڑیل کو' ٹھیک ہو جائے گی۔" جہاں جوتے کاری سے کام چل جائے وہاں نکاح کی کہاں گنجائش ہے۔

مگر مرزا کو تو ایک رٹ لگی تھی "اگر میری ہے تو میرے نکاح میں آ جائے۔"

"کیوں ری؟ کیا تجھے دھرم کی اوٹ لگے ہے؟"

"نا میّا ایسی بات نا۔ میں تو انہیں اپنا پتی مانتی ہوں۔" لاجو بڑی میٹھی طبیعت کی تھی۔ وہ تو دو گھڑی کے گاہک کو بھی دم بھر کے لیے پتی مان کے اس کی سیوا کرتی تھی۔ اس نے کبھی اپنے کسی عاشق کے ساتھ کنجوسی نہیں برتی۔ دھن نصیب نہ ہوا۔ تن اور من اس نے سینت کے نہ رکھا جسے دیا جی بھر کے دیا' جی بھر کے لیا' اور مرزا کی تو بات ہی نرالی تھی انہیں دینے اور اُن سے چھیننے میں جو مزہ آتا تھا وہ کوئی لاجو کے دل سے پوچھتا۔ ان کے سامنے سب ڈھیٹ کتّے معلوم ہوتے تھے۔ وہ اپنی حقیقت جانتی تھی۔ شادی بیاہ تو کنواریوں کے ہوتے ہیں اور اپنے ہوش میں وہ کبھی کنواری نہ تھی۔ وہ کسی کی دلہن بننے کے لائق نہیں۔

وہ بہت ہاتھ پاؤں جوڑ کر گڑگڑائی مگر مرزا پر تو نکاح کا بھوت سوار تھا۔ نیک ساعت دیکھ کر ایک دن عشاء کی نماز کے بعد نکاح ہو گیا۔ تمام محلے ٹولے میں اودھم مچ گیا۔ لونڈیاں، بالیاں ڈھول لے کر سہاگ گانے لگیں، کوئی دلہن والی بن گئی، کوئی دولہا والی۔ اور مرزا نے ہنس ہنس کے نیگ دیا اور لاجو عرف کنیز فاطمہ مرزا عرفان علی بیگ کے نکاح میں آ گئیں۔

نکاح میں لاتے ہی مرزا نے لہنگوں پر پابندی لگا دی اور تنگ موری کا پاجامہ کرتا بنوا دیا۔ کنیز فاطمہ کو ٹانگوں کے بیچ میں خلا کی عادت تھی۔ دو الگ الگ پائنچے جس میں دو ٹانگوں کے بیچ میں کپڑا آ جائے نرا جھنجھٹ ہے۔ وہ بار بار اس فضول کا ٹ کو کھینچے جاتی۔ پہلی فرصت میں اس نے پاجامہ اتار الگنی پر ڈالا اور لہنگا اٹھا کر سر سے پہن ہی رہی تھی کہ مرزا آ گئے۔

اس نے لہنگا کمر پر روکنے کی بجائے چھوڑ دیا۔

"لاحول ولا قوۃ!" مرزا گرجتے گئے اور چادر کھینچ کر اس پر ڈال دی۔ نہ جانے مرزا نے کیا بھاشن جھاڑا اس کے کچھ پلے نہ پڑا کہ اس نے کیا غلطی کی؟ اس کی اس حرکت پر تو مرزا کی جان جایا کرتی تھی۔ مرزا نے اچھا بھلا لہنگا بیچ بیچ اٹھا کر چولہے میں جھونک دیا۔

مرزا بھی بھن کرتے چلے گئے۔ وہ چور سی بیٹھی رہ گئی۔ چادر پھینک کر اس نے اپنے جسم کا معاینہ کیا کہ کہیں کوڑھ تو نہیں پھوٹ آیا، تل کے نیچے نہاتے وقت وہ بار بار اس کو پوچھتی رہی۔ سرکی والے کا لونڈا مٹھوا پتنگ اڑنے کے بہانے پاس کی چھت پر سے اسے نہاتے دیکھا کرتا تھا۔ آج وہ ایسی اداس تھی کہ نہ اسے انگوٹھا دکھایا نہ جوتی سے دھمکایا، نہ بھاگتی ہوئی کوٹھری میں گئی، بلکہ چادر لپیٹ لی۔

دل پر پتھر رکھ کر اس نے شیطان کی آنت جیسی لمبی موریا چڑھائیں، مرے پر سو درے۔ اوپر سے کمر بند سٹک گیا۔ چلا چلا کر گلا پڑ گیا تب جلو آئی اور کمر بند پڑا۔ یہ بندوق کا غلاف کس بد مذاق نے ایجاد کیا ہو گا جتنی بار ٹٹی جاؤ کھولو باندھو!

جب مرزا دکان سے لوٹے تو پھر کمر بند سٹک گیا تھا، وہ انگلی سے پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مرزا کو اس پر پیار آ گیا۔ چمکار کر گود میں سمیٹ لیا۔ بڑی جگہ مٹوں سے کمر بند ہاتھ آیا تب اسے پاجامے سے اتنی شکایت نہ رہی۔

پھر ایک مصیبت اور کھڑی ہو گئی۔ پہلے جو لاجو کی رعنائیاں تھیں، وہ مرزا کی دلہن میں بے حیائیاں بن گئیں۔ یہ بازاری عورتوں کے لٹکے شریف زادیوں پر زیب نہیں دیتے۔ وہ ان کے خوابوں کی روایتی دلہن نہ بن پائی کہ مرزا پیار کی بھیک مانگیں یہ شرمائے، وہ منتیں کریں یہ بگڑ جائے، وہ منائیں یہ روٹھ جائے۔ لاجو تو سڑک کا پتھر تھی، ایسوں کا پھول بننے کے گر نہیں جانتی تھی۔ ڈانٹ ڈانٹ کے مرزا نے لگامیں لگائیں۔ آخر بدھیا کو سدھا ہی لیا۔ مرزا اب نہایت مطمئن تھے کہ انہوں نے لاجو کو شریف زادی بنا کر ہی چھوڑا۔ یہ اور بات ہے کہ اب انہیں گھر بھاگنے کی زیادہ جلدی نہیں ہوتی۔ عام شوہروں کی طرح یار دوستوں میں بھی اٹھ بیٹھ لیتے مگر لوگ جورو کا غلام نہ کہیں۔ معشوق کے ناز اٹھانا اور بات

خواجہ احمد عباس میں وہ تمام کمزوریاں ہیں جو فرشتہ اور شیطان کے بیچ کی زنجیر میں گھندھی ہوئی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری عورت ہے۔ ماں، بہن، بیٹی، محبوبہ، غرض ہر شکل میں عورت عباس کو ورغلا سکتی ہے۔ وہ ایک ہی سانس میں سرد جنی نائیڈو سے لے کر سینہ پر بھانک سے والہانہ عشق کر سکتا ہے۔ محبوبہ کے لئے لازمی نہیں کہ مجسم جسم ہو۔ اتنا تو عباس کی تحریریں پڑھنے والوں کو بھی اندازہ ہو گا کہ عباس عورت کے جسم کو بیکار ضرورت سے زیادہ نہیں ٹٹولتا۔ وہ اس کے سینے کے آثار چڑھاؤ پر قلابازیاں کھاتا نظر نہیں آتا، نہ زلفوں کے سلسلے میں ریشمی آنچل کے لئے واویلا مچاتا ہے، نہ خم ابرو کا گھائل، نہ رسیلے ہونٹوں کا پیاسا۔

عصمت چغتائی — "دو ہاتھ"

فلمی ستاروں کے عاشق

پلے در پے ڈبکیوں کے بعد ثریا کا نام آہستہ آہستہ بالکل غائب ہوگیا۔ یہ کیا ہو جاتا ہے ان فلمی پریوں کے عاشقوں کو؟ یا تو گلی گلی بھٹکتے پھرتے تھے یا آج ایک لوٹا پھوٹا بھی نظر نہیں آتا۔ دراصل فلم اسٹار کے ساتھ اُس کے چاہنے والے بھی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ شادی بیاہ بھی ہو جاتا ہے بچوں کے باپ بن جاتے ہیں۔ اُس وقت وہ اپنی چاہت کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ اونچی کرسیوں پہ بیٹھ کر وہ بچپن کی امنگوں بھری چاہتوں کو بھول جاتے ہیں۔ کہ اُن کی یاد سے اُن کے وقار کو ٹھیس لگتی ہو گی اور پھر اب سے پچیس سال پہلے کی فلم اسٹار کے چاہنے والے نانا دادا بن گئے ہوں گے یا بننے والے ہوں گے۔

عصمت چغتائی — "بیند کی ماتی"

ہے مگر بیوی کی جوتیاں مرد برداشت نہیں کر سکتا۔

اپنی عیر حاضریوں کی تلافی کرنے کے لیے انہوں نے ایک ملازم رکھنے کی تجویز پیش کی۔ مگر لاجو کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ جانتی تھی کہ میاں کنجری کے ہاں جانے لگے ہیں۔ ہمارے محلے کے میاں لوگ جاتے تھے۔ مگر گھر میں وہ کسی کا عمل دخل برداشت نہیں کر سکتی۔ کوئی اس کے جھماتے برتنوں کو ہاتھ لگائے۔ اُس کی کھٹولی میں قدم رکھے تو اس کی ٹانگیں چیر کر پھینک دے گی۔ وہ مرزا میں سانجھا برداشت کر سکتی تھی۔ مگر گھر کی وہی اکیلی مالکن تھی۔

پھر مرزا جی جیسے لاجو کو گھر میں رکھ کے بھول گئے۔ ہفتوں ہوں ہاں سے آگے بات نہ ہوتی۔ جب تک وہ داشتہ تھی سب آنکھیں سینکتے تھے۔ جب کسی شریف کے گھر بیٹھ گئی تو محلے ٹولے کے اصولوں کے تحت ماں بہن اور بیٹی ہو گئی۔ کوئی بھول کر بھی ٹاٹ کے پردے کے پیچھے نگاہ ڈالنے کی زحمت نہ کرتا۔

سوا مٹھوا سرکی والے کے لونڈے کے۔ وہ اب بھی وفا تھا

رہا تھا۔ وہ اب بھی کوٹھے پہ پتنگ اُڑاتا۔ جب مرزا چلے جاتے اور لاجو کام کاج سے فارغ ہو کر نل کے نیچے نہانے بیٹھتی پڑے کے خیال سے ہی تو نل لگوایا تھا۔ لاجو نے کوٹھے کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر اُس رات مرزا یار دوستوں کے ساتھ دسہرے کا جشن منانے غائب رہے تھے۔ صبح جھینپے ہوئے لوٹے اور جلدی جلدی نہا دھو کر اسٹور چلے گئے۔ لاجو چڑی بیٹھی تھی۔ تب ہی اس کی نظر کوٹھے کی طرف اُٹھ گئی یا شاید اُس دن مٹھوا کی نظر وہ بھالے لگے ہوئے تھے جو اُس کے گیلے جسم میں پیوست ہو گئے اور لونڈے کی بہت دن بعد اُس دن پتنگ کٹ گئی، ڈور ٹوٹی تو لاجو کی پیٹھ پر گھسٹا مارتی چلی گئی۔

لاجو نے سسکاری بھری اور قصداً یا سہواً چادر بغیر اٹھا کر کوٹھڑی میں ٹپ گئی۔ ایک بجلی سی کوندی اور سامنے کوٹھے پر گری۔ پھر اُسے خیال آیا کہ نل تو کھلا ہی چھوڑ آئی تھی، لہٰذا واپس الٹے پاؤں بھاگی۔

اس کے بعد جب کبھی لاجو حلوائی کے یہاں سے کچھ منگوانے کو ٹاٹ کا پردہ سرکاتی تو مٹھوا آس پاس ہی منڈلاتا نظر آتا۔

"اے مٹھوے! کیا دن بھر گوبر کا سا چوتھ بنا بیٹھا رہے ہے جا ذرا دو کچوریاں تو لا دے۔ چٹنی میں خوب ساری مرچیں ڈلوائیو۔"

پھر مٹھوا اور بھی ہل گیا، اگر غلطی سے نہاتے وقت کوٹھے پر نظر آتا تو وہ اتنی زور زور سے بالٹی کھڑکاتی کہ اگر قبر میں سوتا ہوا ہوتا تو پھڑپھڑا کے جاگ اٹھتا۔ جو پیار وہ ساری عمر دونوں دونوں ہاتھوں سے لٹاتی آئی تھی، مٹھوا کے لیے بھی حاضر تھا۔ مرزا اگر کسی وقت کا کھانا نہ کھاتے تو وہ پھینک تھوڑا ہی دیتی تھی کسی غریب حاجت مند کو کھلا دیتی تھی اور مٹھوا سے زیادہ اس کی عنایات کا کون حاجت مند تھا۔

مرزا نے لاجو کے پیر میں بیاہ کی زنجیریں ڈال کے سوچ لیا کہ اب ہو گئی وہ گرہستن۔ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتے تو یقین بھی نہ کرتے۔ لاجو نے جو انہیں یوں بے وقت چوکھٹ پکڑے دیکھا تو بے اختیار ہنسی نکل گئی۔ اُس نے خواب میں بھی نہ سوچا

تھا کہ مرزا اس شدت سے بُرا مانیں گے۔ جھٹ مٹھوا تاڑ گیا اور دھوتی اُٹھا کے ایسا بھاگا کہ تین گاؤں پار کر کے ہی دم لیا۔

مرزا نے لاجو کو اتنا مارا کہ اگر وہ دنیا کے سرد و گرم نہ جھیلے ہوتی تو اللہ کو پیاری ہو جاتی۔ اسی دم یہ خبر سارے گاؤں میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ مرزا نے اپنی گھر والی کو مٹھوا کے ساتھ پکڑ لیا اور دونوں کو جہنم واصل کر دیا۔ مرزا کا منہ کالا ہو گیا۔ خاندان کی ناک کٹ گئی۔ لوگ جوق در جوق تماشا دیکھنے جمع ہوئے مگر یہ دیکھ کر انہیں سخت ناامیدی ہوئی کہ مٹھوا تڑی ہو گیا اور گھر والی ٹوٹ پھوٹ گئی، مگر جی جائے گی بلھو کی دادی اسے سمیٹ لے گی۔

کوئی سوچے گا کہ اتنے جوتے کھانے کے بعد لاجو کو مرزا کی صورت سے نفرت ہو گئی ہو گی۔ توبہ کیجیے۔ جوتا کاری سے تو اصل بندھن بندھا جو نکاح سے بھی نہ بندھا تھا۔ ہوش میں آتے ہی مرزا کی خیریت پوچھنے لگی۔ اس کے سب ہی آقا دیر سویر اس کے عاشق ہی بیٹھتے تھے۔ اس عنایت کے بعد تنخواہ کا سوال ختم ہو جاتا۔ مفت کی رگڑائی اوپر سے چار چوٹ کی مار مرزا نے آج تک اسے پھول کی چھڑی نہ چھوائی تھی۔ دوسرے آقا اسے یار دوستوں کو مستعار دے دیتے تھے مرزا نے اسے اپنی چیز سمجھا۔ اس پر اپنا حق جانا۔ یہ اس کی عزت افزائی تھی جلا کر استعمال میں نہ تھی۔ پھر بھی انہیں اتنی پیاری تھی۔ ذرا پر مرزا کی ٹیسیں غالب آگئیں۔ سب نے اسے سمجھایا کہ جان کی امان چاہتی ہے تو بھاگ جا، مگر وہ نہ مانی۔

میرن میاں مرزا جی کو روکے ہوئے تھے۔ بغیر ناک چوٹی کاٹ کے قتل کئے کوئی چارہ نہ تھا۔ اُن کی ناک کٹ گئی۔ لاجو زندہ بچ گئی۔ اب وہ دنیا کو کیسے مونھہ دکھائیں گے۔

"اماں، ایک مال زادی کی خاطر پھانسی پر چڑھ جاؤ گے۔"

"پروا نہیں۔"

"میاں، طلاق دے دو سالی کو، اور چھٹی کرو۔" میرن میاں نے سمجھایا۔ کوئی شریف زادی ہوتی تو اور بات تھی۔

خدا کی قسم

رسالہ "ساقی" میں "دوزخی" چھپا۔ میری بہن نے پڑھا اور مجھ سے کہا "سعادت! یہ عصمت کتنی بے ہودہ ہے۔ اپنے موئے بھائی کو بھی نہیں چھوڑا کم بخت نے۔۔۔ کیسی کیسی فضول باتیں لکھی ہیں۔

میں نے کہا: "اقبال، اگر میری موت پر تم ایسا ہی مضمون لکھنے کا وعدہ کرو تو خدا کی قسم میں آج مرنے کے لئے تیار ہوں۔

سعادت حسن منٹو

مرزا نے اسی وقت طلاق دی۔ مبلغ ۳۲ روپے مہر اور اس کے کپڑے لتے راموں کی دلوی کے ہاں بھجوا دیئے۔

لاجو کو جو طلاق کی خبر پہنچی تو جان میں جان آگئی جیسے سر سے بوجھ اُتر گیا۔ نکاح اسے راس نہیں آیا۔ سب اسی کے ہوا۔ چلو پاپ کٹا۔

"میاں! اب تو ناراض نہیں؟" اس نے راموں کی دادی سے پوچھا۔

"تیری صورت نا دیکھنا چاہیں، کہیں کہ یہاں سے منہ کالا کر جا۔"

مرزا کی طلاق کی خبر سارے محلے میں سرپٹ دوڑ گئی۔

فوراً لالہ نے پیغام بھجوایا "بنگلہ تیار ہے۔"

"اس میں اپنی اماں کو بٹھا دے۔" لاجو نے کہلوا دیا۔ مبلغ ۳۲ روپے میں سے دس اس نے بوڑھا اور لاجنگ کے راموں کی دادی کو دیئے۔ تنگ پاجامے شکورا کی بہو کے ہاتھ اونے پونے بیچ لئے۔ پندرہ دن میں لوٹ پیٹ کے کھڑی ہو گئی۔ کم بخت کی جیسے ڈھول بھر گئی۔ جوتے کھا کر اور نکھر آئی۔ کمر میں سو سو بل پڑنے لگے۔ پان کا بیڑا لینے یا سیو کچوری لینے حلوائی کی دوکان

ٹھک نکل جاتی تو اگی کی چہل پہل بڑھ جاتی۔

مرزا کے دل پر آرے چلتے۔ ایک دن پنواڑی سے کھڑی الائچی کے دانوں پر جھگڑ رہی تھی۔ وہ مزہ لے رہا تھا۔ مرزا کٹے کٹے نظر بچا کے نکل گئے۔

"اماں تمہیں تو ہو گیا ہے خبط! اب تمہاری بلا سے وہ کچھ کرتی پھرے۔ تم نے طلاق دے دی۔ تمہارا اب اس سے کیا رشتہ ہے؟"

"وہ میری بیوی تھی۔ میں کیسے برداشت کر سکتا ہوں؟" مرزا بگڑے۔

"تو کیا ہوا؟ اب تو نہیں بیوی۔ اور سچ پوچھو تو وہ تمہاری بیوی تھی ہی نہیں۔"

"اور نکاح جو ہوا تھا؟"

"قطعی ناجائز۔"

"یعنی کہ......؟"

"ہوا ہی نہیں۔ برادر، نہ جانے وہ کس کی ناجائز اولاد ہوگی۔ ناجائز سے نکاح حرام!" میرن میاں نے فتویٰ جڑا۔

"تو نکاح ہوا ہی نہیں؟"

"قطعی نہیں۔" بعد میں قاضی نے بھی صاد کر دیا کہ حرامی اولاد سے نکاح جائز نہیں۔"

"تو ہماری، گویا کہ ناک وغیرہ بھی نہیں کٹی؟" مرزا کے سر سے بوجھ ہٹ گیا۔

"بالکل نہیں۔"

"بھئی کمال ہے! تو پھر طلاق بھی نہیں ہوئی؟"

"بھائی میرے نکاح ہی نہیں ہوا تو طلاق کیسے ہو سکتی ہے؟"

"مبلغ بتیس روپے مہر کے مفت ہی میں گئے!" مرزا کو تاسف ہونے لگا۔

فوراً یہ خبر سارے محلے میں چھلانگیں مارنے لگی کہ مرزا کا ان کی گھر والی سے نکاح ہی نہیں ہوا، نہ طلاق ہوئی۔ مبلغ بتیس روپے بے شک ڈوب گئے۔

لاجو نے یہ خوش خبری سنی تو ناچ اٹھی۔ سینے پر سے بوجھ کھسک گیا۔ نکاح اور طلاق ایک ڈراؤنا خواب تھا جو ختم ہو گیا تو جان چھوٹی۔ سب سے زیادہ خوشی تو اس بات کی تھی کہ میاں کی ناک نہیں کٹی۔ اسے میاں کی عزت جانے کا بڑا دکھ تھا۔ حرامی ہونا کیسا وقت پر کام آیا! خدانخواستہ اس وقت وہ کسی کی جائز اولاد ہوتی تو چھٹی ہو جاتی۔ دادو کی دادی کے گھر میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ زندگی میں کبھی یوں گھر کی مالکن بن کے بیٹھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اسے گھر کی فکر لگی ہوئی تھی۔ چوری چکاری کے ڈر سے میاں نے اتنے دن سے جھاڑو بھی نہیں دلوائی تھی۔ گوڑے کے انبار لگ رہے ہوں گے۔ وہ سٹور جا رہے تھے۔ لاجو نے راستہ روک لیا۔

"پھر میاں کل سے کام پہ آ جاؤں؟" وہ اٹھلائی۔

"لاحول ولاقوۃ!" مرزا سر نیوڑھائے لمبے لمبے ڈگ مارتے نکل گئے۔ دل میں سوچا کوئی ماما دکھنی ہی ہوگی، یہ بدذات ہی سہی بات صاف ہو ہی گئی۔

لاجو نے کل دل کا انتظار نہیں کیا، پھٹوں پھٹوں گھر میں کود گئی، لہنگے کا لنگوٹ کسا اور جٹ گئی۔

شام کو مرزا لوٹے تو ایسا لگا مرحومہ بی اماں آ گئی ہوں۔ گھر صاف چندن، لوبان کی بھینی بھینی خوشبو کورے مٹکے پر چھلملاتا منجھا ہوا کٹورا، جی بھر آیا۔ چپ چاپ مچتا ہوا سالن اور روغنی روٹی کھاتے رہے۔ لاجو اپنی حیثیت کے مطابق دہلیز پر بیٹھی پنکھا کرتی رہی۔

رات کو وہ ٹاٹ کے پردے ملا کر جب باورچی خانہ میں لیٹی تو مرزا پر پھر شدت کی پیاس کا دورہ پڑا۔ جی مارے لیٹے اس کے کڑوں کی جھنکار سنتے رہے، کروٹیں بدلتے رہے۔ جی ڈر رہا تھا، بڑی بے قدری کی تھی انہوں نے اس کی۔

لاحول ولاقوۃ!" یکایک وہ جھنجھلاتے ہوئے اٹھے اور ٹاٹ پردے گھر والی کو سمیٹ لیا۔

منشی پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی
اور شوکت صدیقی اُردو کے وہ چار بڑے افسانہ
نگار ہیں، جنہوں نے ناول بھی بہت
اچھے لکھے ہیں۔ "ضدی"، عصمت چغتائی کا
مشہور ناول ہے جو اس نمبر میں جوں کا
توں، مکمل، بلا تلخیص اور بلا تبصرہ پیش کیا جا
رہا ہے۔

پُورن

پانی جان توڑ کر برس رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا آسمان میں سوراخ ہو گئے ہیں۔ سچ بھی ہے کب سے تنا کھڑا ہے، سڑ گل کر سوراخ ہو جانا کیا تعجب؟ کئی رات برستا رہا اور صبح سے برس رہا تھا۔ زور زور سے گویا بھر بھر سمندر پانی کے کوئی پوری طاقت سے زمین پر پٹخ رہا تھا۔ دیواروں کے گھر تو کبھی کے پانی کے طمانچوں سے بے دم ہو کر بیٹھ گئے چھپر گیلی ڈاڑھیوں کی طرح بانسوں اور بلیوں سے جھول پڑے اور گھر والے پیڑوں کے نیچے دبک بیٹھے۔ مگر پانی جیسے ان سے چھیڑ کر رہا تھا۔ کوئی پیڑ بھی پتھر کے سائبان تو نہ تھے جو پانی پتوں کو چیر پھاڑ کر سروں پر نہ گرتا۔ ویسے بھی جیسے کوئی چلو بھر بھر کو پیڑوں کے بھی نیچے پانی اوچ رہا تھا۔ پرنالوں کی واویلا سے اور بھی حواس گم تھے اوپر رات آ رہی تھی۔ گھٹاٹوپ سیاہی گاڑھی ہوتی جا رہی تھی گنڈ تیزی سے لڑھک رہے تھے

آشا ماں کو آخری گھونٹ پانی کے دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ ماں تو جانے کب مر گئی تھی، پر یہ نانی ہی ماں باپ سبھی کچھ تھی۔ اب نانی بھی چل چلاؤ پر تلی تھی۔ اور باپ بیکار نکھٹو سا تھا۔ ایک دن سٹیشن کے پاس مرا ہوا پڑا ملا۔ نانی بہت کچھ سے دیتی تھی، پر اب وہ بھی بوڑھی ہو چلی تھی۔ یہ بات تھی کہ وہ راجہ صاحب کی کھلائی رہ چکی تھی۔ اور راجہ صاحب کے بعد ان کے بیٹوں کو بھی انہیں سوکھے مارے گھٹنوں پر وہی اٹری پرانی لوریاں دی تھیں جو وہ باپ کو دے چکی تھی۔ پر وہ خراج تھی۔ اور پھر کوئی جاگیر تھوڑی مل گئی تھی، نہ زیور تھوڑا تھوڑا کر کے کھایا۔ برتن رکھنے کی ضرورت ہی کون سی تھی۔ عمر بھر راجہ صاحب کے یہاں رہی اور بڑھاپے میں کون سونے کے تھال لگاتا ہے۔ کئی سال سے محل کے کونے میں پڑی سڑ رہی تھی راجہ صاحب نے ازراہِ ہمدردی اُسے پنشن دے کر گاؤں بھیج دیا۔ کچھ بھی تھا اُسے سکون تھا کہ وہ اپنے گاؤں میں مر رہی تھی۔ اپنا گاؤں کہاں گاؤں تو راجہ ہی کا تھا۔

"نہیں آیا، ابھی نہیں آیا۔" آشا سمجھی بڑھیا مرتے وقت کو یاد کر رہی ہے مگر وہ پُورن کے متعلق سوچ رہی تھی۔ پُورن راجہ صاحب کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا۔ وہ اچھا خاصا سات برس کا ہو گیا تھا تب بھی بوڑھی اماں کے ساتھ ہی سوتا تھا اور ہر اتوار کو گاؤں بڑے بھائی کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ اور آج تو اتوار تھا۔ بڑھیا نہ جانے کیوں اس کا انتظار کر رہی تھی اور اسی لئے ٹھیری ہوئی تھی ورنہ اُسے قاعدے سے تو بہت پہلے مر جانا چاہیئے تھا۔

"رنجی کی ماں کہاں ہے۔ گئی؟" بڑھیا پھر جاگی۔

"ہاں اماں۔ کیا بلا لاؤں۔ مینہ پڑ رہا ہے۔"

"نہیں..... پر ہے بڑی..... وہ..... ایسے ..... چھوڑ گئی۔"

سانس گھٹی جا رہی تھی "کیا مینہ بہت پڑ رہا ہے۔" بڑھیا کو فکر ہوئی کہ اب جلائی کیسے جائے گی!

"ہاں۔" آشا سہمی ہوئی دھوتی کا کنارہ مروڑ رہی تھی۔

"اور جنے رنجی کی ماں کہاں مر گئی۔" نہ جانے رنجی کی ماں پر اتنی ماںتا کیوں آ رہی تھی۔ رنجی ویسے تو رنجیت، اور سنگھ بنیا پن چھپانے کو لگایا گیا تھا۔ مگر کہلاتے "اب رنجی" تھے اور یہ والدہ صاحبہ کھتریا کی دلہن، موتی کی بہو اور رام بھروسے کی بیوی اور نہ معلوم کتنی جگہیں بدل چکی تھیں۔ پر سب کمبخت مر گئے اور ان میں سے کسی

ایک کی یادگار رنجی تھے۔ سماج میں ان کی حیثیت بھی تنور کے درخت کی سی تھی۔ زیادہ کارآمد بننے کا اُن میں جذبہ ہی نہ تھا کم سنی میں کچھ دنوں ہیجڑوں کی ٹولی میں جا گھسے اور رنجی کی ماں کو سارا دن محلے والوں کو گالیاں تقسیم کرنے میں گذر جاتا۔ نہ جانے کیوں، وہ بضد تھیں کہ ہیجڑوں کی ٹولی میں نہیں بلکہ نوٹنکی میں گیا ہے جو چھوٹا موٹا تھیٹر ہوتا ہے۔ کچھ بھی ہو رنجی کی نبھی نہیں اور وہ پٹ کر بھاگ آئے اور اب گاؤں بھر میں اپنی نغمہ سرائی کے لئے مشہور تھے لو ایک دم باغیانہ خیالات، کہاں ہیجڑوں میں تھے اور کہاں اب اول نمبر کے غنڈوں میں شمار کئے جاتے تھے کچھ بھی تھا مگر والدہ صاحبہ تو سر اٹھا کر چلتی تھیں۔

بڑھیا کی بے قراری بیکار گئی اور وہ بورا اوڑھے آن پہنچیں۔

کہاں چلی گئی تھیں؟" بڑھیا موت کے فرشتے کی طرح غرائی۔

"اسے ذرا دیکھنے گئی تھی۔ رنجی لوٹا کر نہیں۔ مجھے کہاں لے گئی تھی۔ حرامی نہ جانے کہاں مرا ہے جا کے"۔

"ہوں! چاہے میں مر جاتی"؛ بڑھیا اکیلی آشا کے سامنے نہیں مرنا چاہتی تھی کہ کہیں اس کا دل نہ ہل جائے۔

رنجی آشا پر عاشق تھے۔ بڑھیا کو پہلے تو بہت بُرا لگا مگر پھر سر گھما کر دیکھا تو اور کون سے ہیرول جڑے تھے اور یہ بھی بات تھی کہ رنجی کچا ہوگا اپنے گھر کا۔ آشا سے چھیڑ کرنے کی اس میں کبھی ہمت نہ ہوتی۔ آشا باہر بھی کب جاتی تھی؟ بڑھیا سانپ بنی اس کی حفاظت کر رہی تھی سارا کام رنجی کی ماں رشوت میں کر رہی تھی اور رنجی جب کبھی گھر آتا گدھے کی طرح سر جھکا کر بیٹھ جاتا۔ بڑھیا راضی ہی تھی۔ پر ابھی نہیں۔ ابھی آشا تھی ہی کتنی دو سال ہوئے تو اس نے باقاعدہ دھوتی پہننی شروع کی ورنہ لہنگا پہنے ذرا سی بچی لگتی تھی۔ مگر رنجی کی ماں کی رائے میں لہنگے ساڑھی سے کچھ نہیں ہوتا جب وہ اتنی تھیں تو دو بچے گر چکے تھے اور تیسرا ارادہ ہونے کو تھا۔

"اپنی اپنی اٹھان ہے۔" بڑی بی جب اچھی تھیں تو ان کی ہمت سے مرعوب ہو کر کہتی تھیں "ہم شابیری دھان پان ہے۔" اور رنجی کی گینڈے جیسی مشک دیکھ کر سہم جاتی۔

رنجی برا بھی نہ تھا۔ حسن کا مقابلہ تو ہو نہیں رہا تھا۔ ٹھنگن ضرور تھا اور بتیسی ذرا ٹوٹی ہوئی سی تھی۔ بجائے نیچے کے دانتوں کے اوپر کے دانت اندر تھے اور ٹھوڑی ذرا آگے کو تھی۔ جب ہنستا تھا تو معلوم ہوتا تھا کسی نے گلا اتنا کر دیا ہے اور ہونٹ تو دونوں ایک جیسے سپاٹ ہی تھے۔ ناک تھوڑی نیچی اور وسیع تھی۔ مگر آنکھوں میں رس تھا اور بال جیسے آج کل بڑے لوگوں میں جسے دیکھو گنجا

لبنان کے عظیم دانشور، مفکر اور ادیب کو "وقافلہ" کا نذرانہ عقیدت

خلیل جبران نمبر

پندرہ اپریل

دس روپے

ہوتا چلا جاتا ہے پر ہفتوں نہ دھونے کے باعث دھول میں اَٹے ہوئے۔

"پُورن نہیں آیا؟" رنجی کے ذکر سے اُکتا کر رُخ پلٹا۔ — "اسے لوده اس پانی میں آ کیُں گے۔ بڑے آدمی کبھی کے بھی نا ہوتے سچ تو یہ ہے۔"

بڑھیا میں دم ہوتا تو وہ اتنا لڑتی کہ رنجی کی ماں پست ہو جاتی۔ اندھی کہیں کی کوڑھن! اور وہ جو ہر اتوار آتا تھا تو کیا اُسے دکھائی نہ دیتا تھا آتے ہی وہ اچار کی ہنڈیا ٹٹولتا اور عمدہ گھی کی فرمائش کرتا۔ عمدہ گھی اور لڑائی کے زمانہ میں بھلا کدھر سے آئے نہ جلے۔" یہ لڑائی میں گھی کا کیا خرچ ہے؟ توپوں میں بھر بھر کو مارتے ہوں گے۔ بھلا گھا سلیٹ کیوں نہیں بھرتے؟ آدمی تو کھائیں گھا سلیٹ اور توپیں؟ ہاں توپیں ہی ہوئیں۔ سرخ انگارہ جیسے دہانوں کی توپیں! ذرا بولو آگ اگلنے لگیں یہ گورے! لو یہ گھی کے ذکر پہ گورے کہاں سے آن ٹپکے۔

ہاں تو پُورن ہر اتوار آتا تھا۔ آج بوڑھی کھلائی کو اس کا انتظار تھا۔ تو مینہ بستر پر نکل پڑا

"واہ تجھے کیا معلوم آئے گا وہ ضرور۔ ذرا دیکھ تو کہیں ..."

"لے ہے کہیں بھی آیا؟" رنجی کی ماں اٹھنے کے ڈر کے مارے جلدی سے بات ٹالنے لگی؟ "کچھ کھایا بھی؟ کیا حال ہو گیا ہے؟" اس نے چاہا بڑھیا کو موت کی یاد دلا کر دھمکائے۔

انتظار کی چند گھڑیاں ہی گذری تھیں کہ راجہ صاحب کی موٹر کی آواز آئی۔ بڑھیا میں جیسے تھوڑی دیر کے لئے دم آگیا وہ موٹر کی آواز کو خوب پہچانتی تھی۔ موٹریں آتی ہی کب تھیں گاؤں میں۔ اور ذرا سی دیر میں پُورن ہٹے بٹے پلنگ پر محبت سے بڑھیا کے پاس بیٹھ گیا۔

"اماں یہاں ٹھیک علاج نہیں ہو رہا ہے۔ تمہیں لینے آیا ہوں۔"

بڑھیا تو جانے کو تیار تھی مگر کوئی پُورن سے بھی زبردست اسے تیزی سے گھسیٹ رہا تھا۔

"اب تو پرماتما کے چرنوں میں چلی بیٹا ...!"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ اور تم تو کہتی تھیں کہ پُورن کی بہو لاؤں گی۔ اس کا بیٹا کھلاؤں گی اور پھر اب پرماتما سے چھٹی لے کر آؤں گی۔ بس آج ہی چلو وہاں تمہارا علاج یوں ہو جائے گا۔" پورن نے چٹکی بجا کر کہا۔

"اب میرا علاج دنیا کے کسی ڈاکٹر سے نہ ہوگا۔ میری بات سن۔"

"نہیں اماں تم ..."

"سن میرے لال! آشا میری ... میری بچی میں نے اسے بڑا کھلایا ہے۔ بڑی پیاری بچی ہے، اُسے راجہ صاحب کے چرنوں میں پہنچا دینا اسے دُکھ نہ دینا۔ میری .... اور کہیں اچھا لڑکا ڈھونڈھ کر اس کا بیاہ کر دینا اب اس کے دنیا میں تم ہی لوگ ہو۔"

پورن موت کے آثار بھی نہ پہچانتا تھا۔ "تم خود ہی چلو۔"

"بیٹا ..... میں تو جاؤں گی۔ مگر ..... رنجی ہی ڈھنگ کا ہوتا۔"

"رنجی دکان کرنے کی سوچ رہا ہے۔ بنئے نے وعدہ کیا ہے۔" رنجی کی والدہ بولیں: "دو دن میں چل نکلے گی۔" حالانکہ رنجی کئی دکانیں کر چکے تھے مگر جتنے دن مال دکان بھی چلتی اور پھر جب سب کھا پی چکتے تو دوسرا دھندا اختیار کیا جاتا۔ وہی بڑوں کا خوانچہ لگایا دن بھر چکھ چکھ کر ہی ختم کر لیا۔ سگریٹ بیڑی کی دکان دوست یار پھونک گئے۔ جیب کے دام بھی گئے۔

"ہاں جو رنجی کسی کرم کا ہو جائے تو بُرا نہیں۔"

"دیکھا جائے گا اماں پہلے اچھی تو ہو جاؤ۔" بڑھیا

کو اچھے ہونے سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی اور ہوگی بھی تو موت کو سخت جلدی تھی۔ اور جب آشا کو سسکتا چھوڑ کر بڑھیا چل دی تو پورن کی فرمائش دھری رہ گئی۔ رنجی کی ماں اتنی چیخی کہ آشا بھی سہم کر چپ ہوگئی ایسے سوگ کرنے والے بھی کون تھے۔ پیڑ سوکھ گیا تو پتیاں بھی ادھر اُدھر بکھر گیئں۔ آشا زندگی کے نئے راستے پر چلنے کے لئے پورن کی موٹر میں راجہ صاحب کے یہاں چل دی۔ راستہ بھر وہ کونے میں دبکی آنسو پونچھا کی۔ پورن کو اس کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہ ہوئی کہ کہیں اور وہ رونے لگے۔

مگر جب آشا محل میں پہنچی تو اس کا دھڑکتا ہوا کلیجہ ذرا کے ذرا تھم گیا۔ راجہ صاحب نے محبت سے ہاتھ پھیرا اور راما جی نے پاس بٹھا لیا۔ مگر بھابی بھائی نے تو سچ مچ کلیجہ سے لگا لیا۔

کم عمری میں غم اور وہ بھی بوڑھی نانی کا۔ ذرا سے دنوں میں ختم ہوگیا۔ اور ساتھ کی دوسری نوکرانیوں، کام کاج اور بھابی کے بچوں کی محبت میں اداسی کچھ زیادہ یاد نہ رہا اور آشا ایک سیدھی پُرسکون زندگی گزارنے لگی۔

بھابی

آشا کے نہ کوئی بھائی تھا نہ بہن۔ پھر بھابی کا تو سوال ہی کیا تھا۔ مگر وہ جب کبھی گھر کی چنچل اور خوش مزاج بہو کو دیکھتی اس کا دل محبت سے لرز اٹھتا۔ بھابی کا قد منا سا گڑیا جیسا تھا۔ اور ویسے ہی چھوٹے چھوٹے کمزور ہاتھ۔ مگر وہ شریر کتنی تھی اور قہقہے کیسے گونجتے تھے۔ جیسے چاندی کے موتی آپس میں ٹکرا رہے ہوں۔ وہ کسی طرح بھی تو تین بچوں کی ماں نہیں معلوم ہوتی تھی نرمل سے تھوڑی ہی بڑی تو لگتی تھی۔ اور نرمل بھی جب پیدا ہوگیا جب بھابی کو سیدھے پلے کی ساڑھی بھی پہننا نہ آتی تھی اور شیلا بھینس کی بھینس! پھول جیسی ماں کی کتنی بھونی نُپا بیٹی تھی۔ اتنا کھاتی کہ ماں تو تین دن میں نہ کھا سکتی اور سب سے چھوٹا بھیا تو بس غضب تھا۔ ہاں وہ ذرا بھابی کا بیٹا لگتا تھا کیونکہ اس پر بھی وہ ذرا تھی بے تکے بچے اور پتی مہاراج تو بس بدھ کا مجسمہ تھے جتنا بیوی ہنستی اتنا ہی وقت وہ چپ رہتے۔ کسی بننے کی پرچھائیں پڑگئی تھی۔ بس سوائے گاؤں کی دیکھ بھال کے اور کچھ نہیں بس مسکرا دیتے تھے اور بھابی؟ ہر وقت تیتری کی طرح اڑتی پھرتی۔ گو اس کے پتی مہاراج کے مزاج میں زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ مگر ایسی ہی سکون سے نبھ رہی تھی جیسی زمین آسمان کی نبھ رہی ہے۔ ان کی بلا سے بیوی چھوٹی کم عمر اور ضدی تھی۔ وہ ساس کا کہنا بس کچھ ایسا ہی مانتی۔ ذرا سی بات پر روٹھ جاتی۔ منہ پھلا کر گھنٹوں روتی؟ دیور سے شکایت کر دیتی۔ یہاں تک کہ سسر کی لاڈلی ہونے کی وجہ سے ساس کی شکایت سسر سے ہو جاتی۔ وہ تھی بھی تو ان سے عمر میں چھوٹی۔ ہاں اور دیور سے تو ہر وقت اس کی لڑائی ہوتی۔ شادی ہو کر آئی ہے تو پہلا پیار دیور سے شروع ہوا اور پہلی لڑائی بھی اس سے ہوئی۔ اور اس نے شرم کرنا تو کسی سے سیکھی ہی نہیں۔

صبح ہی صبح یہ رنگین بھابی اُٹھ بیٹھتی اور بچوں پر

صفائی کا حکم صادر کر دیتی۔ اور پھر انہیں ناشتہ کرانے میں تو ہلکان ہو ہو جاتی۔

"جمی میرا توس" نرمل چلاتا۔ سوکھا مارا انسان۔

"اور میرا دودھ" دودھ پی پی کر شیلہ کپوری ہو گئی اور سب سے چھوٹا بھتیجا حلق کے آخری کونے سے چنگھاڑ مارتا۔ بیچ میں بھابی کشتی لڑتی۔

"دیکھو جمی یہ میرا پاپڑ کھا گئی" نرمل منمناتا۔

"ے اپنا پاپڑ" نرمل فریاد کرتا ہے۔

"سوکھے ٹڈے"

"موٹی بھینس"

"تم سوکھے ٹڈے۔ ہوا میں ایک دن اڑ جاؤ گے"

"اور تو موٹی گپا ایک دن پھٹاک سے پھٹ جائے گی۔ بس"

"گپیا ـــــ آلو" نرمل اور شیلہ ایک دوسرے کا خوب منہ نوچتے اور نہایت محبت سے گارنیٹی ہوئی فراک پر دودھ چھلک جاتا۔ اور نرمل کا توس اس کی کہنی میں چپک جاتا۔ تب بھابی چنگھاڑتی

"کیا اندھیر ہے نرمل کے بچے" وہ چٹا چٹ نرمل کی رانوں پر تھپڑ مارتی اور شیلہ کی کمر میں دھموکے لگاتی۔ اور جو اسی اثنا میں کہیں پورن آجاتا تو بس بھونچال کا مزہ آجاتا۔ وہ آتے ہی نرمل کے اچھو لگوا دیتا اور شیلہ کی توند میں انگلیاں ٹھلتا اور بھتیجے کے موٹے موٹے گال اتنے مسلتا کہ خون جھلک آتا۔

"ہٹ وہاں سے آیا بڑا" بھابی چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے پورن کو دھکیلتی "لے کر میرے بچے کے گال لال ہو گئے" مگر پورن اسے اور بھینچتا اور وہ ہنستا "دیکھو بھابی ہنس رہا ہے"

"ہے نا بے حیا!"

"ہاں بالکل اپنی ماں کی طرح" پورن اسے ہوا میں اچھالتا اور ساتھ ساتھ بھابی کا جی اچھلتا۔

"ہائے پورن ـــــ پورن میرا بچہ....." وہ سانس روک لیتی اور جب پورن اسے لٹا کر اس کا منہ دکھاتا تو بھتیا ہنستا ہی ہوتا۔ اور اگر آشا کوئی چیز لے کر آتی یا کوئی کام کرتی تو پورن کہہ اٹھتا۔

"بھابی آشا اپنی نوکر تو نہیں۔ وہ کام کیوں کرتی ہے"

"کام کیا ہم نہیں کرتے"

"بڑا کام کرتی ہو بچوں کو پیٹنا اور اس کے سوا تمہارے لئے کیا کام ہے۔ مگر آشا کوئی نوکر ہے"

"کام کرنے سے کوئی نوکر نہیں ہو جاتا اور پھر آشا کو بیاہ کر جانا ہے۔ وہاں کیا نوکر لگے ہوں گے۔ غریب گھر کی لڑکی"

"کیوں غریب گھر کی لڑکی سے کیا ہوتا ہے۔ وہ غریب گھر کیوں بیاہ کر جائے گی"

"غریب گھر نہیں بیاہ کر جائے گی تو پورن سنگھ جی تم کہیں سے اس کے لئے شہزادہ ڈھونڈھ لانا" وہ ایسے زور سے کہتی کہ سب ہی تو سن لیں اور پورن ڈر جاتا۔

"میں یہ تھوڑی کہتا ہوں بھابی تم تو چیخنے لگتی ہو۔ نہ جانے تمہارا گلا کیوں اتنا چوڑا ہے" پورن نیچی آواز سے کہتا اور بھابی کا بدلہ بھتیا غریب کے گالوں اور شیلہ کی توند سے لیتا

ہر ملک اور ہر زمانے میں بڑے بڑے مفکروں نے عورت کے بارے میں کوئی نہ کوئی رائے ضرور قائم کی ہے۔ کوئی صاحب اس کے حسن پر زور دے رہے ہیں تو کوئی اس کی پارسائی اور نیک سیرتی پر مُصر ہیں۔ ایک صاحب کا خیال ہے "خدا کے بعد عورت کا مرتبہ ہے"۔ تو دوسرے صاحب اسے "شیطان کی خالہ" بنانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ ایک صاحب فرماتے ہیں، "ایک دھوکے باز مرد سے ایک دھوکے باز عورت زیادہ خطرناک ہوتی ہے"۔ جیسے کوئی یہ کہے کہ ایک کالے مرد سے ایک کالی عورت زیادہ کالی ہوتی ہے۔ کس قدر شاندار بات کہی ہے کہ بس جھوم اٹھنے کو جی چاہتا ہے اور اگر میں خود عورت نہ ہوتی تو کہنے والا کا منہ چوم لیتی۔

عصمت چغتائی

چھوٹے بھیا

بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں حمل میں مرچیں زیادہ کھاؤ تو پیٹ میں جو بچہ ہوتا ہے وہ بالکل تیز مرچ پیدا ہوتا ہے جب پورن پیدا ہونے کو تھا تو شاید بڑی بہوجی نے مرچیں چابی تھیں۔ بس اُسے تو کسی کل قرار ہی نہیں تھا جب تک کالج میں رہا، خیر چھٹیوں میں طوفان آتا تھا۔ مگر اب تو وہ دو سال سے گھر پر ہی کسی مقابلہ کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ خبط بھلے چنگے کو نہ جانے کہاں سے ہو گیا تھا۔

گھر کی جائداد اتنی تھی کہ بیٹھ کر سات پشتیں مزے سے کھاتیں۔ مگر کالجوں میں لڑکوں کے دماغ گاؤں سے گھبراجاتے ہیں۔ دراصل قصور اپنے گاؤں کا ہے۔ وہاں ہے ہی کیا سوائے مال گزاری کے جس میں کسی کا دل لگے بے وقوف گدھوں سے بدتر انسان میلے بدہنگم ٹوٹے ٹیڑھے جھونپڑے سڑاندی پگڈنڈیاں، گندے نالے اور اُپلوں کی بھیانک قطاریں۔ نیم مردہ مویشی اور ننگے بچے۔ بھلا کیا دل لگے؟

ہاں تو پورن کی بوٹی بوٹی بے کل تھی۔ سارا دن وہ بھابی سے اُلجھتا۔ بچوں کو چھیڑتا۔ چھوکروں سے مذاق کرتا۔ اور چپکے چپکے بڑے بھیا پر جملے کسا کرتا۔

"بھابی سنتے ہیں کہ بھائی صاحب جب دنیا میں تشریف لا رہے تھے تو کالی بلی راستہ کاٹ گئی۔ بس دیکھ لو۔"

"ہوں ـــــ نہیں تو تمہاری طرح ـــــ ٹا تھ ہی تو ٹیں گے۔ میری بچی کا پیٹ کیا پتھر کا بنا ہوا ہے کہ صبح سے چٹکیاں لے رہے ہو۔"

"تمہیں تو اپنے بچوں کی پڑی رہتی ہے۔ بچوں کے باپ کی نہیں۔ بھئی نچے کرنا منع کرتا ہے ہر سال۔ مگر تمہارا حال صبح سے بڑے کھانا ٹٹول رہے ہیں.... بھابی میں کہتا ہوں کبھی تو ہنستے ہی ہوں گے بھائی صاحب کبھی اکیلے میں تو ـــ"

"ایسی جوتی ماروں گی پاجی ـــــ" اکیلے میں ہنسنے کے خیال سے ہی بھابی لال پڑ جاتی۔

بڑے بھائی ہی نہیں کیا وہ نوکروں کو چھوڑ دیتا تھا۔ جگلی کو تو باقاعدہ چٹکیں لگاتا۔ شیو کرتے میں صابن اس کے منہ پر مل دیتا۔ اس کی چٹیا پائے سے باندھ دیتا۔ وہ تو خیر جوان چھوکری تھی۔ اور کھل بھی جاتی تھی چھیڑ چھاڑ سے مگر بھولا کی تائی کا اور اس کا بھلا کیا جوڑ تھا۔ وہ غریب ٹوٹے پھوٹے کاٹھ کباڑ کی طرح کونے میں پڑی رہتی تھی۔ ڈھنگ سے سوجھتا بھی نہ تھا۔ جاڑوں میں تو خیر پرانا سوئیٹر یا کوٹ پہن لیتی ہوگی۔ مگر چلچلاتی گرمی میں تو اُسے کرتے سے پھانس لگتی تھی۔ دالان میں دھوپ بھی آجاتی تھی اور کوٹھڑی میں گھس بیلا کی اس لئے وہ ٹوٹا ہوا پنکھا لئے دالان میں ہی اونگھا کرتی۔ پورن اس کے پاس جا بیٹھتا۔

"اے بھولا کی تائی میں کہتا ہوں یہ جوانی کیوں خاک میں ملا رہی ہو۔"

بڑھیا صرف گھُنا کر دیکھتی اور منہ پھیر لیتی کہ شاید بلا ٹلنے سے بات مل جائے۔

"میں کتنا کہتا ہوں تم سے گر ـــــ بھئی ابھی عمر ہی کیا ہے"

"ارے ہٹ اُدھر۔ میا کیوں۔۔۔"

"یہی تو تمہاری نٹھورمانی مجھے نہیں پسند میں کہتا ہوں"

"کیا کہتا ہے؟" بھولا کی تائی کی آواز بڈھے مردے جیسی تھی۔

"ارے یہی کہتا ہوں ـــــ کہ ـــــ کہ تم کرتا کیوں نہیں بہنتی ہو تمام" وہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہ پاکر یہی کہتا۔

بڑھیا ڈھٹائی سے ڈٹی رہتی۔ بہرحال چھوکریاں یہ سن کر شرم سے گڑ جاتیں۔ بھابی بھی بات ٹالنے کو دوسری طرف متوجہ ہوجاتی جیسے اس نے سنا ہی نہیں۔

"ارے کیا بہنوں اب" بڑھیا فلسفہ چھانٹتی۔

"کیوں نہیں بہنو۔ کہو تو میں لا دوں دو چار پولکے؟"

"چل پولکوں کے لگے" بڑھیا کی بدمزاجی کم نہ ہوتی۔

"کتنا کہتا ہوں بھولا کی تائی کہ مہندی لگایا کرو، بگر مرکا جل" چھوکریاں ہنستیں اور بھولا کی تائی موٹی موٹی گالیاں بڑبڑاتی۔

"یہ تو چڑیلیں تم سے ملتی ہیں۔ بھولا کی تائی" اور وہ آہستہ آہستہ اس کے پاس کھسکتا۔

"ارے کیوں مجھ پر چڑھا چلا آئے ہے۔ اُدھر ہٹ بیٹا"

"مجھے بیٹا کہتی ہو؟" پوران سنجیدگی سے بُرا مانتا۔

"ہاں بھیا ذرا گرمی ہے اُدھر بیٹھو"

"ارے بھیا کہتی ہو مجھے؟" پوران اور بھی بگڑتا۔

"بیٹا نہ کہوں بھیا نہ کہوں تو کیا خصم کہوں تجھے؟" اور بڑھیا پھر موٹی موٹی مغلظات سناتی۔

"میں تو کہتا ہوں پھیرے کرا لو مجھ سے ـــــ کیا ہوگی تمہاری عمر؟"

"ارے کیوں شامت آئی ہے تیری۔ حرامی" بڑھیا بھرائی ہوئی آواز سے غرائی۔

"بھولا کی تائی جب گالیاں دیتی ہو تو بس جی چاہتا ہے کہ منہ چوم لے واہ ـــــ واہ"

اور پھر گالیوں کو غیر موثر پاکر بھولا کی تائی مارنے پر تل جاتی۔ لونڈیاں باندیاں لپیٹ میں آجاتیں اور وہ ان سب کو ننگی ننگی باتیں کہتی، یہاں تک کہ پوران بھی جھینپ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ بڑھیا بڑی بہو جی کے فریاد لے کر جاتی تو چھوٹی بہو اُلٹا چھیڑنے لگتی۔

"ارے بھولا کی تائی کرلونا۔ ایسا کیا بُرا ہے لڑکا"

مگر بھولا کی تائی کچھ ایسی باتیں کہتی کہ چھوٹی بہو سننے سے پہلے ہی دوسرے کمرے میں چلی جاتی۔

اُردو کی جارج ایلیٹ

عصمت چغتائی کو اُردو میں کم و بیش وہی رُتبہ حاصل ہے جو ایک زمانے میں انگریزی ادب میں جارج ایلیٹ کو نصیب ہوا۔ جس نے وکٹوریائی تصنع اور جھوٹی وضعداری کو بالائے طاق رکھ کر ایک مصنفہ کی حیثیت سے وہ باتیں کہہ ڈالیں، جو اُسے کہنی چاہیئے تھیں، اور جو صرف ایک عورت فن کار ہی موثر طور پر کہہ سکتی تھی۔ ممکن ہے کہ "توبۃ النصوح"، اور "شامِ زندگی"، کی ماری ہوئی ہماری موجودہ نسل عصمت کی تخلیقات کی اہمیت اور عظمت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے۔ لیکن یہ یقین ہے کہ کل کی مائیں اور خالائیں اُسے اپنے سینوں میں تڑپتا ہوا پائیں گی اور آج کل کی پڑھی لکھی شریف بیبیوں کی طرح اپنے شوہروں اور بھائیوں سے اُس کی گرمئ سخن کے شکوے نہیں کریں گی۔

مولانا صلاح الدین احمد

چمکی

چمکی اسی گاؤں کی تھی۔ جہاں آشا کی نانی مری تھی۔ اُسے سب چمکی اس لئے کہتے تھے کہ گاؤں کی ہر تیسری لڑکی کا نام لوگ چمکی ہی رکھتے ہیں آپ کالی گھمری بھجنگا لڑکی کو دیکھ کر بھی سوچیں گے کہ اس کا نام ضرور کلو یا آدھو وغیرہ ہوگا۔ لیکن وہ چمکی نکلے گی۔ مگر یہ چمکی تھی بھی چمکی۔ اس کی آنکھیں چمکتی تھیں گال چمکتے تھے اور بال تو لوہے کے پالش کئے تاروں کی طرح چمکتے تھے۔ اس کی کمر بھی چمکتی تھی۔ اور ہاتھ بھی چمکا کرتے۔ جب وہ ناچتی تو تارے سے تلپنے لگتے۔ آواز بھی اونچی اور پتلی تھی۔ آشا جیسی متی ایسی کمزور اور شرمیلی وہ تھی کہ سنو تو جی چاہے سو جاؤ۔ اس کی آواز پر تو سوتے سپنے جاگ پڑتے تھے۔ جب باہر جاتی تو دربان چپراسی اور اردلی سب گنگنا اٹھتے اور دھوبی ہمک کے بازوؤں میں بل آجاتا اور آواز اونچی ہو جاتی مگر وہ باہر نکلتی تو جتنوں نیں ناک پھڑکتی اور ہونٹ سکڑے وہ پیسے کے چار چار بھی نہیں پوچھتی تھی۔ یہاں تک کہ منشی جی جو خاصا الیف اے پاس تھے جب گھومی گھومی آنکھوں سے اسے دیکھتے تو وہ ایک جھٹکے کے ساتھ مڑ جاتی ہاں پورن کے گھونسے کھا کر جب اس کی کمر میں میٹھا میٹھا درد اٹھتا وہ کھل جاتی۔ وہ تھا بھی تو کتنا بے ڈھنگا۔ بیرا تو اس کا کام کر ہی نہ سکتا۔ سارے تو کپڑے جُر جاتے اور پھر لوکر کون اس کی چیزیں سنبھال سکتا تھا۔ ایک کپڑا نکالنا ہوتا تو وہ ساری الماری اولیچ کر پھینک دیتا۔ ایک جوتا پہنتا اور چار اٹھا کر در پٹختا اور کتابیں تو تاش کے پتوں کی طرح پھینٹ کر رکھ دیتا آئینہ کی میز پر جیسے کوئی غسل کر رہا ہو سب بھیگا ہوا اور جگہ جگہ صابن۔ پھر اگر چمکی صاف کرتی تو الٹی چٹکیاں اور گھونسے انعام میں ملتے۔

وہ صبح ہی صبح ایک مشغول داروغہ کی طرح اس کے کمرے کا انتظام شروع کر دیتی۔ اور بلا سے کوئی کام ہو یا نہ ہو۔ آشا کماری کا ہاتھ بٹانے کو بیٹھی پوریاں بیلا کرتی اور وہ تازے تازے پھول گلدانوں میں لگا کر پورن کا کمرہ گلزار کر دیتی۔

پہلے تو یہ چھوکریاں انجن گاڑی کے آگے آکر لیٹ جاتی ہیں اور پھر جب کچل جاتی ہیں۔ تو ہائے توبہ مچاتی ہیں بدنامی بے عزتی اور دنیا لٹنے کی دھمکیاں لے بیٹھتی ہیں۔ اور اپنا عیب غریب سماج کے سر تھوپتی ہیں تو چمکی بھی جان جان کر انجن کے آگے پسر جاتی تھی۔ وہ تو انجن ہی کچھ بے آگ پانی کا تھا کہ یونہی سیٹیاں دیتا دھواں اڑاتا پٹڑی بدل کر نکل جاتا تھا۔ پورن کا لاڈ گھونسے چٹکی سے آگے نہیں تھا۔ خیر جو گرجتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی برس ہی رہتے ہیں۔ دوسری نوکرانیوں کو اس کا یہ ڈھلانا ایک آنکھ نہ بھاتا۔ جلے کٹے جملے چلتے رہتے۔

"چوہیلے بلی بھی تو کھیلتی ہے۔ چوہیا اینٹھ جاتی ہے کہ وہ اس سے لاڈ کر رہی ہے۔"

قتا کا دماغ بڑا فلسفیانہ تھا اور تھی بھی چھ بچوں کی ماں۔

"اری گھس گھس کیئے جاتی ہے۔ یاد ہی کو سگی۔ ماجہ لوگوں کے بیٹے کا کیا ٹھکانہ" بھولا کی تائی چمکی کی رقیب تو نہ تھی۔

آشا سنتی تو کچھ نہ سمجھتی۔ پر وہ پورن سے ویسے ہی ڈرتی تھی۔ اُسے یاد تھا کہ ایک دن جب وہ شیلا کی فراک پر مشین چلا رہی تھی۔ پورن آن جما اور لگا باتیں بنانے

"ہر وقت کا کام۔ میں کہتا ہوں آشا ذرا میرا بھی کوئی کام کر دو۔"

"کیا کام ہے آپ کا؟" آشا مشین پر جھک گئی۔

"میرے کام ہزاروں! ابھی کہ میرے سب بٹن دھوبن توڑ لاتی ہے گریبان چاک پھرتا ہوں۔"

"کون سا بٹن ٹوٹا ہے؟ سارے تو ٹانک دیئے۔" ———

چمکی بگڑی۔

"تجھ سے کون کہہ رہا ہے؟ ——— میں تو کہتا ہوں آج تک تم نے آشا میرا بھی کوئی کام کیا اور تم! اتنا کام بھی کیوں کرو، کوئی کسی کی نوکر ہو؟"

"سب ہی کام کرتے ہیں۔ مفت کی روٹیاں کون توڑتا ہے۔" چمکی چاہتی تھی کوئی اس کی بھی سنے مگر پورن آشا کے پاس ہی کھڑا رہا۔

"اتنا کام کرتی ہے۔ اتنی دُبلی لڑکی۔ میں ماتا جی سے کہوں گا اتنا تو کام نہ لیں ——— اور ———"

"نہیں ——— میں ——— مجھے کام کرنا اچھا لگتا ہے۔"

"کچھ نہیں اور کوئی کیوں نہیں کرتا۔ یہ چمکی اتنی بھینس کی بھینس ہو رہی ہے یہ کیوں نہیں سیتی؟" حالانکہ چمکی برابر بھابی جی کی ساڑھی ٹانک رہی تھی۔ آشا اُس کی بھڑکی ہوئی آنکھیں دیکھ کر کانپ گئی۔

"بس جی ہٹاؤ سینا!" پورن نے کپڑا کھینچا۔

"جی نہیں!" آشا کا جی چاہا کہ مشین میں گھس جائے۔

"میں کہتا ہوں مت سیو نا!"

"شیلا کہیں باہر جا رہی ہے۔ جلدی ہے!"

"کچھ جلدی نہیں!"

"اچھا تو لو سیو!" اور پورن نے مشین کی سوئی کے آگے انگلی رکھ دی!

"ادھر یہ قینچی ماری پیٹی" چمکی نے زور سے قینچی پٹخی آشا اُچھل پڑی اور چمکی دروازہ دھڑ دھڑاتی چل دی۔

"یہ چڑیل کیوں غصہ ہوتی ہے۔ آشا تمہارے قینچی لگی تو نہیں۔ میں ابھی ٹھیک کرتا ہوں بھتنی کو!"

"چھوٹے بھیا اگر آپ یونہی ہمارے سر پر سوار رہے تو ہم سے کام ہو چکا!" لتا چمکی کی شکست سے دل میں کھلی جا رہی تھی۔

"اری لتا بڑی بدمزاج ہے۔ تو کیوں چڑتی ہے۔ تجھ

جارحانہ منفی محبت

عصمت پرلے درجے کی ہٹ دھرم ہے۔ طبیعت میں ضد ہے بالکل بچوں کی سی۔ زندگی کے کسی نظریئے کو فطرت کے کسی قانون کو پہلے ہی سابقہ میں کبھی قبول نہیں کرے گی۔ عصمت کے زنانہ اور مردانہ کرداروں میں بھی یہ عجیب و غریب ضد یا انکار عام پایا جاتا ہے۔ محبت میں بُری طرح مبتلا ہیں، لیکن نفرت کا اظہار کئے چلے جا رہے ہیں۔ جی گال چومنے کو جاتا ہے۔ لیکن اُس میں سُوئی کھبو دیں گے۔ ہولے سے تھپکنا ہو گا تو ایسی دُھول جمائیں گے کہ دوسرا بلبلا اُٹھے۔ یہ جارحانہ قسم کی منفی محبت جو محض ایک کھیل کی صورت میں شروع ہوتی ہے، عام طور پر عصمت کے افسانوں میں ایک نہایت ہی رحم انگیز صورت میں انجام پذیر ہوتی ہے۔ عصمت کا اپنا انجام بھی اگر کچھ اسی طور پر ہوا اور بعد میں اُسے دیکھنے کے لئے زندہ رہا تو مجھے کوئی تعجب نہ ہو گا۔

سعادت حسن منٹو

سے تو میں بول بھی نہیں رہا۔"

"بس بس بھیّا ہم سے یہ ـــــ واہ کوئی بات ہے جانتے ہو کہ"

"اگر تم بجائے یہاں چھوکریوں کے ساتھ وقت گنوانے کے باہر آن بیٹھتے تو کیا اچھا ہوتا۔" بھیّا دروازے میں کھڑے تھے۔ پورن کھسیانہ ہو کر سگریٹ بجھانے لگا۔

"دو گھنٹے سے سیٹھ ٹیکارام بیٹھے دماغ چاٹ گئے کچھ کام نہ کرنے دیا۔ تم ہوتے تو میں ذرا دفتر چلا جاتا۔"

"بھیّا میرے سر میں تو اتنی طاقت ہے نہیں کہ ٹیکارام جی کی بکواس برداشت کروں۔" پورن منہ بنانے لگا۔

"کچھ بھی ہو۔ بہر حال تم باہر جاکر بیٹھو۔"

"اچھا ہوا ڈانٹ پڑی۔ اب ٹھیک ہو گئے۔" لتا مسکرائی، دروازے پر بجلی سے ٹکر ہوئی۔ وہ بھنّاتی ہوئی نکلی۔ پورن نے چٹکی بھری پسلی ہیں۔ سارا میل دھل گیا۔ چٹکی چمک رہی تھی۔ غصہ سے نہیں۔

پھول

کھانے کا کمرہ ـــــ برآمدہ، بھابی جی ـــــ بڑے بھیّا اور ـــــ ہم! آشا نے گلدان گنتے گنتے چونک کر پیچھے دیکھا پورن دیا سلائی چبا رہے تھے۔

"میرے کمرے میں تو پھول بھی نہیں لگائے جاتے۔"

"لگائی تو ہے چمکی......"

"پھر وہی چمکی۔ چمکی لگاتی ہے تو کیا سارے گھر میں تو پھول لگائے جائیں اور ہمارے کمرے میں نہیں۔ آج شکایت کروں گا۔"

"تو لگا دوں گی آپ کے کمرے میں بھی۔" اور وہ بچے ہوئے پھولوں میں سے چننے لگی۔

"جی نہیں۔ یہ مرے ہوئے سفید پھول نہیں۔ جیسے کسی مُردے پر ڈالے جا رہے ہوں۔ یہ لگایئے سرخ والے۔ تو پھر آشا نے وہی لال لال پھول پورن کے یہاں لگا دیئے۔ مگر اس کا دل دھکڑ پکڑ کرتا رہا۔ جیسے وہ چوری کر رہا ہو۔ اس نے کبھی اشد ضروری کام کے بغیر پورن کے کمرے میں قدم نہ رکھا تھا۔ اور جو چمکی آجائے تو؟

اور کھانے کے وقت پورن نے آہستہ سے اُسے پھول لگانے کے شکریہ میں نمستے کیا۔ وہ جلدی سے تھالی لے کر بھاگ آئی۔ جب دوپہر کو وہ برآمدے کے پاس سے ہو کر اپنے کمرے میں جانے لگی تو جیسے کسی نے اُسے ٹھوکر مار دی لال لال پھول موری کے پاس بکھرے پڑے تھے۔ تیز تیز قدم اٹھاتی وہ اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی۔

"یہی سزا ہے تیری گستاخی کی!" وہ زمین پر لیٹی لیٹی اپنے جی میں کوستی رہی جیسے کوئی بڑا واقعہ ہو گیا۔ شرم خود سے نفرت اور نہ جانے کیا کیا خیالات اس کے پریشان دماغ میں گھومنے لگے۔ مرجھا بھی تو گئے نہ جانے کب سے پڑے ہوں گے بیچارے۔ پُر کچھ بھی تو گئے۔ وہ سوچا کی۔ ایک مخصوص سیٹی کی آواز پر وہ چونک پڑی، ویسے تو اُسے کام میں اتنی فرصت نہ ہوتی کہ کچھ دیکھے اور دیکھا بھی کب جاتا تھا۔ مگر اکیلی کوٹھڑی میں جہاں کوئی نہ جا سکے وہ دو زمین سے زمین پر لیٹ کر دیکھتی تھی۔ وہ شریر مسکراتا ہوا چہرہ غور سے دیکھنے میں کیسا ہے۔ دن

میں ہزار مرتبہ دیکھ کر بھی وہ اس کی ایک ایک ادا نہ یاد کر سکی تھی، بات یہ تھی وہ دیکھتی ہی نہ تھی۔ چپّلوں میں بڑے بڑے سبز پیر اور دھاری دار پاجامہ کا کچھ حصہ آکر پھولوں کے پاس ٹھٹک گیا۔ جیسے ٹھوکر لگی۔ آشا کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ زمین سے چمٹ گئی! جی چاہتا تھا اسی زمین میں ڈوب جائے۔ اُسی نے تو یہ لال لال پھول چنے تھے۔

"یہ کس نے تازہ پھول پھینک دیئے۔ مفت کا باغ ہے نا۔" آواز آئی اور چپلیں برآمدے میں چلی گئیں۔ آشا دیر تک ماتھا ٹیکے زمین پر لیٹی رہی۔ اسی زمین نے تو پھول کھلائے ہیں لال لال!

جب وہ شام کو چھوٹے منّے کی گاڑی ہکٹے سے لوٹ رہی تھی تو پورن نے آکر بچے کو پیار کرنا شروع کیا۔

"ارے منّے تیرے گال تو جی چاہتا ہے کھا جاؤں اور تو کتنا نٹ کھٹ ہے۔ مُنّے تو بڑا چکا بنا رہتا ہے پر میں خوب جانتا ہوں، ہے تو بہت خراب، ہر وقت کا کام مجھے تو ہر وقت کام رہتا ہے۔ بھگوان کرے یہ کام تو دنیا ہی سے مٹ جائے۔ یہ نہیں کہ تو کبھی کسی سے بات بھی کرے" آشا چپکی کھڑی ہینڈل گھماتی رہی۔ "بات کرو یہ ہے کہ تو سمجھتا ہے ہم بُرے ہیں۔ ہوّا ہیں تجھے کھا جائیں گے۔"

پورن نے سر اوپر اٹھا کر دیکھا۔ آشا اس کی آنکھیں دیکھ کر ڈر گئی۔ "تم سمجھتی ہو کہ ہم شیر ہیں۔ پھاڑ کھاتے ہیں۔" اب وہ براہ راست آشا ہی سے کہہ رہا تھا۔ مگر خطاب منّے ہی سے تھا۔ "اور کیا عجب اگر دو بول تو ابھی کھلا ہی لیں۔" آشا کی پریشانی سے اُسے شاید رحم آ گیا۔ اور پھر جھک گیا۔

"اور منے ـــــ ہم نے وہ پھول اٹھا لئے ـــــ دیکھو نا چکی بڑی بُری ہے۔ کیوں ہے نا؟ ـــــ" ہاں وہ تو بُری ہے ہی۔ وہ پھول لال لال منّے کے گالوں جیسے۔ ہم نے اپنی دراز میں ڈال دیئے ہیں۔ ۔ گنتا۔ ہاں اور بھی تمہیں ڈھیر سا کام ہو گا ـــــ اور کیا!"

"جایئے تشریف لے جایئے۔ جایئے" آشا گاڑی بڑھاتی چلی آئی۔

جب وہ اُن لال لال پھولوں کی کیاری کے پاس سے گزری تو سارے پھول آہستہ آہستہ مسکرا رہے تھے۔ آنکھیں بند کئے مسکرا رہے تھے!

اگر میں اور عصمت واقعی میاں بیوی بن جاتے تو کیا ہوتا؟ یہ "اگر" بھی کچھ اسی قسم کی اگر ہے کہ اگر کہا جائے کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ایک انچ کا اٹھارہواں حصہ بڑی ہوتی تو اس کا اثر وادیٔ نیل کی تاریخ پر کیا پڑتا۔ لیکن یہاں نہ تو عصمت قلوپطرہ ہے اور منٹو انطونی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر منٹو اور عصمت کی شادی ہو جاتی تو اس حادثے کا اثر عہدِ حاضر کے افسانوی ادب کی تاریخ پر ایٹمی حیثیت رکھتا۔ افسانے افسانے بن جاتے۔ کہانیاں مُڑ تُڑ کر پہیلیاں ہو جاتیں۔ انشا کی چھاتیوں میں سارا دودھ خشک ہو کر یا تو ایک نادر سفوف کی شکل اختیار کر لیتا یا بھسم ہو کر راکھ بن جاتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ نکاح نامے پر ان کے دستخط اُن کے قلم کی آخری تحریر ہوتے، لیکن سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ نکاح نامہ ہوتا۔ زیادہ تر قیاس تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نکاح نامے پر دونوں افسانے لکھتے اور قاضی صاحب کی پیشانی پر دستخط کر دیتے تاکہ سند رہے۔

سعادت حسن منٹو

ہولی

موسم بھی انسان سے کھلونے کی طرح کھیلتا ہے۔

گرمیوں میں جی چاہتا ہے۔ برف کے سمندر میں کود پڑیں۔ اور کوئی بولے تو منہ پر ماریں۔ گھس گھس گرمی، ہلکا ہلکا درد، پنکھا نہیں تو معلوم ہو کوئی اُبال رہا ہے۔ ہوتے ہوئے پنکھا چلاؤ تو سر گھوم جائے۔ توبہ! اور جاڑے سستی۔ نیند۔ ٹھنڈ ٹھنڈ۔ ہر چیز ٹھنڈی۔ دل بھی ٹھنڈا۔ بسنت آئی اور کھلے پھول۔ سوئی سوئی چیزیں کھکلائیں۔ بے بات رگ رگ میں شرارت تے چنچل پن شروع کیا بے چینی نے گدگدانا شروع کیا۔ اور ہولی پو پھٹ پڑا پہاڑ۔ اگر ہولی نہ آئے تو یہ دل دیوانہ ہو کر چھاتی پھاڑ کر نکل بھاگے تھا در یا کتنی دیر تھمے! اور پھر جب بند ہیں دم بھی ہے۔ مگر بند باندھیں ہی کیوں، ہولی کے دن تو آشا بھی جھوم نکلی۔ بھابی کی تو خیر صبح سے حد گت ہی تھی۔ رنگ کی ڈلی بنی ہوئی تھی۔ تین دھوتیاں بدل چکی تھی۔ اور پھر بھی کھال تک میں رنگ اتر گیا تھا۔ یہ گلال میں کیا تاثیر ہوتی ہے کیا کوئی کیمیاوی جزو ایسا بھی ہوتا ہے جو شراب کا اثر رکھتا ہے۔ جتنا ملو اتنا ہی انسان پر بھوت سوار ہو جاتا ہے۔

آج تو بڑے بھیا بھی نہ بچے تھے۔ بھابی کے بعد آشا نے اُن ہی کی گت بنائی۔ بھر بھر بالٹی وہ انہی پر ڈالتی تھی اور گال بھی تھوپا اور خود کیا پھرتی سے سانپ کی طرح پھسل جاتی۔ اور ادھر پورن نے میدانِ حشر برپا کر رکھا تھا۔ جب بھابی اوندھی لیٹ گئی تو وہ بھولا کی تائی پر پھیل پڑا۔

"ارے لنڈے میرا تیرا کیا میں" وہ مردانہ آواز میں غرّائی "تارے بھولا کی تائی۔ میرے سوا کس سے ہو ہے۔ دیکھو گے ہر جنم میں تم ضرور میری تھیں جبھی تو" چھلیے ہوئے بالوں میں ابرق اور گلال تے گلزار کھلا دیئے اور پھر بھولا کی تائی کی پر معنی اور رفیق لگا یاں۔ "ارے پورن ذرا اسے آشا کو لے" بڑے بھیا اپنا پیچھا چھڑانے کو بولے "اب اسے بھگتو تو جانوں۔ ڈال۔ ارے ڈال"

لوگ چاروں طرف سے آشا کو شہ دینے لگے اور وہ سٹ پٹائی پورن پورے جلال سے بڑھتا آ رہا تھا۔

پانی تو اُس نے گلاس بھر کر ڈال دیا۔ گلال کا ہاتھ رُک گیا۔ اس کے منہ پر رنگ نہ ہوتا تو کوئی دیکھتا کہکشاں کی بہار۔ پورن کیوں چوکتا۔ اس نے تو اسے بے دم کر دیا پھر پھسلن ناک منہ آنکھوں میں رنگ بدلیاں چھائی ہوئی اور آشا کا گھبرایا ہوا دل۔ پیر جو پھسلا تو برآمدے سے نیچے۔

"مار ڈالے گا ـــــ پورن کے بچے" بھابی چیل کی طرح جھپٹی۔

"دیکھو تو کیسا سوجا ہے" بھابی پیار سے آشا کا پیر سینکتی جاتی تھی اور پورن کو صلواتیں سنا رہی تھی "آپے میں تھوڑا رہتا ہے"

"ارے بھابی اب چھوڑ دو بھی۔ پورن آ کر پاس ہی بیٹھ گیا اور روئی سینک سینک کر بھابی کو دینے لگا۔

"شرم نہیں آتی ـــــ یہ نہیں دیکھتے۔ دیو کے

دبلو اور یہ ذرا سی چھوکری ـــــ مہیش سے کھیلتا تب بتا تا وہ تجھے " بھابی اپنے بھیا مہیش کو بس جانے کیا سمجھے تھی۔

" مگر بھابی کوئی لڑکوں سے بھی ہولی کھیلتا ہوگا۔ مہیش سے کیوں کھیلتا "

" تو پھر تجھے اس کمزور ننھی پر ہی بس چلا آتا ہے "

" میں جاؤں بھابی " بھابی غور سے سننے لگی " یہ کرو کہ ایک چھری لو اور گردن پر چلا دو۔ سمجھیں "

" ہائے رام! ــــ مگر ــــ "

" میں ــــ میں ــــ ن " کوئی رویا اور بھابی چھٹی پوُرن روٹی سینکتا رہا۔

" خوب ڈانٹ پڑوانے کی ترکیب نکالی " وہ روٹی آشا کے پیر پر رکھنے لگا۔ آشا نے روٹی لینی چاہی۔

" میں سینک دوں۔ پھر بھابی سے ڈانٹ ڈلواؤ گی؟ "

" مگر آشا نے دونوں ہاتھوں سے پیر چھپا لیا " اب اچھا ہوگیا "

" خوب اتنی جلدی اچھا بھی ہوگیا؟ "

" ہاں آشا نے جلدی سے فیصلہ کیا۔

" میں کہتا ہوں ! ــــ بھئی ! ــــ وہ لاچار ہوگیا۔

" دیکھو پھر میں کہہ دوں گا۔ بھابی سے وہ ڈرانے لگا۔

" کیا کہہ دیں گے ؟ " آشا پریشان ہوگئی ــــ کتنے بہت سے چور تھے اس کے دل میں!

" یہی میں کہہ دوں گا ــــ فوراً کہہ دوں گا " آشا ڈر کر تعجب سے اس کا چہرہ تکنے لگی " ہاں اب ٹھیک ہے " وہ اس کا پیر سینکنے لگا۔

" دیکھو بات یہ ہوئی ــــ یہ بات ہوئی " وہ آشا کو باتوں میں لگا رہا تھا.... آشا سانس روک کے ایسے سن رہی تھی گویا اب اس نے کوئی اہم راز کھولا اور اب کھولا۔

" سنو میں یہ کہہ دوں گا۔ میرا مطلب ہے اگر تم پیر ٹھیک سے نہ سینکیں تب ــــ کہہ دیتا۔

" کیا؟ " آشا نے سراپا انتظار ہو کر کہا۔

" یہ کہہ دوں گا.... آشا مجھ سے نفرت کرتی ہے "

بھابی آگئی اور آشا گھبرا گھبرا کر انگلیوں سے پیر مسلنے لگی۔ چوٹ کیسے دکھتی ہوئی چوٹ تھی۔ نفرت! نفرت تو آشا نے کسی سے کرنا سیکھی ہی نہ تھی۔ اور پوُرن سے وہ ــــ نفرت!

چور پتا

ایک ذرا سی محبت کی دنیا میں کتنے شوکت، کتنے محمود، عباس، عسکری، یونس اور نہ جانے کون کون تاش کی گڈی کی طرح پھینٹ کر بکھیر دیئے گئے ہیں۔ کوئی بتاؤ، ان میں سے چور پتّہ کونسا ہے؟ شوکت کی بھوکی بھوکی کہانیوں سے لبریز آنکھیں، محمود کے سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے اعضاء، عسکری کے بے رحم ہاتھ، یونس کے نچلے ہونٹ کا سیاہ تل، عباس کی کھوئی ہوئی مسکراہٹیں اور ہزاروں چوڑے چکلے سینے، کشادہ پیشانیاں، گھنے گھنے بال، سڈول پنڈلیاں، مضبوط بازو۔ سب ایک ساتھ مل کر پکے سوُت کے ڈوروں کی طرح اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ پریشان ہو ہو کر اس ڈھیر کو دیکھتی ہوں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کونسا سرا پکڑ کر کھینچوں کہ کھنچتا ہی چلا جائے اور میں اُس کے سہارے دُور اُفق سے بھی اوپر ایک پتنگ کی طرح تن جاؤں۔

عصمت چغتائی ــــ افسانہ "چھوٹی آپا" سے

آنکھ مچولی

پورن ایسا بچہ تو نہ تھا جتنا بقول بھابی بنتا تھا اُسے لاڈ میں ہمیشہ بچہ ہی سمجھا گیا۔ اور پھر چلبلا پن طبیعت کا بچہ بنائے رکھتا تھا۔ جہاں اُسے موقع ملا اور نوکروں کے اور گھر کے بچوں کے ساتھ مل کر اودھم مچانا شروع کردی میلے سڑے بچے ننگے پیر کرسیوں گدوں پر چڑھ جاتے۔ وہ اودھم مچتی کہ بھابی کا سر گھوم جاتا اور ڈنڈا لے کر سارے بچوں پر پل پڑتی۔

دو روز بعد کملا جی اپنے میکے آ رہی تھیں۔ بھابی نند کی خاطر سارا گھر جھاڑ پھینک رہی تھی۔ کئی دن سے پورن کے لئے تو گھر مصیبت ہو گیا تھا۔ جدھر دیکھو جھاڑ پونچھ، دم الٹ گیا۔ اس کے خود کے کمرے پر بھابی کا راج تھا۔ نند کے ساتھ نندوئی بھی آ رہے تھے اور ماتا جی کا گھبراہٹ کے مارے برا حال تھا۔ بڑے جاگیردار تھے اور پھر سمدھیانہ، کیا عجب اور سمدھیانہ ٹر جائے، کملا کی چھوٹی نند شانتا کنواری تھی اور پورن بھی اب جوان ہو گیا تھا

پورن بچوں کے ساتھ نہ جانے کس وقت ڈرائنگ روم میں گھس آیا اور شروع ہو گئی آنکھ مچولی۔ جب آشا شامتِ اعمال سے کمرہ درست کرنے آئی تو غدر برپا تھا

"باہر جائیے! کمرہ صاف ہو گا" اس نے کاروباری لہجہ میں کہا۔

"جی ہاں" اس نے آہستہ سے کہا اور کرسیاں ہٹانے لگی۔

"جی نہیں...... انہیں ہو گا۔ سارے کمرے صاف ہی ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ واہ ــــــ ! ہم یہاں کھیل رہے ہیں۔ آؤ تم بھی کھیلو آشا!

"ہاں ــــ ہاں ــــ" بچے چمٹ گئے۔

"ہاں بھئی یہ بھی کھیلیں گی۔ دائی بنیں گی۔"

"نہیں۔ میں نہیں کھیلتی۔ نہیں بھئی میں نہیں" مگر پورن نے اُسے پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا۔ "ہاں بھئی اب شروع کرو ہم چور" اور وہ زمین پر پسکڑا مار کر بیٹھ گیا

"لو بھئی ایمان داری سے آنکھ میچو" اس نے آشا کے گھٹنے پر ماتھا ٹیک دیا۔

"جی نہیں۔ بھابی نے کہا ہے"

"کچھ نہیں کہا ہے ــــ ہاں میچو ــــ جلدی جلدی" اور وہ اس کی ساڑھی کے آنچل سے اپنی آنکھیں باندھنے لگا۔

"بھئی چا چا بے ایمانی کی نہیں" نرمل بیوپاری کا بیٹا تھا نا

"ارے یہ تمہاری آشا جی ہی بے ایمانی کر رہی ہیں دیکھو ایمان داری سے میچو ــــ یوں ــــ ایسے ہاں" آشا کے دونوں ہاتھ پورن نے اپنی آنکھوں پر رکھ لئے۔ آشا کے حواس غائب! گھڑی گھڑی بھاگنے پر تیار مگر بچے چھپ گئے اور کھیل شروع بھی ہو گیا۔

"دیکھو بھئی یہ بے ایمانی ہے" آشا نے ہاتھ چھڑانا چاہا۔

"ہاں ــــ کھا جاتا ہوں۔ آخر تم مجھ سے اتنا ڈرتی کیوں ہو۔ تمہارا ڈر نکال کر چھوڑوں گا۔ سمجھیں آشا دیوی! سنو میں نے تمہیں کبھی دُکھ پہنچایا ہے۔ جو تم مجھے دیکھتے

ہی گھبرا جاتی ہو۔ آشا آخر کیوں بھیّا سے خوب بولتی ہو۔ بھابی سے گُھل گُھل کر باتیں ہوتی ہیں۔ بھولا کی تائی تک سے ہنس ہنس کر دوستی کی جاتی ہے۔ ایک میں ہی ہوں۔ بولو۔“

وہ آنکھیں کھولے آنکھ مچولی کے قوانین توڑ رہا تھا مگر آشا کی بُری حالت تھی۔

”چھوٹے بھیّا! دیکھئے۔ اچھا میں پھر کمرہ صاف کرلوں گی۔ آپ کھیل لیجئے!

”میں کھیل رہا ہوں ـــــ پورن کی آنکھیں بڑے بھیّا سے بھی زیادہ سنجیدہ تھیں ـــــ تمہیں میں ہر وقت ہی کھیلتا نظر آتا ہوں۔ یہ سب کھیل ہے زندگی ـــــ میری زندگی ـــــ میری ـــــ میری تمام باتیں ـــــ یہ سب کھیل ہیں؟ تم اسے کھیل سمجھتی ہو آشا؟

”میں تم سے کھیل رہا ہوں؟ ـــــ تمہیں کیسے یقین دلاؤں آشا؟“

”چھوٹے! کوئی بچہ پکارا۔

”کہ یہ کھیل ـــــ میں کھیل نہیں رہا ہوں آشا۔ سنو! میں۔ میں“ وہ پریشان ہو کر اپنے ہونٹ چبانے لگا۔

”ارے بھئی چھوٹے!! فدا بے چین ہو کر نرمل بولا۔ صوفے کے پیچھے جھکے اس کی گردن دُکھ گئی تھی۔

”تم..... کھیل نہ سمجھو! پرماتما کے لئے۔ کوئی میں بچہ ہوں۔ سنو آشا تم اگر مجھ سے نفرت کرتی ہو تو ٹھیک بات ہے۔ بالکل ٹھیک۔ اب میں سمجھ گیا تم مجھ سے نفرت کرتی ہو۔“

آشا بے کلی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے بمشکل پورن کی طرف دیکھا۔ وہ کوئی بچہ نہ تھی۔ بلکہ بدقسمتی سے وہ بچہ نہ تھی۔ وہ خوب سمجھ رہی تھی۔ آج سے نہیں نہ جانے کتنے دن سے اس کا رُواں رُواں سمجھ رہا تھا۔

”بھابی آتی ہوں گی“ اس نے ں کا سر ہٹانا چاہا۔

”چاچا ـــــ بھئی چھوٹے ـــــ ہم نہیں کھیلتے۔ شیلہ بڑبڑائی کہیں کونے میں سے۔

”بس میری بات کا جواب دو۔ تمہیں مجھ سے نفرت ہے؟“

”آشا کو تھوڑی دیر تک سر اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی اور پھر وہ آنکھیں تو اُٹھانے کا ہنر رہی تھی۔ مگر اس نے ہمت کی نہ جانے کیسے بس سر اُٹھا کر اس نے پورن کی آنکھوں میں اپنا جواب ڈال دیا۔ اور پھر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں پر جھک گیا۔

”آشا بھابی کی آواز آئی ـــ پورن جیسے سکتے میں بیٹھا خوب پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سنجیدگی جو ذرا دیر پہلے اس کے چہرے کو نیم مردہ بنائے تھی۔ یک لخت کافور ہو گئی ایک سیکنڈ کو وہ رُکا اور پھر چھوٹے ”مسرت اور جذبات کا چشمہ سا بہہ نکلا اور وہ بچوں میں اُلجھ گیا۔ آشا جیسے کچھ بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے انگیٹھی کے پاس جھک گئی۔ وہ ڈر کے مارے آنکھیں میچے ہوئے جلدی جلدی قالین پر ٹٹول رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا۔ زمین میں اُترتی چلی جائے۔ اور ٹھیک اس کے کلیجے میں چھپ جائے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ بھابی نے بمشکل چیخ پکار میں چلّا کر پوچھا۔

”آنکھ مچولی ـــ بھابی ـــ! پورن نے مست شرابی کی طرح جھوم کر کہا: ”آؤ تم بھی کھیلو“

”چولھے میں جائے آنکھ مچولی۔ آشا، یہ کمرہ صاف ہو رہا ہے؟“

”بات یہ ہے بھابی کہ ہم آنکھ مچولی کھیل رہے تھے اور آشا جی دائی بنی تھی:“

”ہاں ـــــ اور ـــــ بھابی دائی بنیں گی“ وہ بھابی کو گود میں اٹھا کر گھومنے لگا۔

”ہائے پورن ـــــ ارے پورن ـــــ چھوڑ مجھے“ بھابی کے گدگدیاں آتی ہوئیں کہ وہ بچوں کو ڈانٹنا بھول بھال اپنی جان چھڑانے لگی۔

دیورانی

دیور جتنا چٹپٹا لفظ ہے اتنا ہی دیورانی سوکھا ساکھا۔ جب تک دیورانی نہیں آتی بھابی ہی گھر کی رانی ہوتی ہے اور دیور جی کی دلچسپی کا مرکز! ادھر آئی دیورانی اُدھر چلا دیور۔ اب وہ ہر بات آکر بھابی ہی کے کان میں نہیں کہتا بلکہ چپکے چپکے اپنی رانی سے بھابی کی شکائتیں سن سن کر زہر یلا کانٹا بنتا جاتا ہے۔ وہی بھابی جسے دیکھے بنا کھانا کڑوا لگے جسے رُلانے میں مزہ ملے اور روٹھنے پر گلے میں بانہیں ڈال دے کوئیں۔ جب رانی آجاتی ہے۔ تو "نمستے بھابی جی" رہ جاتی ہے۔

"بھابی تب تو دو ہو جائیں گے۔ وہ تیری گت بنائیں گے کہ یاد ہی کرے گی" بھابی کی شادی کے ذکر پر بولا۔

"آہنہ! دو ہو جائیں کہ چار ہو جائیں۔ تم بھی سدا تھوڑے اور وہ بھی!"

"اور بھابی تم اُسے مارو گی۔ جی نہ دکھے گا تمہارا!"

"شرارت کرے گی تو پٹے ہی گی!"

"اور جو وہ بہت بھولی بھالی ہوئی تب؟" اور اس نے آشا کو اچٹتی ہوئی نگاہ سے دیکھا جو منّے کو لئے گھاس پر ذرا دور بیٹھی تھی۔

"بھگوان نہ کرے جو تیری بہو بھولی ہو۔ چبا ڈالے گا تو پھر اُسے۔"

"ارے بھابی ـــــ توبہ توبہ ـــــ کوئی میں کتا ہوں۔ واہ کیا سمجھ لیا ہے تم لوگوں نے مجھے؟"

"بس ہم تو کوئی سندر سی ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"ڈھونڈ رہی ہو ـــــ واہ کب تک ڈھونڈو گی! جب بوڑھا ہو جاؤں گا۔ تب ڈھونڈ چکو گی۔"

"ہے تو بھئی ایک نظر میں ـــــ ایسی سُندر ہے کہ کیا بتلایئے۔"

"سچ بھابی؟ اور میری بھی نظر میں ایک بہت سُندر سی ہے"

"آشا جلدی سے منّے کے سر کی آڑ لینے لگی۔ بہانہ ملتا تو وہ کبھی کی بھاگ گئی ہوتی۔

"بھلا کہاں ہوتی تمہاری نظر میں؟ ـــــ چل جھوٹے پورن تو نے دیکھا ہے ـــــ کملا کی نند کو۔"

"کملا کی نند کو تو نہیں۔ ہاں ـــــ کمل دیکھا ہے۔"

وہ آشا کی آنکھیں ڈھونڈنے لگا۔ مگر وہ ایسے گھاس کو گھور رہی تھی گویا اس میں کہیں گھسنے کے لئے سوراخ تلاش کر رہی ہو۔

"کیا شانتا بھی آ رہی ہے؟" بڑے بھیا جی بولے۔ جو ذرا ہٹ کر آرام کرسی میں لیٹے اخبار پڑھ رہے تھے۔

"نہیں۔ آ تو نہیں رہی ہے۔ پر تم نے دیکھا ہے اُسے۔"

"ہاں چھوٹی سی کو دیکھا تھا۔ ایف اے میں پڑھتی ہے شاید؟"

"اور کیا؟" بھابی منّے کو سنبھالنے لگی۔ جو آشا کے پاس سے رینگ آیا تھا۔ اور وہ کچھ کھوئی سی بھاگنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ اٹھنے ہی والی تھی کہ بھابی بولی۔

"آشا اسے لے جاؤ ـــــ آشا لینے لگی مگر منّا اکڑ گیا۔ اور پورن پر چڑھ آیا۔

"دیکھو بھابی کتنا ہی مارتا ہوں مگر بڑا ہی ڈھیٹ ہے۔ ہنستا ہی رہتا ہے۔"

"تم نے ہی کر دیا ڈھیٹ اُسے۔"

"بھئی بھابی اپنی دیورانی تو تم منے کی شکل کی ڈھونڈ کر لانا۔" آج دیورانی کے ذکر میں پورن کو چاٹ کا مزہ آ رہا تھا۔

"اوہو ——— کیا مثال دی ہے۔ اُس بندر کی شکل کی۔"

"اچھا تو پھر اپنی شکل کی لانا ——— منی سی، دبلی پتلی یہ کیا بات ہے کہ بھابی تمہارے چندر جیسے بھائی تو ہیں اور بہن ایک بھی نہیں۔"

بھابی اپنی ننھی سی بہن کو یاد کرنے لگی جو چیچک میں مر گئی ورنہ اس سے اچھی دیورانی کون ہو سکتی تھی۔ اور وہ اس کا ذکر کرنے لگی کہ کیسے گھٹنیوں وہ چلتی تھی۔ اور تتلاتی اور اس سے لڑتی تھی۔

"اے ہے بھابی بھلا اتنی سی توتلی بیوی کس کام کی؟"

اُردو کا عظیم افسانہ نگار
کرشن چندر
اُس کی نثر شاعری سے زیادہ خوبصورت ہے۔
"قافلہ" نے اس عظیم ادیب پر بھی
کرشن چندر نمبر
شائع کیا ہے کرشن چندر کی کہانیوں اور ناولوں کا بھرپور اور جامع انتخاب۔ کرشن چندر کی شخصیت پر لکھے گئے زندہ رہنے والے خاکے اور تنقیدی مضامین۔ ——— قیمت ۱۰.۰۰ روپے
مکتبہ شاہکار
پوسٹ بکس ۷۵۴، ایکلفٹن کالونی لاہور

"اوئی تو کیا وہ اب بھی توتلی ہی ہوتی۔ نرل سے چار سال بڑی تھی۔ خاصی بارہ تیرہ کی ہوتی۔"

"اونہہ یہ بات نہیں پسند آئی ——— بھئی یہ آخر بڑے بھیا میں کیا لال جڑے ہیں، کہ ان کی بیوی اتنی اچھی۔ بھیا ہر بات میں اوّل رہتے ہیں۔ دنیا میں پہلے آپ آئے اور پہلے ہی سے اچھی بیوی جھپٹ لی۔ آخر میں کیوں پہلے نہ پیدا ہوا؟"

"چل پگلے۔" بھابی شرما گئی اور بڑے بھیا بھی بیوی کی تعریف حسن سے جھینپ کر مسکرانے لگے۔ یہ پورن ہمیشہ ایسے ہی بکا کرتا تھا۔

"ارے" پورن اپنے قلم کا دردناک حشر دیکھ کر تڑپ گیا بھیا نے نہ جانے کب اس کی جیب سے نکال کر اس سے زمین کھودنی شروع کی اور اب جو اس میں سے سیاہی نکل رہی تھی۔ وہ مزے سے منہ بنا بنا کر پی رہا تھا۔

"اے ہے ——— جبھی میں کہوں کیسا چپکا بیٹھا کٹے بیٹھا ہے۔"

"پاجی کہیں، کے!" پورن نے اس کے گال نوچے اور اس کی موٹی موٹی ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹ لیا۔

"اے واہ چل میرے بچے کو چھوڑ۔"

"آج بھابی اسے مار ڈالوں گا.... اکیس روپے کا قلم تھا میرا۔"

"چلو تم اس کے ابا کا قلم لے لینا۔ ان کے پاس دو ہیں۔"

"ہم کسی کے ابا دبا کا قلم نہیں لیں گے۔ آج اس کی بوٹیاں کروں گا۔" پورن نے اُسے گھٹنوں پر بٹھا لیا ——— کیوں اوے شیطان، اس شیطان نے ایک طمانچہ دیا۔ میا بھی بھرے ہاتھ کا۔

اور بھابی ہنسی کے مارے گھاس پر اوندھی ہو گئی۔

"ہنستی کیا ہو ——— اب تم دیکھتی جاؤ میں کیا کرتا ہوں اس کے ساتھ۔" اُس نے بچے کو اٹھا کر ہوا میں اچھالا

شروع کیا۔ اور پھیرا گتا لشا کر ٹانگیں پکڑ جھلاتے لگا۔

"ہائے پورن ـــــ میرا بچیا ـــــ اوئی ـــــ اس کی آنتیں ٹوٹ جائیں گی ـــــ ہائے میرا بچہ ـــــ"

بھابی رونے پر تیار تھی۔ مگر منا نیلی سیاسی لتھڑے ہوئے منہ سے ہنسے جارہا تھا۔ اور جب بھابی اسے لینے لگی تو پورن کے کندھے سے لپٹ گیا۔

"بھئی بڑا اپنا ہے تیرا" اس کے باپ بولے۔

"یوں نہ ملنے گا ـــــ" پورن نے اُس کا گلا پکڑ کر کھینچا۔ تب ذرا وہ بسورا۔ بھابی بھنی اور آشا منے کو چھین لے گئی۔

"ٹھہر جا۔ پورن یاد رکھیو تیرے بچوں کی بھی یہی گت نہ بنائی ہو تو نام نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔"

"اجی ہوش ہیں۔ میرے بچے مفت کے تھوڑی ہوں گے۔"

"اور کیا میرے مفت کے ہیں۔"

"نہ ہوں گے۔ مول لائی ہو گی۔ مگر میرے بچوں کو تم نہیں مار سکتیں۔"

نہیں مار سکتیں بچالیں گے ـــــ کوئی بچا ہی لے گا۔ جب تمہارے بچے بچائے جا سکتے ہیں۔ تو ہمارے کیوں نہ کوئی بچائے گا۔"

"ارے تیرے بچوں کو مجھ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ تو نے میرے بچوں کو ایسا ایسا مارا ہے کہ بس۔"

"واہ بھئی یہ خوب! ہمارے بچیا بچالیں گے۔ اور کوئی بچالے گا۔ ہم آشا بچالیں گی ـــــ کیوں آشا؟"

آشا جلدی سے منے کے جوتے کی گھنڈی ٹٹولنے لگی۔

ہاٹ

آشا کو راجہ صاحب کے یہاں آئے سال ہونے کو آیا۔ گاؤں کیوں جاتی اور کون بلاتا۔ مگر گاؤں میں ہاٹ لگ رہی تھی۔ اور ایسے وقت میں رنجی کی ماں کو آشا بھی یاد آگئی۔ قرض اُدھار کر کے رنجی نے نیا جوڑا بنایا۔ ماں بیٹے۔ راجہ صاحب کے یہاں پہنچے۔ آشا اکیلی جانے میں ذرا ڈگمگا رہی تھی، کہ رنجی کی ماں نے چمکی کو بھی ساتھ لے لیا۔ اور چھوٹا سا قافلہ چلا۔ رنجی کی ماں خاصا چل سکتی تھی۔ مگر وہ راستہ ہی میں کسی سے گپیں مارتے رہ گئی۔ اور رنجی۔ آشا اور چمکی کو لے کر چلے۔ ہاٹ کی شان، راستہ کی دھکا پیل اور بھیڑ بھاڑ ہی سے معلوم ہو رہی تھی۔ علاوہ رنگ برنگی چندریوں، پگڑیوں اور ٹوپیوں کے سینکڑوں کھونے والے کاغذ کے پنکھے اور چڑیاں لیسے سے بانس میں لٹکائے لیکے جا رہے تھے۔ گزک اور چاٹ کے خوانچے اور تیل کی مٹھائیاں مع مکھیوں کی بھنکار کے رنگین چٹلوں والے اور موتیوں کی کنٹھیوں والے سوداگر بھی ہاٹ کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔ اور ساتھ ساتھ سینکڑوں لاوارث گدھے، دکھنی گائیں۔ کنکھنے کتے بھی تندہی سے ہاٹ کی رونق افزائی کو بھیڑ میں ملے ہوئے تھے اور ہاٹ میں تو معلوم ہوتا تھا۔ دو روز کے لئے جنت کھنچا تھا آئی ہے۔ علاوہ بانس اور کاغذ سے بنی ہوئی تعزیہ نما دکانوں کے زمین ہی پر ہزاروں بیش قیمت اشیاء رل رہی تھیں۔ جاپانی کھلونے، مٹی کی مورتیاں، ربڑ کے غبارے اور سیٹیوں کے پھیپھے جنہیں بجا بجا کر فروخت کرنے والے آئے۔ حواس گم کئے دے رہے تھے۔ ان کے علاوہ بھالو اور بندر پانچ پیر کی گائے۔ دوسرے کے بچھڑے کا

لاشہ آدمی کے منہ جیسی لومڑی عجیب وغریب کرتب دکھانے والا مداری اور بندروں سے بھی زیادہ پھرتی سے بانسوں پر اُچکنے والے۔

اور رنجی بالکل انگریزی چال دونوں لڑکیوں کو سیر کرا رہے تھے۔ آلوؤں کی چاٹ دہی بڑے اور تل پاپڑہ والا دلا پکے تھے۔ کاکریزی کنارے کا صافہ اس کے سیاہ رنگ پر پھوٹا نکل رہا تھا۔ اور دھاریدار پیلی قمیض کا دامن ہوا کی شرارتوں سے تڑپ کر ان کی باریک دھوتی میں جھلکتے ہوئے گلابی جانگیے کا حسن بھڑکا رہی تھی۔ نئے چارخانہ کے موزے سرخ ربڑ کی مدد سے بالوں دار ٹھنگنی پنڈلیوں پر بھب رہے تھے اور پھر گٹ کی بڑی بڑی انگوٹھیاں اور سرخ جاپانی ریشم کے رومال تو دل کھینچے لیتا تھا۔ کئی بار مہترانی نے آنکھیں بھی مٹکائیں۔ دریا کی بیوہ بہو شرمائی اور دو چار یار دوستوں نے گالیاں بھی گنگنائیں۔ مگر رنجی اس وقت بہت اونچی سوسائٹی میں تھے۔ وہ آنکھیں گھماتے نیچے کا آنا گے کو نکلا ہوا پچو کھٹا سمیٹے آگے بڑھ گئے۔

آشا نانی کی زندگی میں ہاٹ تو ہاٹ کبھی نکڑ کی دکان سے پیسے کا تیل لینے بھی نہ گئی۔ طرح طرح کی چیزیں عجیب عجیب انسان نئے نئے کھیل تماشے دیکھ کر اسے چلنا بھی یاد نہ رہا۔ وہ ہر سامنے والے سے ٹکرا کر جاتی اور ہر پیچھے آنے والا اس کو منہ کے بل دھکیل دیتا۔ اور اس دھکا پیل میں وہ لال گھوڑی پر ہیٹ لگائے پورن کو دیکھ کر تو سچ مچ ادھ مری ہو گئی نہ جانے کیوں اس کا دل چاہا کہ کہیں چھپ جائے مگر پورن زمینداری کی شان میں اکڑتے آگے نکل گئے اور اس کی جان میں جان آئی۔

لیکن ذرا سی ہی دیر کے بعد جب وہ خربوزے کے بیجوں کی پھونچیوں کا مول کر رہی تھی۔ تو پورن بالکل ہی قریب آن جمے۔ انہوں نے شاید اسے دیکھ لیا مگر دیکھ لیتے تو ان کے دانت کیوں چھپے رہتے۔ اور یہ دونوں بھوؤں کے بیچ میں بیٹھی کیسی۔ پھونچیاں چھوڑ چھاڑ وہ جلدی سے آگے بڑھ گئی مگر لال گھوڑی کہیں بھیڑ سے رکتی تھی۔ وہ جیب کٹھ پتلی کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ جیب رنگ برنگے چٹلے چن رہی تھی جیب۔ اور پھر جیب کر وہ سوڈا پی رہی تھی ــــ اور غضب تو جب وہ رنجی کے ہاتھ سے چاندی کے ورق کا بیڑا لینے میں چیل وحجت کر رہی تھی۔ گھوڑی سر پر سوار ہو گئی۔ اور سوار؟ سوار تو گھوڑی پر سوار ہی تھا۔ ہاں اس کی بھنویں اور ٹیڑھی ہو گئیں اور چہرہ بھبک اٹھا۔ آشا کی انگلیوں سے بیڑا چھوٹ پڑا اور زمین پر منہ کھول کر پھیل گیا۔ خیر دوسرا سہی۔ کوئی واقعی میں چاندی کا ورق تھوڑی تھا۔ گلٹ وغیرہ کا ہوگا۔ اور سونے پر سہاگہ یہ کہ چھکی نہ جانے کدھر چھمک گئی! ابھی تو کھڑی پچھمی کو چوڑیاں گنا رہی تھی اور ایک دم بھیڑ سے اڑ گئی۔

"اب گھر چلو۔ چھکی کہاں ہے؟" آشا نے ایک نامعلوم خوف کو چھپا کر کہا۔

"ابھی سے ــــ ابھی تو دن پڑا ہے" حالانکہ مشرق سانولی ہو چلی تھی۔ مگر رنجی سورما کی طرح سینہ تانے چل رہے تھے۔ آج بے طرح اُن پر رنگ چڑھا ہوا تھا۔ پان پر پان پیسے جا رہے تھے اور بنڈلوں بیڑیاں جسم کر ڈالی تھیں۔ پر اُن کی چال مستانہ اور بیڑیوں کا دھواں گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

"چھکی کہاں چلی گئی۔ مجھ سے کہا تک نہیں"

"پچھمی وغیرہ کے سنگ ہوگی۔ چلو کشتی دیکھو گی۔"

"نہیں!" آشا جلدی سے سر ہلا کر بولی۔ بھلا کوئی کشتی بھی دیکھنے کی چیز ہے ننگے گوشت کے ڈھیر دھول میں لوٹ رہے ہیں۔ آس پاس کھڑے ہوئے غنڈے گالیوں کے ساتھ نئی نئی بھیانک ترکیبیں بتا رہے ہیں۔ آشا

کو خیال سے ہی پھریری آ گئی۔ وہ دور سے ہی سیاہ جٹ پہلوانوں کی ننگی رانیں دیکھ کر لرز گئی۔

"تو چلو شربت پئیں۔ جیکی مل جائے گی۔ تم ڈرتی کیوں ہو؟" رنجی ذرا اور پاس چلنے لگے۔

شربت کی دکان پر آشا کے اور بھی آئے حواس جلتے رہے۔ شربت پینے والے ڈراونے انداز میں کچھ کھڑے اور کچھ زمین پر لوٹ رہے تھے۔ ایک گراموفون اپنی پوری رفتار سے کائیں کائیں کوئی ریکارڈ بجا رہا تھا جیسے ہی یہ دونوں پاس پہنچے انہوں نے بے تکی باتیں بکنی شروع کیں۔ گدلی اور بلغم کے رنگ کی پیلی پیلی آنکھیں عجیب عجیب اشارے کرنے لگیں اور پھر شرارت کی میٹھی میٹھی سڑاند بیڑیوں کا دھواں اور غلیظ فقرے آشا کا جی متلانے لگا۔

"یہاں سے چلو" وہ روتی آواز میں بولی۔ اس نے لال گھوڑی اور اس کے لال آنکھوں والے سوار کو بھی تو دیکھ لیا تھا۔

"بس ابھی چلو — چلو —" وہ ایک طرف چلنے لگی۔

"ادھر کہاں — آؤ میں چلتا تو ہوں" رنجی آشا سے ڈر تا بھی تھا دوسرے لوگوں کے فقرے اسے اور بوکھلائے دے رہے تھے۔ تیسرے لال پگڑی والے سپاہی کی آنکھیں بڑی دیر سے اُسے پُرمعنی انداز سے گھور رہی تھیں۔

"تم ذرا یہاں ٹھہرو۔ میں ابھی جیکی کو لاتا ہوں" رنجی تھوڑی دیر ذرا حواس درست کرنے کے لئے الگ چل دیا ورنہ وہ خوب جانتا تھا کہ جیکی خود ہی ملنا چاہے گی تو ملے گی۔ آشا ٹٹی کا سہارا لے کر دل کو سنبھالنے لگی۔

"ہوں — تو یہ مزے ہیں" آشا نے چونک کر اُدھر دیکھا اور اگر وہ جلدی سے نہ ہٹ جاتی لال گھوڑی ضرور اُسے دل کے رکھ دیتی۔

"یہ تمہارے ساتھ بدمعاش کون ہے" شرافت اور نقابت کا جوڑ تو نہیں پھر بھی پورن کبھی دو دفعہ ایک بات پر غور کب کرتا تھا۔

"رنجی" آشا نے ٹٹی کے تنکے کریدتے ہوئے کہا۔

منٹو کی ایک فلمی کہانی زیرِ غور تھی۔ اشوک کمار کو وہ پسند تھی۔ اس سے پہلے اُسے "مجبور" کی کہانی پسند تھی۔ پھر دل سے اتر گئی اور منٹو کی کہانی پسند آئی۔ میرے آنے کے بعد اُسے میری کہانی "ضدی"، پسند آ گئی۔ خیر منٹو کو ناگوار نہ گورا۔ اب اشوک کمار نے مجھ سے منٹو کی کہانی پر کام کرنے کو کہا اور منٹو کو میری کہانی پر۔ نتیجہ یہ کہ منٹو مجھ سے اور میں منٹو سے شاکی رہنے لگی۔ کمال امروہوی "محل" کی کہانی لے کر آ گئے۔ وہ اشوک کمار کو پسند آ گئی اور ہم دونوں کی کہانی کھٹائی میں پڑ گئی۔ اب صرف عزت کا سوال ہوتا تو اور بات تھی۔ وہاں تو یہ حال ہو گیا کہ ہماری کہانی نہیں بن رہی ہے تو ہم کسی شمار و قطار ہی میں نہیں۔ گو ہم سے کہہ دیا گیا تھا کہ چین سے بیٹھو، تنخواہ ملتی رہے گی، کیونکہ کنٹریکٹ ہو چکا ہے، لیکن کہانی ہماری نہیں بنے گی۔ لہٰذا میری اور شاہد لطیف کی پوری کوششیں اپنی کہانی "ضدی" کو بنوانے کی طرف لگ گئیں اور اور بغیر اشوک کمار کے دوسرے درجے کی تصویروں کی قطار میں "ضدی"، بنائی جانے لگی۔ اور پلی "مجبور" اور "محل"، ایک ساتھ مکمل ہو کے بے حد مقبول ہو گئی۔

عصمت چغتائی — "میرا دوست میرا دشمن"

"رنجی ـــــ نام تو بہت پیارا ہے ـــــ مجھے نہیں معلوم تھا شربت سے بھی دلچسپی ہے" آشا نے شربت کی طرف آنکھ کب اٹھائی تھی کم بخت کتنے کی تے جیسی کو بُو تھی۔

"تمہیں اکیلے آنے کی کس نے اجازت دی؟"

"چکی ـــــ آئی ہے"

"مگر تم آئیں ہی کیوں ـــــ اور پھر اس طرح پیڑے چباتے اور تاڑی پیتے تمہیں شرم نہیں آتی؟" پورن نے جی سنبھال کر کہا ورنہ معلوم تو یہ ہوتا تھا جیسے بس چلے تو اس ہنٹر سے اس کی کھال ادھیڑ ڈالے۔ جو وہ ٹٹی کے بانسوں پر تاؤ کھا کھا کر مار رہا تھا۔ کاش وہ آشا کی کھال ہنٹر سے نوچ ڈالتا مگر ایسے تو نہ بولتا۔ اسے جواب بھی دینا مشکل تھا۔

"تمہارا جی چاہے جو کرو مگر یاد رکھو سب جلتے ہیں کہ تم ہمارے گھر کی ڈگر ہو۔ بدنامی تو پتا جی کی ہوگی" آشا کو حیرت ہو رہی تھی کہ پورن اتنے گندے الفاظ بھی جانتا ہے۔ ہاں وہ اس کی ڈگر تھی۔ ڈگر ہی تو تھی، اس کا جی چاہا ٹٹی کے کھردرے تنکوں سے اپنے ہاتھ چھیل کر خون بہائے اور کلیجہ پھاڑ کر رو دے ویسے ہی کلیجہ پر اتنی دیر سے پتھر رکھا ہوا تھا۔

"اور بنتی کتنی بھولی تھیں۔ اگر کوئی ذرا سی بات پوچھے تو ایسے لرز جائیں گویا میں بڑی بھولی بھی ـــــ مجھے نہیں معلوم تھا" پورن چبا چبا کر اس کے منہ پر سخت سخت کنکر جیسے مار رہا تھا۔ اور وہ اور بھی ڈر رہی تھی، گھوڑی بے چینی سے پھیر مار رہی تھی اور ہنٹر بانس پر سڑاک سڑاک تیج رہا تھا۔

گھوڑی ایک دم سے تڑپی۔ پورن نے اپنا سارا زور لگا کر اس کی پسلیوں میں اپنی ایڑیاں گھسا دیں۔ وہ زور سے جھینکی اور آشا کو بس جلنے سے بال بال بچتا چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ گھوڑی بھی اس کے جسم میں تھوک رہی تھی۔

مگر اس کے لئے زیادہ دیر کھڑے رہنا دوبھر ہو گیا۔ پھر بھر کر چند غنڈے اس کے پاس سے کھانستے گزر گئے اور پھر رسیلے گیت جھاڑنے شروع کئے۔ آشا ڈر کے بھاگی۔ وہ ایک ذرا اُدھر کھڑے آہستہ آہستہ رانیں کھجا کر میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور قریب قریب سب اس پر عاشق ہو چکے تھے وہ سخت متحیر تھی کہ اتنی جلدی سے وہ کس طرح اس قدر شدید سے عاشق ہو گئے ہوں گے۔ وہ ڈال سے ہٹ کر بیچوں بیچ میں کھمبے کے پاس کھڑی ہو کر چاروں طرف پریشان آنکھوں سے گھورنے لگی۔

فوراً ہی دور پر اس نے دیکھا چکی سہیلیوں کے ہجوم میں شرما شرما کر گھوڑی کے بانکے سوار سے بول رہی تھی۔ جس کی آنکھیں تو ہیٹ کے نیچے تھیں مگر ہونٹ شرارت سے پھڑک رہے تھے۔

"آتش بازی نہیں دیکھو گی؟" چکی نے آشا کی چلو چلو پر حیرت سے کہا۔ "واہ آتش بازی کا سارا مزہ ہے آج چھوٹے بھیا بھی ہیں، دیکھا تو نے؟ ایسے بُرے ہیں؟" چکی نے ہنسی روک کر منہ سکیڑا۔ "لیکے سب لوگ کے سامنے کہنے لگے چکی گھوڑے پر بیٹھے گی۔ تھک گئی ہو گی۔ ہونہہ!"

چکی کو آتش بازی اچھی طرح سمجھائی بھی نہ دی۔ اس کے سینے میں خود آتش بازی سی چھوٹ رہی تھی۔ ہماری زندگی کے واقعات بھی کس قدر آتش بازی سے ملتے جلتے ہوتے ہیں!

وہ انار سا چھوٹا، جگمگ کرتا ہوا بگولا سا اٹھا اور رُواں رُواں چمک اٹھا اور پھر وہ تاریکی۔ وہ پھلجھڑی چھوٹی۔ روح کی گہرائیاں تک کوند اٹھیں اور پھر اندھیرا گھپ! اور پھر زندگی کیسی پھیکی پھیکی لگتی ہے۔ جیسے بارود جل جانے کے بعد انار کا خالی مٹی کا خول یا پھلجھڑی کا تار!!

نفرت

جب ہاٹ سے تھکی ہاری آشا اپنی کوٹھڑی میں پہنچی تو اس کا بدن پکّے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ جب اس نے پیروں کے چھالوں پر سے مٹی ہٹانے کے لئے پانی ڈالا تو دکھ کے مارے نسیں اکڑ گئیں اور پسینہ آگیا۔ مگر ان سے زیادہ بڑے بڑے آبلے اس کے دل اور دماغ میں پڑ گئے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سب سو جائیں تو وہ خوب تکیہ میں منہ گھونٹ کر روئے۔ ضبط کی وجہ سے کنپٹیاں پھٹی جا رہی تھیں اور بھنوؤں میں دکھن تھی۔ بدن تو تھا ہی تھا۔ آخر اس کا دل کیوں اس قدر کمزور تھا۔ نانی اُسے ستوانسی کہا کرتی تھی۔ مگر اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ اُسے تو کچھ دنیا میں آنے کی ایسی جلدی بھی نہ تھی، یہ تو اس کی کمسن ماں تھی۔ جو کہیں پھسل پھسلا گئی ہو گی اور وہ قبل از وقت دنیا میں آ گئی۔

کھانے پر اس نے دیکھا کہ پورن نے تو بھابی کو چھیڑا نہ بچوں کے چٹکیاں لیں اور نہ ہی بات بے بات قہقہے لگائے۔

"ارے بے آج تو بڑے چُپکے بیٹھے ہیں" بھابی نے کہا مگر پورن نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ بھابی نے شرارت سے چمچہ بھر نمک اس کے شوربے کی رکابی میں ڈال دیا اور اس کا کاندھا ہلایا۔

"ارے کیا سو رہے ہو۔ کیا ساری لات تمہارے لئے کھانا لگا رہے گا" پورن جلدی جلدی شوربہ پینے لگا۔

"اچھا بھابی میری بھی کبھی باری آئے گی" پورن سب کے ہنسنے سے آج کھسیانہ ہو گیا۔ جمکی نے دوسری رکابی رکھ دی اور وہ جلدی سے شوربہ پینے کا بہانہ کرنے لگا۔ مگر آج معاملہ بے ڈھب تھا۔ پورن نے نہ تو کھایا ہی اور نہ ہی بولا۔ آشا جب اس کی دل پسند بھنی ہوئی دال لائی تو بولا۔ "مجھے نہیں چاہیئے" اس نے پہلے لینا چاہا پھر آشا کا منہ دیکھ کر جیسے چڑ گیا اور جمکی کی تھالی میں سے پاپڑ چبانے لگا۔ آشا سہم کر جلدی سے دور ہٹ گئی۔

"کیوں جی تم نے میری آشا کو کیسے ڈانٹا! ایسے بولتے ہیں؟ کسی انسان سے" بھابی بولی۔

"میں بھلا کون ہوتا ہوں آپ کی آشا کو ڈانٹنے والا بھوک نہ ہو تو کیا کروں"

"معاف کیجیے گا" اور وہ تھوڑی دیر بعد چلا۔

"تم نے کچھ بھی تو نہ کھایا پورن" بھابی فکرمند ہو گئی۔

"کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے" وہ سیدھا کمرے میں گیا۔ دوسرے روز اتفاق کیسے یا کچھ لو، وغیرہ لگ گئی۔ پورن کو وہ زور کا بخار چڑھا کہ کئی دن بے ہوش سا رہا۔ بخار اترتا بھی نہ تھا ذرا کم ہوتا تو بدمزاجی سوا ہو جاتی۔ آشا کو کمرے میں جاتے ڈر لگتا تھا۔ لیکن نہ جانے کون سی طاقت اسے پکڑ پکڑ کر کھینچتی تھی۔ اور وہ بار بار کام کے بہانے سے دروازے تک ہی ہو آتی، رات اچھی نہ کٹی اور بھابی تو تھک کر چور ہو گئی —— آشا جو دروازے کے پاس سے گزری تو اس نے اُسے بلایا۔

"آشا میری گُڑیا —— ذرا یہاں بیٹھ جا۔ میں ابھی آئی بیٹھے بیٹھے جی الٹ گیا۔ اور وہ بے پیر چلی گئی آشا

خاموش اسٹول پر بیٹھ گئی۔ آج کئی دن بعد اس نے پورن کو غور سے دیکھا، وہ کتنا بڑا لگ رہا تھا۔ بالکل راجیہ صاحب کی شکل۔ دو دن کے بعد بخار نے زرد کر دیا تھا اور ہونٹوں پر کتنی تلخی تھی۔ بال بھی اُلجھے پڑے تھے۔ آشا کا جی چاہا کوئی ان کا چپتا چپتا سنجھا دے اور اُن کی تھکی ہوئی کنپٹیوں پر پیار سے انگلیاں پھیرے۔ شاید سوتے میں بھی انسان کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ آشا کی آنکھوں نے پورن کو جگا دیا۔ اس نے دو ایک بار آنکھیں جھپکائیں اور پھر آشا کو دیکھنے لگا۔ ایسے کہ آشا گھبرا سی ہو گئی۔ بخار نے اس کا دماغ ذرا پریشان کر دیا تھا۔ اور ذرا بہک گیا تھا ایک دم سے ان آنکھوں میں کئی دن کا غائب روشنی ابھر آئی۔ اور ہونٹ شوق سے کھل گئے۔

"آشا۔۔۔" وہ کہنی کے سہارے اٹھا۔ آشا جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ پورن تھوڑی دیر تک اُسے دیکھتا رہا کہ ایک دم اس کی نظر اس کی چوڑیوں پر گئی جو اس نے رنجی کو آشا کو دیتے دیکھی تھیں اور وہ کنٹھی سفید موتیوں کی اور چپلا ایک دم سے جیسے کسی نے کہنی کا سہارا کھینچ لیا اور وہ تکیہ پر گر پڑا۔ آشا نے جلدی سے اس کا سر ٹھیک کرنا چاہا مگر جیسے اس پر بھوت سوار تھا۔

"او خدا رہنے دو۔۔۔ یہ سب کہاں چلے گئے"
وہ پریشانی سے چاروں طرف سر گھمانے لگا۔

"کیا بلا لاؤں بھابی جی کو۔۔۔" آشا دروازے کی طرف مڑنے لگی۔

"بھگوان آخر یہ سب کہاں چلے گئے۔ کیا سب مر گئے۔ چکی کہاں گئی؟"

"بھابی جی تھک گئی تھیں اور چکی۔۔۔ کو بلا لاؤں!"
"بھابی تھک گئی۔۔۔ مگر تمہیں کیوں تکلیف دی گئی کیا کوئی اور گھر میں نہیں؟" پورن طعن سے بولا۔

"اوہ۔۔۔ کتنی پیاس ہے۔۔۔ اوہ اندھیرا"
پورن گھبرا گھبرا کر سر پٹخنے لگا اور آشا کبھی پانی پر لپکی اور کبھی سوچا بھابی کو بلا لائے۔ اس لئے کچھ نہ کر سکی۔ کس قدر بے وقوف ہو گئی تھی۔ بوکھلا گئی تھی وہ تھی ہی پاگل۔

"اوہ۔۔۔ میرا دم گھٹتا۔۔۔ اندھیرا یہ پردے ہٹا دو"

آشا پردہ سرکانے لگی۔ شام ہونے میں ابھی دیر تھی مگر کمرے میں ذرا اندھیرا ہو چلا تھا۔ ایسا کہ دکھائی نہ دے مگر پردے ہٹانے لگی۔ اس کے ہاتھ اور بھی کانپنے لگے۔ جب اُس نے دیکھا کہ پورن اسے برابر گھور رہا تھا۔

جب وہ اس کے پاس کا پردہ ہٹانے لگی۔ تو اُسے بالکل اس کے سر پاتے جھکنا پڑا اور پورن کی آنکھوں سے بچنے کے لئے وہ جھک گئی پردہ ہٹا کر وہ بھابی کو بلانے چلی لیکن اس نے دیکھا کہ پورن آنکھیں بند کئے تھا۔ اس لئے وہ بیٹھ گئی۔ پورن نے تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھولیں تو وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

"بھابی جی کو بلا لاؤں؟" وہ خود ہی بولی۔

"ہوں۔۔۔ آپ کا دل گھبرا رہا ہے تو جائیے رہنے دو مجھے۔ مگر یہ چکی کہاں گئی جو بھابی نے تمہیں یہاں پھنسا دیا۔ مگر تم چلی جاؤ"

"چکی تھک گئی تھی۔ وہ بھی سو گئی ہے ذرا سی"
آشا پورن کے سخت الفاظ سن کر نہ جانے کیسے آنسو پیئے بیٹھی تھی۔

"چکی سو گئی۔ بھابی تھک گئیں۔۔۔ تم تھک گئیں ہو۔ یہاں سے مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔۔۔ جاؤ۔۔۔ اب آنسو بہنے لگے"

"ہوں یہ اب رویا جا رہا ہے۔ میں نے آخر تمہیں کہا ہی۔

کیا۔ تمہیں کوئی کچھ کہہ سکتا ہے۔ جاؤ جہاں جی چاہے جا سکتی ہو۔"
"آپ ـــــ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔ میں نے۔"
"میں ـــــ میں بھلا کیا کر رہا ہوں۔"
اب پھر جا کر بھیا سے شکایت کر دینا کہ میں نے تمہیں رنجی کے ساتھ گھومنے پر ڈانٹا۔ ہنہ! جیسے مجھے کچھ ـــــ مجھے کیا؟"
"میں نے کب شکایت کی چھوٹے بھیا؟"
"اب جھوٹ بھی بولنے لگیں! تم نے بھیا سے نہیں کہا کہ میں تم سے خفا ہوں۔ جی میں کیوں ہوتا خفا مجھے کیا غرض۔ جی ہاں۔ جیسے۔"
"میں نے شکایت نہیں کی۔ بڑے بھیا پوچھنے لگے کیا پورن تجھ سے خفا ہے ـــــ تو ـــــ میں نے کہا نہیں، تو اس پر وہ بولے کہ پھر وہ کیوں ـــــ کیوں ـــــ ایسا ـــــ" آشا کی سمجھ میں نہ آیا کیا کہے۔
خیر وہ تم نے شکایت نہ کی ـــــ پھر بھی تمہیں برا تو لگا کہ میں نے کہ میں نے تو پھر سے ذرا سختی سے کہا۔ مجھے نہیں کہنا چاہئیے تھا۔ امید ہے کہ ـــــ کو معاف فرمائیں گی وہ بڑے ہی طعن سے بولا۔ مگر اب اسے زیادہ غصہ نہ تھا۔
"مجھے تو نہیں لگا۔" اس نے ہمت کی۔
"بے شک نہ لگا ہو گا۔ کیوں میرا بیچ میں بکواس کرنا اچھا لگتا ـــــ میں کون ـــــ تم رنجی سے ملو ـــــ میں آخر دخل دوں تو یہ بیوقوفی ہے تمہیں حق ہے تم چاہے جیسے چاہو۔" پورن مسکرایا۔
"آپ ـــــ آپ بہت بُرے ہیں۔" آشا پھوٹ کر رو پڑی۔
"مطلب ہے تمہاری شادی رنجی سے طے ہو گئی تھی۔ میری غلطی تھی آشا۔ میں بہت بیوقوف ہوں۔ دیکھو نا تمہیں بے بات ڈانٹ دیا۔ تمہیں رنجی پسند ہے۔"
آشا نے پورن کو ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ ہنس پڑا۔
"اور آپ کی چنگی؟" وہ دبی زبان سے سسکیوں کو دبا کر بولی۔

اردو کے افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی ہی ایسی افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں کے ذکر اور تصور سے کچھ لوگوں کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور کچھ لوگوں کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں۔ کچھ کو ان افسانوں کے ذکر سے حد درجہ کی مسرت ہوتی ہے اور کچھ ایسے نام کے سنتے ہی لاحول پڑھنے لگتے ہیں۔ (سید وقار عظیم)

"چنگی ـــــ ارے ـــــ میری چنگی ـــــ کون کہتا ہے؟ بشنت۔" وہ اٹھنے لگا۔ "کس نے تم سے کہا۔ بیوقوف ہو تم۔"
"جی ہاں ـــــ میں کیا جانتی نہیں ہوں۔" وہ بچوں کی طرح بولی۔
"مگر ـــــ یہ کہا کس نے کر چکی۔"
"اور آپ سے کس نے کہا۔ رنجی۔"
"آشا!" پورن غور سے دیکھنے لگا۔ جس کا منہ رنجش سے پھولا ہوا تھا۔ "آشا ـــــ میں بہت ہی برا ہوں میری آشا۔" وہ کھڑا ہو گیا۔
"لیٹ جائیے۔" وہ اُسے دھکیلنے لگی۔
"آشا میں کتنا جلد باز ہوں۔ کتنا برا ـــــ" سوکھے دونوں ہاتھوں سے پکڑے تھا۔ کچھ کمزوری اور کچھ جذبات کا غلبہ پورن لڑکھڑانے لگا۔
"ارے!" بڑے بھیا نے اسے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ "یہ کیا واہیات ہے آشا؟" آشا کیا کرتی؟
"بھیا میں ـــــ آپ لوگ بھی کس قدر عقلمند ہیں بھلا مجھ جیسا شریر بیمار اور آشا بے چاری کے سپرد کر دیا۔ بھلا وہ مجھے روک سکتی ہے ـــــ ہیں؟"
"اور تم نے روکا نہیں۔ مجھی کو بلا لیا ہوتا۔" بھابی بولی۔
"ارے بھابی ـــــ میں اتنا کب ہوں وہ تو بیچاری

لاکھ روکتی رہی مگر ــــــ ہاں بھابی پانی ــــــ" وہ نڈھال ہوگیا۔ سارے گھر میں ایک غل پڑ گیا۔ لیکن آشا الزام سے بری ہوگئی جب ڈاکٹر نے کہا: "کچھ نہیں۔ بخار اُتر رہا تھا اس لئے گھبراہٹ شروع ہوگئی اور اگر آرام و سکون ملا تو چند روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔

اس کے بعد سے پورن وہ مستقل مریض بن گیا کہ اسے دو روز پلنگ پر لیٹنا دشوار ہو گیا سب اس کے کمرے میں ہوں یہاں تک کہ بھولا کی تائی بھی اور ان سب میں آشا بھی آ جاتی جس سے آنکھوں ہی آنکھوں میں پورن ہزار معافیاں مانگ چکا تھا۔

"بھولا کی تائی۔ تم اگر مجھ سے ایک دفعہ غصہ ہو جاؤ تو کیا کبھی منوگی بھی نہیں؟"

"چل اُدھر دیوانے"

"نہیں سچ کہتا ہوں ــــــ کبھی تمہیں کچھ ڈانٹتا ہوں تو کیا گانٹھ باندھ لیتی ہو؟"

"کیا؟" بھولا کی تائی کچھ نہ سمجھی۔

"بھولا کی تائی۔ دیکھو انسان غلطی کرتا ہی ہے کیوں؟"

"کون گلتی کرے؟"

"تم تو بڑی کوڑھ دماغ ہو جی ــــــ بھلا کیسے گذرے گی۔"

"گجر کرا یتی اماں بہنا کے سنگ۔"

"تم بھولا کی تائی ہو مگر تو میں کون لگا تمہارا؟"

بھولا کی تائی اس قدر بھیانک رشتہ بتاتی کہ پورن چادر میں منہ چھپا لیتا۔ بھلا ایسا مریض کتنے دن لیٹ سکتا تھا؟

یہ تھی وہ نفرت جو پورن کے سیدھے سادے دل میں طوفان کی طرح اٹھی اور وہ جھکولے دے کر اس کی ہڈی ہڈی ہلا گئی۔ مگر پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی سخت نفرت ہو کیسے جاتی ہے۔ اور پھر بھاپ کی طرح غائب! دل میں غبار لیا کر بس ختم قصہ۔ بس ہو چکا کھیل ــــــ اور وہ لمبے چکنے گھڑے کی طرح دو منٹ میں صاف! تو یہ نفرت ہے۔ محبت کی ہی ایک شریر انگڑائی کہو۔

پھر وہی شرارتیں، وہی بھابی کا طنطنہ۔ بھولا کی تائی کی گالیاں اور آشا کی آنکھ مچولیاں اور بچوں کو چھیڑ۔ انسان محبت میں ہر وقت چلبلا پن کیوں کرتا ہے۔ من کے ساتھ ساتھ ہاتھ پیر اور آنکھیں کیوں مست ہو کر ناچنے لگتی ہیں؟ اور ہر چیز ہنسنے ہنسانے کے لئے ہی نظر آتی ہے اور سنجیدگی کہاں ڈوب مرتی ہے کہ ذرا بھی کل کا دھیان نہیں آتا۔ مگر عورت؟ وہ کتنی مختلف ہوتی ہے۔ اس کا دل ہر وقت سہما ہوا رہتا ہے ہنستی ہے تو ڈر کے مسکراتی ہے تو جھجک کر۔ قدم قدم پر اسے اپنے راز کے ہی کھلنے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ کیا ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ یہ ہوا تو ہم..... وہ ہوا تو اُف ــــــ اور یہ کمبخت "یا قصور انتقام" ہے۔

آشا منے کو نہلا کر اس کے بالوں میں برش کر رہی تھی مگر وہ تھا کہ بے چین پھرکی کی طرح ناچے جاتا تھا۔ یہ ڈبا الٹا۔ وہ بوتل کھول ڈالی۔ برش چھوڑ تو کنگھا کھانا شروع کر دیا۔ سرمہ دانی کھول کر الٹ دی۔ آشا عاجز آگئی۔

"او خدا شریر۔" اس نے سلائی چھین کر الگ رکھ دی۔

"کون۔ یہ میں؟" پورن دروازے سے ڈرا ہوا منہ بنا کر بولا۔

"جی نہیں یہ منا کنگھی نہیں کرنے دیتا۔"

"شاباش شریر ہے۔ تم سے کیا ڈرے گا۔ ڈرپوک کہیں کی۔ ذرا سی بیٹنگی سے ڈر جاؤ۔" صبح پورن بھابی کو بیٹنگی سے ڈرا رہا تھا۔ کوئی چنے برابر ہوگی یا ذرا بڑی، شاید سیم کے بیج جتنی۔ مگر بھابی سارے گھر میں چنگھاڑتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔

"یوں نہیں ٹھیک ہوگا۔ پورن اسے ڈورے میں باندھ کر ان کے گلے میں ڈال دو تب ٹھیک ہوگی طبیعت۔"

پتی مہاراج بجلانے استری رکشا کے اور اُسے قتل کرنے کی ترکیبیں بتلانے لگے۔

"میرا بھیا پورن۔ تجھے میری قسم" بھابی چلا رہی تھی۔ بھابی کو چھوڑ پورن نے وہ ذرا سی مینڈکی آشا پر ڈال دی جو نہایت بے فکری سے اس کی گت دیکھنے میں مشغول تھی اور آشا میز چیموں پر سے ایسی لڑھکتی بھاگی۔ کہ بس شیر سے بھی تو اتنا نہ ڈرتی۔ پھر جب پورن نے یونہی ذرا کاغذ کا ٹکڑا ڈال دیا۔ تو گھبرا گھبرا کر دھوتی کا آنچل کھسوٹنے لگی۔

"کھا جاتی۔ یہ ذرا سی مینڈکی تمہیں"

"مجھے گھن آتی ہے اس سے"

"مگر یہ تو بتاؤ تم باغ میں کیوں بھاگیں۔ تمہیں مجھ سے بھی تو گھن آتی ہے" پورن نے برش لے کر کہا۔

آشا دوسرے برش سے منے کے بالوں سے کھیلنے لگی۔

"یہ بتاؤ کہ یہ طریقہ کیا ہے۔ آشا دیوی!" پورن نے دوسرا برش بھی چھین لیا۔

"مجھے کام تھا"

"ہاں بس تمہیں کو تو کام رہ گیا ہے۔ دنیا بھر کا" وہ دونوں ہاتھوں سے برش کرنے لگا۔

"پتا جی آگئے ہوں گے۔ آپ کو بلاتے ہوں گے"

"ہوں پتا جی آگئے ہوں گے۔ بلاتے ہوں گے بس گڑھنے لگیں الٹے سیدھے بہانے تم چاہتی ہو میں چلا جاؤں یہاں سے۔ تو نہیں جلتے کو دو بچارا کچھ"

"بھابی جی کہیں گی ذرا سا کام کرنے کو کہا تو دو گھنٹے لگا دیئے"

ہوں بس سب کا خیال ہے تمہیں۔ ایک میں ہی ہوں جو کبھی بات بھی کر لوں تو تمہیں سو سو بہانے سوجھنے لگتے ہیں۔ ذرا سوچو آشا۔ آشا منے کو اٹھا کر چلنے لگی۔

"بس بھاگیں" پورن نے آ سے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔

"چھوڑ دیئے ——— بھیا بھوکا ہے"

"تمہیں کون پکڑتا ہے۔ میں تو بھیا کو پیار کر رہا ہوں۔ واہ کوئی بھیا کو پیار بھی نہ کرے واہ" اور منے کو پیار کرنے لگا۔ آشا کتنا ہی منہ پھیرے پورن کے بال اس کی آنکھوں اور گالوں پر چھا گئے اور پھر دل و دماغ پر۔

"پورن ——— کاش تمہیں کبھی فرصت ہوتی"

بڑے بھیا کی آواز آئی "ذرا میرے ساتھ آؤ"

"میں آ ——— آیا" پورن ان کے ساتھ چل دیا۔ آشا نے ٹھنڈی سانس بھر کر منے کے گال پہ منہ رکھ دیا۔

"مجھے یہ بالکل پسند نہیں ——— تمہاری حرکتیں" بھیا سنجیدہ تھے۔

"کون! ——— میری ——— کیا"

"ہاں تمہاری۔ پورن سنگھ ہم اندھے نہیں ہیں۔ یہ تمہارا ہر وقت چھوکریوں سے مذاق"

"چھوکریوں سے مذاق!"

"کون مذاق کرتا ہے۔ بڑے بھیا۔ میں مذاق نہیں کرتا کسی چھوکری سے آشا۔ اس سے مجھے ہمدردی ہے وہ ہماری کھلائی کی اولاد ہے جبکہ ہمارے پتا جی کی دادا کی اولاد ہے"

"تمہیں اس طرح اس کے ساتھ بد مذاقی اچھی لگتی ہے"

"بھیا میں ——— آپ کو دھوکا ہوا ——— مجھے آشا سے آپ سے کم ہمدردی نہیں ——— وہ ——— میری ——— مجھے اس سے پریم ہے اور"

"اور ——— اور؟ ——— کیا اور کچھ بھی؟ پورن تم دیکھتے ہو میں نے کبھی کسی نوکرانی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، ہم سچ مچ کے راجہ ہیں اور نہ ہماری شرافت اس بات کو مانتی ہے"

"مگر میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں"
"تم ــــ ہاہاہا ــــ" بھیا صرف مسکرایا کرتے تھے۔

"اس میں ہنسی ٹھٹھے کی کیا بات ہے مجھے بھیا"
"یہی کہ تم اس سے شادی نہیں کرو گے۔"
"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں"

"ہم ایسے کہہ سکتے ہیں۔" پورن ہم ہنستے نہیں تمہاری طرح ہر وقت ہمیں ہنسی ٹھٹھا کرنے کی فرصت نہیں۔ اور یہ شادی کا خیال یہ بھی خوب ہے"

"مگر آخر معلوم بھی تو ہو۔" پورن گھبرا گھبرا کر اپنے دامن سے کھیل رہا تھا۔

"معلوم یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ہماری لڑکی نہیں ہے۔ پورن یہ تم فلم دیکھ دیکھ کر شاید اس واہیات غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہو مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ زندگی ایک فلم نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے بھئے اور بڑی ٹھوس حقیقت۔ تم بچے نہیں۔ ٹھہرو میری بات مت کاٹو ــــ تم بچہ نہیں"

"مجھے معلوم ہے کہ میں بچہ نہیں۔ جب ہی تو میں پوچھتا ہوں کہ آخر وجہ کیا کہ جو میں چاہوں وہ نہ کر سکوں؟"

"ٹھیک ــــ لیکن تمہیں کس نے ایسے حقوق دئیے جن کی رو سے تمہیں سماج اور بزرگوں کی دل شکنی کا ٹھیکہ مل گیا؟"

"سماج ــــ واہ واہ ــــ وہی پرانی اسٹری بحث۔ چچا جی اتنے اندھیرے خیالات کے نہیں ہیں"

"یہی تو تمہاری غلطی ہے ــــ یعنی غلط فہمی ہے چچا جی کتنے ہی روشن خیال ہوں وہ یہ بات کبھی گوارا نہ کریں گے کہ ان کے خاندان میں اس قسم کے واہیات بات ہو۔ اور پھر یہ سوچو ماتا جی۔ میں یہ بچے تمہارے معصوم بھتیجے آخر انہوں نے کیا قصور کیا ہے جو یہ تمہاری خواہشات پر قربان ہو جائیں"

"ارے! یعنی ان کے قربان ہونے کا سوال کہاں سے آن کودا۔ واہ خوب"

"کیوں نہیں ــــ ان کی سوسائٹی میں کیا حیثیت ہو جائے گی کہ بھئی چچا نے لڑکی سے بیاہ کر لیا۔ شیلا کو کون شریف خاندان بیاہے گا۔ اور نرمل کو کون بیٹی دے گا جب وہ ان کے چچا کے کارنامے سنیں گے؟"

"پھٹکار ہے ایسی سوسائٹی پر۔ لعنت ہے ایسے لوگوں پر جو شیلا میں یہ عیب نکالیں کہ ایسے لوگوں میں جلنے کے بجائے شیلا سدا کنواری رہے!"

"ہاں تمہارے لئے یہ کہہ دینا آسان ہے تم اپنی خوشی پوری کر لو خواہ سارا خاندان مٹ جائے"

"نہیں تم ــــ میرا مطلب ہے۔ ہم شیلا کی شادی ایسے واہیات لوگوں میں کیوں کریں جو اس قدر اندھیرے خیال کے ہوں"

"تو پھر تمہارا خیال ہے کہ شیلا کے لئے بھی کوئی آشنا کا بھائی بند کوئی چوکیدار یا اردلی ڈھونڈوں" وہ بپ سنگھ بستے چکے تھے اتنے بدھو نہ تھے۔ پورن ان کے طعنوں کے آگے کھسیا کر رہ گیا۔

"میں یہ کب کہتا ہوں ــــ بھیا آپ میری ہر بات الٹی کئے دیتے ہیں" وہ شکست کھا کے بولا۔

"سوچ لو۔ تم ہی ــــ تم عقلمند ہو۔ مجھ سے زیادہ ذہین اور سمجھ دار ہو۔ خیر ابھی ذکر کو چھوڑو۔ تمہاری بھابی آ رہی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس بات کو بے بات پھیلائیں ــــ" بھابی جی اپنے بچوں کی فوج کے کر آن پہنچی۔

"دیکھتا ــــ ذرا دیکھنا منا کیسے مزے سے پیار کرتا ہے۔" منے نے سنے مرتے ہاتھوں میں ماں کا چہرہ بھینچ کر اپنی چپٹی ناک گال پر رکھ دی۔

"بندر ــــ بڑی جلدی نقل کرنے لگتا ہے" انہوں نے بڑی ہوشیاری سے کہا اور پورن کھسیانہ پن چھپانے کو

جلدی سے منے کو ستانے لگا۔

"بھابی اب میں اسے چھوڑتا ہوں۔ اسے چاہیئے کر کھڑا ہونا سیکھے" اس نے منے کو پیڑ کی شاخ پر کھڑا کر کے کہا۔

"ہے رام ۔۔۔۔ ہائے پورن نہیں۔ ابھی وہ کتنا ہے جو کھڑا ابھی ہو سکے گا۔"

"کچھ بھی ہو میں نہیں جانتا۔ اتنا تو پھول رہا ہے۔ خوب کھڑا ہو سکتا ہے۔"

"تو بھلا دس مہینے کا بچہ اور بنے گا۔ اسے آتا ہی نہیں کھڑا ہونا" وہ منے کو چھیننے لگی۔

"میں نہیں جانتا ۔۔۔۔ چھوڑتا ہوں بھابی ۔۔۔۔" پورن نے ڈرایا۔

"ہائے۔ میرا بچہ ۔۔۔۔ پورن" وہ منے کو چھین لے گئی۔

"اوہو۔ جیسے میں چھوڑ ہی تو دیتا۔ اس کا دشمن ہوں نا" بھتیا کے الفاظ اسے یاد آ گئے

ٹھوکر

ٹھوکر زندگی کا تو ایک ہی انجام ہوتا ہے۔ یعنی موت یا لیکن انسان بھولتا ہے کہ ہر صبح کا انجام شام، ہر چین کی نیند کا انجام بیداری، اور ہر قہقہہ کا اختتام خاموشی ہوتا ہے طلوع آفتاب کا کیا لطف ہوتا جو غروب نہ ہوتا۔ اور ہر وقت سورج سر پر ہی ڈٹا کھڑا رہتا اور ایسی نیند اللہ نہ دے جس سے پھر جاگ ہی نہ سکیں۔ مگر محبت میں ٹھوکریں جتنی خدا نے لازمی سمجھی ہیں اتنی تو ابھی نہیں لگتیں۔ ایک ٹھوکر وہ ہوتی ہے جس میں رقیب صاحب کی ایک جھلک سے دماغ پھٹتا جاتا ہے۔ لیکن جوں ہی بادل چھٹے پھر چاند نا ہے کبھی رنجش بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ تو فل سٹوپ کی طرح جملہ کو دلچسپ بنا دیتی ہے ایک اور بڑی ٹھوکر ہے جو بڑے رگ جان بوجھ کر لگاتے ہیں اور وہ ہوتی ہے سماج کی وہ تھی۔ اس میں اگر نکلا چلا گیا تو خیر ورنہ کھائی تو سامنے ہے ہی، سب ٹھوکریں انسان سہہ جاتا ہے پر سماج کی ٹھوکر سے تلملا اٹھتا ہے۔ کیا کیا کتابوں میں قصے کہانیوں میں فلموں میں اس سماج کی ٹانگ گھسیٹی۔ مگر سماج ہے کہ شیر کی طرح ڈٹا ہوا ہے۔ بات یہ ہے یہاں سماج کا تو نام ہے اور ٹھوکر

ہوتی ہے انسان سے۔ خود اپنے پیارے دل کے ٹکڑوں سے، اور پورن جیسے منچلے سوار ہی ٹھوکر نہ کھائیں۔ تو پھر کیا مجھ سے بھتیا جیسے سارٹ لگنے والے کھائیں گے۔ پورن کی چال ڈھال بدل بات منے گھر بھر کو چوکنا کر دیا۔ سب کی نظریں نشانہ باز توپوں کی طرح حلق پھاڑ کر دونوں کی طرف مڑ گئیں۔ آشا کی خدمات میں آٹھ دن تبدیلی ہونے لگی اب وہ بجائے نوکرانیوں کے ماتاجی کی لاڈلی بن گئی۔ جو ہر وقت ناگن کی طرح اس کے گرد چکر لگائے رہتی۔ کھانے پر بھی وہ منے کی کرسی کے پاس باندھ کر بٹھا دی جاتی۔ اور پورن کی کرسی ماتاجی اور راجہ صاحب کے کلیجہ میں گھس گئی۔ وہ خوب اس معصومانہ چوکیداری کو سمجھتا تھا۔ مگر نہ ہی اتنی ہمت اور نہ ہی کوئی موقع کہ کچھ تیزی دکھائے۔ پھر تیزی دکھائے۔ پھر بھی چور چوری سے گیا ہیرا پھیری سے تو نہیں جا سکتا۔ منے پر لاڈ جتلانے کے بہانے ماتاجی کے گھٹنے پر لیٹنے کے حیلے سے وہ ایک نظر آشا سے لانے سے باز نہ آ سکا۔ اور پھر جب انسان کا مقصدِ زندگی ہی یہ ہو تو گیلری ڈرائنگ روم کے پردوں کی آڑ میں

باغ میں کہیں نہ کہیں تو شہد چھپا اور مکھیاں سنتی مل جاتی تھیں۔

منے کی سالگرہ تھی اور گھر چمکایا جا رہا تھا۔ دیوالی بھی آ رہی تھی اور پھر کہاں تک مکھیاں ڈنگ لئے جان پر سوار رہتیں۔ آشا بھابی جی کے کمرے میں پردے لگا رہی تھی کہ پورن سنگھ بھی کچھ ڈھونڈنے جا پہنچے۔

"میرا کمرہ بھی کوئی ایسا سجا دے" وہ کرسی پر پیر رکھ کر پاس کھڑا ہو گیا۔

"آپ کے کمرے میں اتنی چیزیں ہی کہاں ہیں جو کوئی سجائے" آشا اب بولا کرتی تھی۔

"ہنہ ——— میں بیچارا غریب آدمی جو ٹھہرا" اس نے بھابی کے چاندی کے سامان پر نظر ڈال کر کہا۔ "بھابی کا تو لکھ پتی ہے"

"آپ کیوں ناراض ہوتے ہیں۔ آپ کی شادی ہو جائے گی تو کیا پتہ اس سے بھی بھاری سامان آئے"

"اُہنگ ——— یہ نہیں ہونے کا ——— جو میری بیوی غریب ہوئی تو"

"رام نہ کرے جو آپ کی بیوی غریب ہو"

"کیوں غریب ہونا کوئی عیب ہے"

"اور کیا؟ عیب نہ ہوتا تو بڑے لوگ امیر کیوں بنتے"

"مگر میری بیوی تو غریب ہو گی ——— نہیں ویسے تو بیچاری کے پاس سونا روپیہ تو نہیں ——— پر روپ تو بہت ہی ہے"

"اوہو ——— چھوٹے بھیا تب تو کیا ہے ——— مگر ہم تو جب مانیں جب روپ جتنا روپیہ بھی لائے"

"مجھے روپیہ نہیں چاہیئے اور نہ روپ۔ مجھے تو ——— مجھے ....." اور وہ ہکلانے لگا۔ آشا پردے کے چھلے ڈورے میں پروتی رہی۔

"آشا۔ کیا روپیہ ہی سب کچھ ہے؟ فرض کر دیں کنگال ہو جاؤں۔ پتاجی کوڑی نہ دیں جیسا کہ وہ کریں گے ہی تو ——— تو تم ———"

آشا کے ہاتھ لرز کر چھلوں کو زمین پر گرانے لگے۔

"بتاؤ آشا ——— جو میں کنگال ہو جاؤں۔ اور رنجی ———"

"بھگوان کرے رنجی تو مر ہی جائے" آشا نے سوچا مگر وہ بات "ملتے" کو چھلنی اٹھانے لگی۔

"تو رنجی کے پاس روپیہ ہو جائے پھر تمہیں ہم یاد بھی نہ رہیں"

"آپ کا کیا ذکر ہے۔ آپ کیوں کنگال ہونے لگے"

"اوہ ——— بس فرض کر دو"

"ایسی باتیں نہ کریئے" آشا نے لجاجت سے کہا۔

"تم ایسی ہی اکھڑی باتیں کرتی ہو۔ آخر تم میری بات کا جواب کیوں گول کئے جا رہی ہو۔ بولو"

"کیا بولوں ——— آپ جائیں گے نہیں میچ دیکھنے، ریل کا وقت بھی چلا جائے گا"

"سنو آشا میں مذاق نہیں کر رہا ہوں اور نہ اس وقت تمہارے بہانے سننے کا وقت۔ میں نے تم سے کہہ دیا اور اب میں پتاجی سے بھی کہہ دوں گا"

"نہیں ——— پرماتما کے لئے ایسا نہ کیجئے"

"کیوں؟ کیوں نہ کہوں ——— آخر وجہ ——— وہ میرے بیاہ کا کئی دفعہ ذکر کر چکے ہیں"

"تو پھر کر لیجئے نا" آشا سمجھی بات ٹلی۔

"یہی تو کر رہا ہوں ——— کہہ دوں ——— آشا!"

"نہیں ——— کچھ نہ کہئے گا ——— اگر آپ"

"ہاں کیا اگر آپ؟ کہو نا ——— سنو میں ان سے کہہ دوں گا کہ شادی کر دیں مجھے روپیہ نہیں چاہیئے"

"نہیں آپ ایسا نہیں کہہ سکتے"

"کیوں نہیں کہہ سکتا۔ کون روک سکتا ہے مجھے؟"

"میں روک سکتی ہوں"

"کیا مطلب۔ یعنی تم کہہ دوگی۔ کہ۔ کہ"

"ہاں" وہ جلدی سے پردہ لٹکانے دور چلی گئی۔

"آشا یہ تم پھر میرے ساتھ کھیل رہی ہو۔ وجہ آخر وجہ کیا؟" اُس نے اس کا بازو دُرشتی سے پکڑا۔

"——— میری مرضی۔ بس"

"تمہاری مرضی ——— ؟ تمہاری مرضی۔ تو کیا تم مجھ سے ذرا بھی پریم نہیں کرتیں اور ———" اس نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔

آشا پردہ چھوڑ کر پیٹوں کے خلاف بڑھنے لگی۔

"بولو ——— کیا تمہیں ذرا بھی ——— بتا دو آشا پھر میں تمہیں کچھ نہ کہوں گا" اس نے اُسے روک کر پوچھا۔

آشا نے چاہا اوپر نہ دیکھے۔ اس کی آنکھیں تیزی سے جھپکتی جا رہی تھیں۔

"تم ایک دفعہ کہہ دو ——— بولو تم مجھ سے ذرا بھی پریم نہیں کر سکتیں۔ اتنا بھی نہیں جتنا میں ——— بولو ———"

"نہیں ———" آشا جذبات سے بے قابو ہو کر پھوٹ نکلی۔

پورن نے اُسے چھوڑ دیا۔

"اوہ ——— ہا ہا ہا ———" وہ زور سے ہنسا "جھوٹی! تم کتنی جھوٹی ہو آشا ——— تم ——— سچ کہتی ہو آشا۔ اگر میں مر جاؤں تو ———"

"بس بس ——— جائیے یہاں سے" آشا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "کیا مل جائے گا آپ کو۔ ایک ——— ایک کنگالنی کا ٹھٹا اڑا کر۔ آپ کا میرا جوڑ نہیں ——— آپ کے لئے تو کوئی رانی چاہیئے۔

"میں حال ہی میں ثریا سے ملی۔ ملنے سے پہلے مجھے خیال تھا کہ اُس کے چہرے پر بے انتہا نامرادی اور محرومی کا احساس طاری ہوگا۔ شمع محفل بجھنے کے بعد کتنی سوگوار ہو جاتی ہے، مگر ثریا کا چہرہ پہلے سے زیادہ تر و تازہ اور کھلا ہوا نظر آیا۔ اُس کی آنکھیں جو ہمیشہ ہی اُس کے چہرے پر ضرورت سے زیادہ دلکش ہونے کی وجہ سے باقی کے نقوش کے ساتھ اجنبی سی لگتی تھیں، اُس کے چہرے سے جو ہر نرنے والے زن کہیاب ہو گئی ہیں۔ اُن میں اب اُکتاہٹ کے بجائے ایک عجیب طرح کا سکون اور اطمینان ہے، جیسے وہ منزل پر پہنچ چکی ہیں۔ عصمت چغتائی ——— "وہ نیند کی ماتی"

"گولی مارو راتی کو ——— وہ دیکھو وہ آئینہ کیا کہہ رہا ہے" آشا نے آئینہ میں خود کو پورن کے اتنے قریب دیکھا تو سب کچھ بھول کر ایک دفعہ اس کا سَر پورن کے سینے پر جھک گیا۔

"میں آج ہی پتا جی سے کہہ دوں گا۔ چاہے وہ مجھے مار ہی ڈالیں" وہ آہستہ آہستہ اس کے کان میں کہنے لگا "اور پھر میری آشا ———" آشا کی نظر پھر آئینہ پر پڑی اور اس دفعہ چکی کا چہرہ اُسے پیچھے سے آگ برساتا دکھائی دیا۔

"چکی ——— !" وہ تڑپ کر ہٹی۔

"چکی ——— اوہ وہ چڑیل ہوتی کون ہے۔ کیا تمہیں اب بھی کچھ خیال ہے۔ جلتی ہے اس بچاری سے"

"نہیں۔ وہ ابھی یہاں کھڑی تھی"

"اچھا جا سو ہی ——— خیر کچھ بات نہیں۔ چکی

تو کیا کوئی بھی آجائے مجھے کسی کا ڈر نہیں۔"

"اچھا یہ ہمت! میں بھی تو دیکھوں اُس سورما کو جو کسی سے نہیں ڈرتا۔"

اور ماتاجی اپنے پورے جلال سے تنی ہوئی دروازے میں کالی گھٹا کی طرح منڈلا رہی تھیں۔ آشا کا بس نہیں تھا جو وہ جادو کے زور سے یا تو مکھی بن کر اڑ جاتی یا پتھر بن جاتی۔ پتھر تو وہ بن ہی گئی۔

"ماتاجی!"

"چپ رہو ——— لاج نہیں آتی۔ انہیں ہونٹوں سے مجھے ماتا کہتے ہو جن سے دو گھڑی ہوئی ہوئی تھوڑی ایک گندگی چاٹ رہے تھے۔"

"مگر سنئے تو ———"

"میں نے ایک دفعہ کہہ دیا کہ چپ رہو۔" "میں تمہارے منہ نہیں لگ رہی جسے خاندان کی اور باپ کے اچھے نام کی لاج نہ ہو وہ ماتا کا کیا آدر کرے گا مجھے تو اس چڑیل سے پوچھنا ہے۔" وہ دو قدم آگے بڑھیں۔

"پہلے آپ میری سنئے ——— پھر ———"

"کیوں کمینی ——— یہ ہم نے تیری سات پشت کو اسی لئے پالا تھا کہ تو ہمیں ہی موقع پاکر ڈس جائے۔"

"بول ——— بتا ——— نمک حرام۔" وہ اور بڑھیں۔ آشا سر سے پیر تک لرز گئی۔ آج تک ماتاجی نے اُسے ٹیڑھی آنکھ سے نہ دیکھا تھا۔ وہ کسی سے بھی ٹیڑھی نہ تھیں ان کی شان اور دبدبہ ہی سے سب لرزتے تھے اور عموماً وہ گھر سے علیحدہ پوجا پاٹ، پڑھنے پڑھانے میں کھوئی رہتی تھیں یہ تو اس قدر اہم معاملہ درپیش تھا۔ اس لئے وہ آسمان سے دھرتی پر اتر آئی تھیں۔

"تم میری حفاظت میں ہو۔" آشا! اس نے اس کے کانپنے سے رحم کھا کر کہا۔ "ماتاجی ———"

"اوہو ——— میں بھی تو دیکھوں تمہاری حفاظت، پورن سنگھ تم بولتے ہو۔ تم یہاں سے جاؤ اور مجھے اس سے آج اتنا پوچھ لینے دو کہ کیا میری محبت کا اسے یہی اجر دینا چاہیئے تھا۔"

"ماتاجی شما ———" آشا تڑپ کر اُن کے پیروں پر آن پڑی۔

"شما!! ——— اب میرا گھر اُجاڑ کر مجھ سے ہی شما مانگتی ہے۔ سچ ہے نیچ ذات کا منش منہ لگائے سے سر پر چڑھنے لگتا ہے۔ بول۔ یہ تجھے ہمت کیسے ہوئی:" ماتاجی جب جلال میں آتی تھیں۔ تو کالی مائی بن جاتی تھیں۔ انہوں نے اس کے بال پکڑ کر منہ اٹھایا۔

"بس ماتاجی ——— چھوڑیئے ——— اسے۔" پورن نے ان کا ہاتھ پکڑ کر الگ کیا۔ "آپ سنتی تو ہیں نہیں۔"

"پورن! تجھے یہ ہمت ———" ماتاجی کا گلا بھر آیا۔

"کیا جھگڑا ہے! جھگڑا تو کچھ ایسا تھا کہ راجہ صاحب کو بھی اُن کے بل سے کھینچ لایا۔

"بتا جی!"

"دیکھ رہے ہیں آپ اپنے سپوت کے لچھن۔ کس صفائی سے میرا ہاتھ مروڑا ہے۔ بھگوان۔" وہ سر پکڑ کر دھمکیاں دینے لگا۔

"پورن چلو تم باہر ——— بڑے بھیا ماں کے غصہ سے لرز رہے تھے۔

"پہلے ماں سے معافی مانگو۔"

"میں ——— ماتاجی شما ——— مگر یہ سمجھ ———"

"چپ رہو پورن۔ بہت بکواس ہوئی۔" اور بھیا اُسے ننھے بچے کی طرح کھینچتے لے گئے۔

یہ وہ ٹھوکر جو اصلی معنوں میں پورن سنگھ نے کھائی اور اس ٹھوکر میں وہی ہوا جو ہتھوڑی کے کانچ سے ٹکرانے سے ہوتا ہے۔ مگر کانچ ٹوٹ کر زیادہ بکھرتا ہے اور بکھر کر ہر ننگے پیر چلنے والے کے تلوؤں میں گھس جاتا ہے۔

فیصلہ

بتلانے کی ضرورت تو نہیں لیکن فیصلہ تو پھر بھی ہوا۔ پوُرا کا پورا اجلاس جمع ہوا۔ ماتا جی نے جج کی کرسی سنبھالی۔ مگر کاٹھ کے اُلّو بلکہ گدھے کی طرح راجہ صاحب کو دھر لیا بھلا ایسے غیر دلچسپ قصے میں کیا جی لگے۔ جب ہیروئن پڑی کوٹھڑی میں سسک رہی ہو اور ہیرو کمرے میں زمین ناپ ناپ کر فرش گھس رہا ہے۔ ایسے ہیرو ہیروئن کا اس سے بہتر حشر بھی کیا ہو سکتا تھا اوپر سے کچہری تیار۔ جب پوُرن بلائے گئے تو ان کا منہ نیچے کو جھول رہا تھا اور بال بکھر رہے تھے۔ بھابی پردے کی آڑ سے اُن کی یہ گت دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھر رہی تھیں۔ مگر ٹھنڈی سانسیں اگر غصہ کو دھار کر سکتیں تب تو ایک بات بھی تھی۔

"آؤ پورن ——— یہ کیا جھگڑا اٹھایا ہے بھیّا؟"

پتاجی جھگڑا ہی نہ سمجھ چکتے تھے۔

"وہ پھر اُنھوں نے اُسے بگاڑنے کی ترکیبیں شروع کیں۔ ارے اگر تم ہی نہ ایسے نرم ہوتے تو یہ بچے وہ کوڑی کے کیوں ہوتے" حالانکہ انہیں یقین تھا کہ اروپ سنگھ لاکھ روپے کا آدمی تھا۔

"ارے بابا تم تو ——— بس ——— ہاں بے پوُرن یہ کیا بدتمیزی ہے بھدی طرح ——— بس تو کالج جا ——— ہو چکی یہ امتحان کی تیاری"

پتاجی میں کوئی پاپ تو نہیں کر رہا"۔

"پاپ نہیں یہ تیرا پن ہی تو ہے جو تو ہم لوگوں کے منہ پہ کالک لگا رہا ہے"

"وہ واہ کرنے سے کالک لگتی ہے"

"پھر وواہ کا نام لیا؟ ددلو تو اس نیچ سے میرے جیتے جی تو کرنے کی کوشش بھی نہ کرتا"

"کیوں ہٹ کرتے ہو پورن۔ وہ ون کا جیون ہے اُسے کیوں روک لگاتے ہو ——— فرض کرو تم نے جیسا کہ کہتے ہو کر بھی لیا تو یہ تمہاری بھول ہو گی۔ مہا بے وقوفی ——— اول تو تمہاری ماتا مجھے تمہیں اور اس کی بچی کو جینے نہ دیں گی۔ بھلا اُن کی اس سے نبھے گی؟"

"بھگوان نہ کرے جو میں اس سے نباہ کا رشتہ جوڑوں! دیکھو تجی تم ادھر ادھر کی تو ہا حکومت، صاف کیوں نہیں کہہ دیتے"

"ارے بولنے تو تم دیتی نہیں ہو۔ ہاں تو پوُرن خود سوچ لو۔ کیسے وہ یہاں رہے گی ——— دوسرے وہ ——— وہ" راجہ صاحب بڑے روشن خیال بنتے تھے ذرا ہچکچائے۔

"مگر پتاجی آپ تو ہری جن پریمی ہیں۔ آپ کیسے"

"ہری جن ——— یہ ان کی ہری جن سنتے ہی تو لٹیا ڈوبی۔ سوچیں نہ سمجھیں اور بکواس کرنے لگیں۔ کتنا کہا کہ بھئی تم اپنے وہی دواؤں کے جھگڑے میں نہ رہو۔ بے چارے راجہ صاحب نے کسی زمانہ میں کوئی سدا جوان رہنے کی اور طاقت کی دوا بنوانے میں کچھ گڑبڑ مچائی تھی۔ مگر جوان جوان لڑکوں کے سامنے وہ اس واقعہ کے ذکر سے ہی دبک جاتے تھے۔

"غصہ پوُرن پر اور بپھر رہی ہو مجھ غریب پر جیسا کہو کہتا جاؤں مگر کسی طرح چین بھی ہو تمہیں"

"سنو پُورن تم معاملہ کو سمجھتے ہو۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا۔ ذرا سوچو تمہاری حرکت کا ہم سب پر کیسا اثر پڑے گا۔ کملا کی سسرال والے کیا کہیں گے —— میری بیوی کے گھر والے کیا سوچیں گے۔ ہم کہاں منہ لے کر جائیں گے؟"

"آپ بہت خود غرض ہیں بھیّا۔ آپ کے سسر کون سے شاہ ہیں ساری عمر سود کھاتے بیتی —— اور اب؟"

"بھابی بے چاری کا ناپ کر دور ہٹ گئی!"

"کچھ بھی ہو تمہارا کہنا کسی طرح بھی نہیں مانا جا سکتا۔"

"نہیں مانا جا سکتا تو نہ مانا جائے۔ منوانا کون ہے؟ ..کہا ناکر پتا جی مجھے کنگال کر دیں گے —— بس۔ سو اس کی مجھے رتی بھر پروا نہیں۔"

"ہاں —— پروا نہیں اور پھر وہ جسے تم بڑی دیوی سمجھتے ہو ضرور تم سے "واہ" کرے گی! ارے وہ تجھ پر تھوکے گی بھی نہیں سُنا؟" ماتا جی بولیں۔

"آپ نہ اُسے سمجھ سکیں اور نہ کوشش کی۔"

"ارے میں ایسی عورتوں کو خوب سمجھتی ہوں۔"

"بس ماتا جی رہنے دیجئے —— پتا جی بھیّا میرا جواب سُن لیجئے میں آشا سے شادی کروں گا اور آپ کہتے ہیں یہ نا ممکن ہے تو دکھا دوں گا کہ نا ممکن باتیں بھی کبھی کبھی ممکن ہو جاتی ہیں۔ میں آج ہی یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ پھر آپ لوگوں کو کوئی برائی نہ دے گا۔"

"تم جہاں بھی جاؤ ہمارے لئے بدنامی اور کلنک کا ٹیکہ لگواؤ گے اور یہی چار لوگ یہی کہیں گے کہ بڑا لالچی بڈھا ہے غریب لڑکی تھی اس لئے۔"

آج کل کے لوگوں کے دماغ بھی تو خراب ہو گئے ہیں۔"

"تو پھر —— پھر مجھے کسی طرح چھٹکارا نہیں۔"

"نہیں —— تم ہمارے یہاں پیدا ہوئے ہو اور"

"کاش میں کسی کنگال کے گھر پیدا ہوتا کہ مجھے طعنہ تو نہ ملتا۔ مگر پھر کہے دیتا ہوں کہ میں آج چلا جاؤں گا اور مجھے بہت افسوس ہے کہ پھر بھی آپ کو بدنامی سے بچا نہیں سکوں گا۔" پُورن پیر پٹختا چل دیا۔

"ہے کیسے نہیں —— پُورن سنگھ ابھی ننھے ہو تم۔" اروپ نے آہستہ سے کہا۔

"پتا جی۔ بس ایک ہی ترکیب ہے وہ یہ کہ آشا کو کہیں بھیج دیجئے اور پورن کو خبر نہ ہو۔ ورنہ یوں چلے جانے میں وہ خود جوگ کا جھیلے گا سوانگ.... بدنامی تو رہے گی ہی۔"

کہاں بھیج دیں؟"

"کیوں —— اگر کملا کے پاس بھیج دیں اور اُسے تمام معاملہ سمجھا دیں تو وہ ضرور دیکھ بھال رکھے گی۔"

"نہیں جی میں اب اپنی بیٹی کا گھر نہیں جلانا چاہتی، اسے تو اس کے گاؤں ہی ڈلوا دو۔" ماتا جی جانتی تھیں کہ کرن سنگھ کس قدر شوقین مزاج داماد تھے۔

"ماتا جی گاؤں میں تو پورن پہنچ جائے گا۔"

"تو پھر اس ڈائن کو زہر دے دو۔"

"ذرا غصہ کو دھیما کیجئے۔"

"اروپ ٹھیک کہتا ہے۔ کملا اس کی دیکھ بھال اچھی کرے گی اور پورن کے پُرکھوں کو بھی پتہ نہ چلے گا۔"

اس لاڈ پیار سے لائی ہوئی آشا سمیٹ سماٹ کر کملا کے یہاں کوسوں دور پہنچا دی گئی۔ شرم اُسے یوں آئی کہ کملا کیا سوچتی ہوگی۔

مگر کملا کچھ زیادہ سوچ بچار کی عادی نہ تھی۔

جب پُورن کو ننھی شیلا نے بتایا کہ آشا دے دی گئی تو وہ سانپ کی طرح بل کھا اٹھا۔ پہلے تو وہ گاؤں دندناتا پہنچا مگر پھر وہ بھیّا سے لڑنے آیا

"میں خوب سمجھتا ہوں بھیا ـــــ میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ آپ کی شریلی بیوی تو آپ کو پسند نہیں اور آشا کے لئے آپ جیسی اتنے پریشان ہیں!"

غصہ میں انسان پاگل ہو جاتا ہے۔

پُورن کیا کہہ رہا ہے یہ تو! ان کے حواس گم ہو گئے۔ "پورن میں تو تیرے بھلے کے لئے کر رہا ہوں۔ ورنہ میرے بھیا میرا بس ہوتا تو میں!"

"تمہارا بس؟ بھیا تمہارا تو خوب بس تھا جبھی تو تم نے یوں میرے ہاتھ پیر کاٹ دیئے۔ بھیا تم میرے ہمیشہ سے دشمن ہو۔ میں مر جاؤں تو خوش ہو ناساری جائیداد کے مالک تو ہو گئے"

"پورن بس کرو۔ ایسے بول نہ نکالو جن سے بعد کو پچھتانا پڑے۔ تم میرے بھائی نہیں بیٹے کے برابر ہو۔ اگر ایسا ہی مجھے دولت کا پیار ہوتا تو جان بوجھ کر تمہاری شادی ماتا پتا کی بغیر مرضی کروا دیتا۔ تاکہ وہ تمہیں کوڑی نہ دیں۔ پورن مجھے ایسا نہ سمجھو۔ پرماتما کے لئے یوں میرا دل نہ دکھاؤ۔"

اروپ کی بڑی سنجیدہ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"پھر آپ نے اُسے کہاں بھیجدیا۔ آپ مجھے اس کا پتہ بتا دیجئے۔"

"میں نے اُسے نہیں بھیجا۔ وہ خود ہی چلی گئی۔ اس نے کہا وہ تمہارا جیون خراب نہیں کرنا چاہتی ـــــ پُورن وہ دیوی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ مر جائے گی مگر اب تم سے لاگ نہ رکھے گی۔"

"بھیا ـــــ کیوں کہا اس نے ایسا ـــــ وہ مجھ سے پریم نہیں کرتی۔"

"نہیں پورن ـــــ میں نے کہا نا۔ وہ تم سے پریم کرتی ہے جبھی تو وہ گئی ـــــ تم مانو تو ـــــ"

"مگر اب میں کیا کروں بھیا" پورن نے کھوئے ہوئے بچے کی طرح بتانا شروع کیا۔

"تم مرد ہو ـــــ مردوں کا کام عورتوں کی یاد میں رونا نہیں۔ وہ چلی گئی تو تمہاری سمجھ اور عقل تو نہیں لے گئی ـــــ گاؤں کا کام دیکھو امتحان کی تیاری کرو۔"

"مگر میں اُسے ڈھونڈھ نکال لوں گا۔"

"تم اُسے دکھ دو گے ـــــ پُورن۔"

"دکھ ـــــ آہ ـــــ وہ سسکیوں سے رونے لگا۔

بھول گئے

دنیا ہی بھول جاتی ہے۔ چھری کا گھاؤ بھرا اور دکھ دھیان سے اترا ماں، بچہ جنتے وقت توبہ کرتی ہے۔ خدا سے دعا مانگتی ہے کہ بانجھ بھلی اور ادھر دکھ بیتا اور وہ ننھے بچے پر فدا ہونے لگتی ہے۔ اور دوسرے بچے کی آس باندھنے لگی۔ مگر پورن تو ٹھیک بھولا۔ آشا مر گئی۔ سنا اُسے طاعون لے گیا۔ گاؤں بھر طاعون اُجڑ گیا۔ ربی سا پھولن لوٹ گیا۔ اس کی بڑھیا ماں کی کمر ٹیڑھی ہو گئی ـــــ آشا مر گئی۔ پورن کی آشا مر گئیں۔ وہ بہت کچھ بھول گیا۔ کتنا سا ہنستا بھی بھول گیا۔ منا کتنا بڑا اور شریر ہو گیا تھا۔ اور دوسرا ننھا بھابی کی چھاتی سے آن لگا۔ مگر وہ انہیں

پیار کرنا اور گدگدانا بھی بھول گیا۔ آشا ہوتی تو اُسے سب کچھ یاد رہتا۔ وہ دکھا دیتا کہ وہ بزدل نہ تھا۔ وہ صرف پتاجی کے آسرے پر پیدا نہیں ہوا تھا وہ دکھا دیتا کہ دنیا میں جینے کے کتنے راستے ہیں۔ مگر یہ آشا کیوں مر گئی۔ کیسا بھولا کہ بھولا کی تائی کو بھول گیا۔ یہاں تک کہ وہ خود چھیڑ بیٹھی۔ مگر وہ مسکرا کر چپ ہو رہا اور بڑھیا کے دکھی دل میں ٹیس سی اٹھی اور وہ کملا گئی۔

پورن شیلہ کی سالگرہ ہے۔ کیا دو گے تم ـــــ" بھابی اٹھلائی

"کیا دوں ـــــ" پورن سر جھکا کر بولا۔

"میں بتاؤں ـــــ اری شیلہ کیا لے گی؟"

اور پھر اس نے شیلہ کے کان میں نہ جانے کیا سکھا دیا کہ وہ بولی :

"چاچی ـــــ ہیں ممی چاچی"

"ہاں! تو اپنے چچا سے کہہ"

پورن چپکا اٹھ کر چلا گیا۔

"تم شادی کر لو ـــــ ماتاجی کتنی دکھی ہیں"

"ہاں بھیا ـــــ یہ سب میرے ہی کارن دکھی ہیں"

"نہیں پورن ـــــ ڈاکٹر کہتا ہے کہ شادی سے تمہاری صحت ٹھیک ہو جائے گی"

"واہ بھیا، شادی کوئی دوا ہے کہ بیمار اچھے ہو جائیں اور کون کہتا ہے کہ میں بیمار ہوں"

پورن میرے لال ـــــ" ماتاجی نے گھٹنے پر لٹا کر پیار سے کہا کیا یہ ارمان چتا میں لے جاؤں گی۔ میرے دو لال ہیں اور ان میں سے ایک کا بیاہ اپنے ہاتھوں سے نہ کروں"

پورن تھوڑی دیر چپکا پڑا رہا۔ نہ جانے کیا کیا باتیں دل میں مچلتی رہیں جی چاہا ماں سے لپٹ کر رونے لگے بچپن میں جب کوئی چیز ماں چھین لیتی تھی تو وہ یہی کرتا تھا اور وہ اُسے فوراً دے دیتی تھی۔ مگر اب آشا کو تو موت ہی چھین لے گئی۔

"چاند میرے ـــــ تمہارے پتاجی بوڑھے ہو رہے ہیں، کیا سمجھتے ہو۔ ان کے من میں تمہارے وواہ کا ارمان نہیں"

"لفظ وواہ" نے سوئے ہوئے ذکر جگا دیئے۔ نہ جانے اسے کیا کیا یاد آ گیا۔ پر یہ ماں بھی کیسی چیز ہے۔ آپ کی بوٹیاں کاٹ ڈالے مگر پھر آپ اس کے جسم کے ہی تو ایک ٹکڑے ہیں۔ اور پھر ان آنکھوں میں کتنا پریم تھا۔

"ماتاجی میرے وواہ کا آپ کو شوق ہو تو ـــــ"

"پورن گئی باتوں کو جلنے دو۔ ماں کی بھول بھی ممتا کا ایک پھیر ہے یا ممتا ہی ہیں بچے کو خون پلا کر پالتی ہے اور ممتا ہی مار ڈالتی ہے تو کیا وہ ماں ڈائن ہو گئی ـــــ بیٹا" اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ نکلیں۔

"میں کیا سکھی ہوں"

"اچھا ماں اب"

"تم بیاہ کر لو ـــــ تمہیں خوش دیکھ کر دو دن میں بھی جی لوں گی۔ ورنہ،

"جو جی میں آئے کیجئے ماتاجی" وہ اٹھ کر کمرے میں جا پڑا لیٹے لیٹے جی گھبرایا تو دراز میں سے پھول نکال کر دیکھنے لگا۔ یہ وہی پھول تھے۔ لال لال، بھیا کے گالوں جیسے لال جو دھرتی نے اُگلے تھے اور وہی دھرتی آشا کی خاک کو نگل چکی تھی۔ اب یہ پھول سیاہ ہو چلے تھے، جیسے جما ہوا مردہ خون!

جب کملا کی نند کے لئے پورن کی مانگ گئی تو وہاں سب کی باچھیں کھل پڑیں۔

"پورن اپنا ہی لڑکا تو ہے" کملا کی ساس جو سارے محلے بھر کے نام پر ناک بھویں چڑھاتی تھی پیار سے

بولی۔
"ہاں! ماتاجی پورن بڑا ہنس مکھ ہے۔ بالکل اپنی شانتا جیسا۔"
تم جو چاہو سو کرو۔" بڑھیا خوشی دبا رہی تھی۔

"بھول گئے نا! اتنی جلدی بھول گئے پورن سنگھ جی!"
آشا نے اپنی کوٹھڑی کی زمین پر گر کر سوچا۔
"کاش وہ اپنے گاؤں میں ہوتی تو رنجی پہلوان کی طرح طاعون اُسے بھی ڈس جاتا۔"

آگ

یہ تو وہ آگ ہوتی ہے جو چولھے میں دن رات بھڑکتی رہتی ہے اور پھر ایک وہ ہوتی ہے جو کسی کی نادانی سے سوکھے چھپر میں لگ جاتی ہے۔ اور کاغذ کی طرح بھک سے بجھ جاتا ہے۔ اب سنا ہے وہ آگیں بھی ہوتی ہیں۔ جو بم کے گولوں سے پھیل جاتی ہیں۔ اور دم کے دم میں اونچی اونچی کوٹھیوں کو بھسم کر دیتی ہیں۔

لیکن وہ ننھی سی چنگاری جو بھوبل میں پڑی ہولے ہولے سلگا کرتی ہے وہ بھی تو آگ ہوتی ہے نہ کسی محل دو محلے کو جلائے نہ کچھ پر جہاں دبی پڑی رہتی ہے آس پاس کی بھوبل ہلکی ہلکی تپش سے سفید اور بے جان ہو جاتی ہے اور ایسی ہی کوئی چنگاری کہیں کلیجہ میں جا چھپے تو ویسے تو جسم کھاتا بھی ہے پیتا بھی ہے اور سبھی کچھ کرتا ہے۔ مگر وہ دھیمی دھیمی آنچ اور وہ میٹھا میٹھا درد کچھ من بھلکا سا رہتا ہے۔ آشا بھی تو شانتا بائی کا جہیز لے رہی تھی۔ مگر ہاتھوں سے اور دل گزری ہوئی باتوں کے ساتھ دھوپ چھاؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔ بھگوان نہ کرے کیا وہ یہ چاہتی تھی کہ پورن پاگل ہو جائے یا اس کے دکھ میں سدا اکتارا لیے بیٹھا رہے اس نے جان بوجھ کر تو محبت کی نہیں اور پھر کی بھی تو اس پر شاباش اور ہمت افزائی کے سننے کی اُمید ہی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی۔ پھر وہ چاہتی کیا تھی۔ یہ وہ بالکل اکیلے میں اپنے من سے بھی نہ کہہ سکتی تھی۔

کچھ تو کہتا پورن۔ کچھ تو بولتا۔ وہ دور نہیں اس کی اپنی بہن کے یہاں تھی ــــــ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ بہت دفعہ ہمارے پیٹھ کے پیچھے رکھی ہوئی چیز جس کے لئے ہم تڑپ رہے ہیں ہمیں نہیں ملتی۔

"آشا ــــــ دیکھو تو تم نے سارے پھوسڑے نکال دیئے اس میں۔" شانتا بائی نے اُسے کوئی کپڑا دکھا کر ایک جھٹکے سے خوابوں کی دنیا سے گھسیٹ لیا۔

"کیا ــــــ ہاں ــــــ شانتا بائی۔ یہ کپڑا ہی ایسا ہے۔ میں نے تو بہت سنبھالا۔"

"خاک سنبھالا۔ اب اُسے الگ پینا ہاتھ سے۔ تمہارا تو من ہی نہیں لگتا۔" وہ کپڑا آشا پر پھینک کر چل دی۔

"او ہو ــــــ آشا دیوی سلائی کر رہی ہیں۔" شام لال ہمیشہ اترا کر بات کرتا تھا۔ کرن سنگھ نے نہ جانے کن خصوصیات کو دیکھ کر اسے چھوڑا تھا بس وہ ان سے ڈرتا بہت تھا اور یہی ادا کرن سنگھ کو اس کی بھا گئی تھی۔ وہ انہیں کی ذات برادری کا ہوگا یا بنتا تھا مگر گھر میں ایک غریب رشتہ دار کی حیثیت سے رہتا تھا

جب سے آشا آئی تھی حسبِ عادت اس نے اس سے بھی شروع کر دیا تھا۔ مگر یہ ڈر خوب تھا جہاں وہ اسے اکیلا دیکھتا اور میٹھی میٹھی ڈری ہوئی آنکھوں سے دیکھتے اور نرم نرم باتیں کرنے لگتا۔ آشا کچھ نہ بولی۔

"تو ہم سے خفا ہو۔ آشا رانی۔"

"منشی جی بھلا میں آپ سے کیوں خفا ہوتی" یہ آشا نے ایسی تلخی سے جواب دیا جو خفگی سے بھی بدتر تھی۔

"تو تم سے بات کرو تو منہ موڑ لیتی ہو۔ جانتی ہو آشا دیوی ہمارے من کی کیا حالت ہو رہی ہے۔"

"منشی جی آپ جاتے ہیں یا میں بھوجی سے کہوں۔"

"ارے رام یہ ظلم ——— مگر سنو تو کوئی بات کرنا پاپ ہے۔"

"آپ شانتا بائی سے بات کریئے نا۔ ایسا ہی شوق ہے تو۔"

"اوہو ——— خیر ——— مگر آشا دیوی ہم تو بے چارے غریب آدمی ہیں ہماری عادت نہیں کہ اپنی حیثیت سے اونچا ہاتھ پھیلائیں۔"

شام لال نے آشا کی کہانی سن رکھی تھی۔ منشی جی دیا کیجیئے یا اور کچھ آپ کو کہنا ہے۔ اس کے طعن سے رونے پر آگئی۔

"خیر ہم تو کہتے ہیں آدمی کو اپنے رستے پر چلنا چاہیئے۔ کیوں اونچی اونچی اٹاریوں پر چڑھیں۔ منہ کے بل گریں۔"

"ہاں ——— آپ ٹھیک کہتے ہیں منشی جی۔"

"تو پھر ——— آشا ہم تم سے بات بھی کر لیتے ہیں تو۔"

"بات یہ ہے منشی جی میں ——— میں ——— آپ جایئے یہاں سے۔"

آشا اس کی نرم نرم آواز سے جل گئی۔

"ہاں ——— پر اب شانتا بائی کی شادی ہو رہی ہے۔ شانا لڑکا بہت سندر ہے۔ کیوں ہے نا؟"

شام لال اتنا چالاک تھا مگر صورت ایسی بے وقوفوں کی سی بنائے رکھتا تھا کہ بس کڑوی بات مصری کی ڈلی کی طرح حلق سے نیچے اُتار دیتا اور لوگ دیکھتے رہ جاتے۔

"اور شانتا بائی کے ساتھ بھی تو دو ایک آدمی جائیں گے تم ہی چلی جاؤ نا۔"

آشا کا بس چلتا تو کتے کی زبان میں خوب سوئیاں چبھوتی۔ مگر سر جھکائے بیٹھی رہی اور جب وہ چلا گیا تو نہ جانے کیوں آنسو روکے نہ رک سکے۔

شادی کا دن بھی آ پہنچا۔ کملا بھو کی لاپرواہیاں کوئی نئی نہ تھیں۔ نہ جانے کتنی چیزیں عین وقت تک کے لئے نہ آ سکیں۔ نہ جانے کتنے کپڑے بنا سکے ادھورے رہ گئے اور آشا مشین کی طرح ان پر جٹا دی گئی برات اتنی دھوم سے آئی کہ راجاؤں کی بھی نہ آئی ہو گی۔ گھنٹوں تو رسالہ پلٹن نکلتی رہی اور پھر ہاتھی گھوڑے آشا بھی دو تین چھوکریوں کے ساتھ ایک کھڑکی میں پھنسی تماشا دیکھتی رہی۔

"ارے ذرا ہٹو تو چڑیلوں" شانتا بائی نے دو ایک کو الگ کر کے کھڑکی میں اپنا سر اڑا دیا۔

"ہٹو جی ——— تمہیں برات نہیں دیکھنے دیں گے واہ جی! کہیں دلہن بھی اپنی برات دیکھنے بچوں کی طرح دوڑتی ہو گی۔"

ایک بولی "مگر اپنی بائی ہے بھی تو بچہ ——— میں تو اپنی برات دیکھنے کے لئے مچل گئی تھی تو میرے ماؤں نے گود میں لے کر خود دکھائی۔"

دوسری بولیں "پھر ہاتھی پر دولہا گڈے کی طرح بیٹھے تھکے۔ پھولوں اور کپڑوں کے بنڈل میں سے چہرہ

بھی نہ دکھائی دیتا تھا۔ شانتا شوق اور تجسس کا مجسمہ بنی اس کا چہرہ ڈھونڈھ رہی تھی اور آشا ــــ اس کی نظروں سے وہ چہرہ دور کب ہوا تھا۔ برات مڑ گئی اور سب عورتیں دوسری طرف بھاگیں۔ آشا کھوئی ہوئی وہاں کھڑی رہی۔ اُسے جانا بھی کہاں تھا آہستہ آہستہ اس کا سر چوکھٹ پر گر گیا اور لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگی۔

شادی کی دھوم دھام سے علیحدہ وہ ماتا جی کی اجڑی ہوئی حویلی میں خاموش پلنگڑی پر پڑی تھی۔ کتنی دیر سے وہ سونے اور جاگنے کے درمیان کی حالت میں پڑی تھی۔ دل ڈوبتا تھا۔ اور اس میں ایک ٹہوکا سا لگتا تھا اور وہ جاگ پڑتی تھی۔ پھیرے پڑ چکے تھے۔ گولے اور پٹاخے چھوٹ رہے تھے۔ آشا کو جیسے صبر آ گیا۔ ہو چکا اب سب کچھ جب تک شادی نہ ہوئی تھی ایک دم مبہم سی آس بندھی ہوئی تھی۔ مگر وہ بھی اب بکھر گئی۔ اس کے پیر ایک دم دروازے کی طرف اٹھنے لگے۔ آخر ایسا کیا حرج ہے۔ کیا اس کی آنکھوں نے بھی کوئی پاپ کیا ہے جو وہ کچھ بھی نہ کہہ سکیں اور پھر وہاں اسے بھیڑ بھاڑ میں کون دیکھے گا۔ کون پہچانے گا؟ وہ جلدی جلدی خیمہ کی ڈوریوں سے بچتی ہوئی ٹھوکریں بچاتی چلی۔ ہال قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ دلہن اور دولھا بیٹھے تھے۔ وہ بھیڑ کو چیر کر ایسی جگہ کھڑی ہو گئی جہاں سے وہ کم از کم پورن کو دیکھ سکتی تھی۔ وہ سب کچھ بھول کر بچی کی طرح دولھا دلہن دیکھنے آئی تھی۔ مگر وہی دل ابھرنے ڈوبنے لگا۔ پورن بت کی طرح خاموش بیٹھا تھا۔ کس قدر بدل گئی تھی اس کی شکل۔ پیلی رنگت اور ابھری ہوئی آنکھیں ! مگر سنہرا مکٹ اس کی سفید رنگت پر کتنا بھلا لگ رہا تھا۔ جیسے پریوں کا شہزادہ۔ آشا نے اسے کالے پیلے سوٹ کے سوا کسی چمکتے کپڑوں میں نہیں دیکھا۔ آج تو وہ نرالا ہی پورن تھا۔ کتنا بدل گیا۔ انسان ایک زندگی میں کتنے جنم لیتا ہے۔ بھابی پھول کی طرح کھلی ہوئی اس کے پہلو میں بیٹھی تھی اور ایک تھالی میں پانی بھر کر کچھ عجیب سی رسم ہو رہی تھی۔ دلہن اور دولھا کی ہوشیاری کا مقابلہ ہو رہا تھا کہ کون اس پانی میں سے انگوٹھی لے لے۔ پورن کئی دفعہ جیت چکا۔ جیت کیا چکا تھا بھابی اس کا ہاتھ بچوں کی طرح پکڑے تھی

دروازے کے سامنے ہی تھوڑی سی جگہ صاف کر کے ناچ بھی ہو رہا تھا آج چمکی نہ جانے کتنے دنوں بعد ناچ رہی تھی۔ ایک بان نہ جانے کب اکھڑ کر پردے کے پاس گر گیا تھا اور پردہ مع سائقہ کے کواڑ اور کاغذ کی سجاوٹ کے ہولے ہولے سلگ رہا تھا۔ چمکی جیسے بپھرے تھی۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور گال تمتمائے ہوئے بجلی کی روشنی میں شعلہ لگ رہے تھے۔

آشا نیچی ہونے کی وجہ سے ایک سٹول پر کھڑی کندھوں پر سے جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آگ چھپی ہوئی بڑھ رہی تھی ہولے ہولے نیچی نیچی اور اب قالین بھی جل رہا تھا۔ ناچ موت کی سی تڑپ کے ساتھ تیز ہو رہا تھا۔ جیسے گرنے سے پہلے کبوتر پھڑپھڑاتا ہے۔

کوئی بیچلی آشا کے سٹول پر چڑھنے لگی۔ توازن بگڑا اور آشا کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ اسٹول تو سنبھل گیا مگر کھیل بگڑ گیا۔ پورن کی بھرپور نظر آشا کی آنکھوں میں اتر گئی اور تھوڑی دیر کے لئے سُن ہو گئی۔

— آشا ــــــ ! پورن نے بیوقوفوں کی طرح سانس کھینچی۔ جیسے کوئی بھوت کو مرگھٹ سے آتا دیکھ کر بیجان ہو جائے۔ پورن کھڑا ہو گیا۔ گھماتے ہی آشا کا اسٹول الٹ گیا اور وہ جیسے قبر سے نکل کر پھر غڑاپ سے اسی میں ڈوب گئی۔ پورن کے چہرے پر دیوانگی اور گھبراہٹ سے موت کی سی زردی چھا گئی۔ وہ آنکھیں پھاڑے

دیوار کے اس حصے کو تکتا رہا جہاں ذرا دیر پہلے آشا کا دکھی چہرہ اس کی آنکھوں میں کوئی سندیسہ دے کر غائب ہو گیا۔

"کیا ہے پورن ـــــ بھابی نے اس کا ہاتھ ہلایا۔

آشا ـــــ بھابی ـــــ ابھی ـــــ

"کیا ہے پورن ـــــ کیسی دیوانی باتیں کرتا ہے۔"

"پورن ـــــ بچہ بنے جلتے ہو ـــــ بھلا وہ یہاں کہاں۔"

"مگر بھابی یہ سپنا بھی نہ تھا ـــــ وہ یہاں تھی"۔ پورن نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ مری نہیں بھابی!"

"پورن میرے بیرن ـــــ کیسی بھولی باتیں کرتے ہو۔ وہ مری یا جیتی۔ تم ذرا دیکھو۔ آہستہ بولو۔" کملا بولی

"مگر بھابی"

"اگر مگر کیا پورن ـــــ اب تمہیں کیا کہ وہ مری یا نہیں۔ تم نے تو شادی بھی کر لی اب کہیں۔"

"شادی ـــــ! مگر کیا وہ زندہ ہے۔"

"پورن چلو ذرا باہر چلو ـــــ تمہارا جی ٹھکانے نہیں ہے۔" بھابی بات گول مول کر کے کہنے لگی۔

مگر آگ بھڑک چکی تھی۔ شعلے فرش، دروازے اور پردے میں لپک رہے تھے ـــــ اور چکی ناچ رہی تھی آگ اس کے مہین دوپٹے میں لہرا رہی تھی۔ مگر وہ مست تھی۔

"آگ ـــــ!" مجمع چیخا اور ایک پٹاخے کے ساتھ چکی۔ وہ ایک بار پھڑپھڑائی جیسے شمع پہ جل مرنے سے پہلے پتنگا لہراتا ہے اور وہ اوندھے منہ گری۔ آگ سب کو نظر پڑی اور ذرا سی دیر میں بجلی کا تار جل اٹھا۔ ایک قیامت برپا ہو گئی۔ شعلوں کی روشنی میں پورن نے سہمی ہوئی شانتا کی طرف ایک بار دیکھا۔ دھوئیں اور گرمی سے وہ گر رہی تھی اور کسی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ ذرا سی دیر میں شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ اس نے گرتی ہوئی شانتا کو سنبھالا اور پچھلے کمرے کی طرف بڑھا۔ بجلی کے تار سے اوپر بھی آگ لگ رہی تھی۔ وہ برآمدے کی طرف مڑا۔ باہر دھندلی روشنی میں اس کی روح پھر دنیا سے کھینچ کر مرگھٹ میں پہنچ گئی۔ آشا دنیا سے بے خبر دیوار سے سر ٹکائے کھڑی تھی۔

"آشا!" پورن کے گلے سے نکلا۔

"آشا چونک پڑی ـــــ مگر زیادہ دیر کے لئے نہیں۔ شانتا کو پورن کے بازوؤں میں دیکھ کر وہ پھر اسی طرح بے کسی کے دریا میں ڈوب گئی۔ اس کے جسم کی ساری نسیں ڈھیلی ہو گئیں اور گرم گرم دھوئیں نے اس کا حلق بھینچ دیا۔

پورن نے شانتا کو چھوڑ دیا جو حیران دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے اڑتی اڑاتی کچھ افواہیں سنی تو تھیں۔

پورن آہستہ سے بڑھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ آشا کی روح ہے جو مرگھٹ کی خاک سے اٹھ کر اس کی شادی کو جتانے آئی ہے۔ وہ جھجکتا بڑھا کہ کہیں وہ ہوا میں غائب نہ ہو جائے۔

"نہیں ـــــ" آشا نے دیوار سے چمٹ کر کہا اور پورن روح کی اس پکار پر تڑپ اٹھا۔ اس نے آہستہ سے اس کا بازو چھوا اسے یقین تھا کہ وہ صرف ایک واہمہ ہے لیکن جب بجائے خالی ہوا کے اس کا ہاتھ آشا کے سرد جسم سے مس ہوا تو وہ جاگ اٹھا۔

"پورن ـــــ" شام لال کی آواز نے بتایا کہ وہ زندہ ہے۔ لیکن شاید شام لال نے آشا کی روح کو نہیں دیکھا۔

ایک لمحہ میں پورن نے فیصلہ کر لیا۔ وہ ایک چھجے سے آشا کو لے کر برآمدے میں نکل آیا۔

"آشا ـــــــ اب تم نہیں جا سکتیں مجھے یوں چھوڑ کر۔ اس نے ایک پیاسے کی طرح اُسے کلیجہ سے لگا کر کہا۔ "تو یہ کیا چال تھی سارے گھر کی!ـــ میں سمجھا ـــــ اب میں سمجھا۔ لیکن بس اب ہو چکا کھیل۔ چلو آشا ہم تم بھاگ چلیں اس مکار دنیا سے ـــــ چلو ـــــ" وہ جلدی جلدی پیڑوں کی آڑ میں بڑھنے لگا۔

آشا ایک کاٹھ کی پتلی کی طرح بے حس تھی۔ اور پورن اسے ننھے بچے کی طرح ایسے پکڑے ہوئے تھا گویا وہ کھلونا تھی۔ اور بڑی مشکل سے کھو کر ملی تھی۔ ہاتھ سے چھوٹی اور پھر کھو گئی۔ وہ اسے مرگھٹ سے گھسیٹ لایا تھا۔

"مگر ٹھہرو ـــــ آشا ذرا ٹھہرو ـــ میری جیجی اور اس کے بچے نہ جانے اس کا کیا حشر ہوا ہو گا۔

"تم یہاں ٹھیرو۔ میں ذرا دیکھ آؤں۔" اسے پیڑ سے گڑیا کی طرح ٹکا کر وہ چل دیا۔

پورن اُدھر آگ سے الجھ رہا تھا اور ادھر آشا پانی سے۔ وہ پانی جو آگ سے زیادہ تیز ہوتا ہے اور جمی چٹان اُکھیڑ پھینکتا ہے۔

شام لال پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ پورن کے ہٹتے ہی وہ آشا کے قریب پہنچ گیا۔

"ہوں ـــــ تو یہ ترکیب ٹھیک ہے ـــــ کیوں آشا دیوی تم ہو گی کہ منہ سے نوالا کھینچ لائیں۔" نہ جانے شام لال کس مٹی سے بنا تھا کہ چاہے کیسا ہی معاملہ ہو اس کے مزاج میں ذرا بھی بل نہیں پڑتا تھا۔ "رانی صاحبہ ـــــ . . . ہے تو بات ٹھیک ـــــ مگر یہ بھینٹ اچھی نہیں۔" لفظ بھینٹ پر آشا نے سر اٹھایا۔

"یہ پورن سنگھ جی کے جیون کی بھینٹ تو کچھ ـــــ ذرا اونچی ہے۔" آشا پھر بھی اُلو بنی بیٹھی رہی۔

"تم نے یہ بھی سوچا اس کا دواہ ہو گیا ہے۔" آشا کے جیسے کسی نے کلہاڑی مار دی۔ مگر وہ ہلی بھی نہیں۔

"اس کا دواہ ہو گیا ہے ـــــ اور اب اس کا ہی نہیں شانتا بائی کا جیون بھی اس کے ساتھ ہے۔ شانتا بائی انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

کیسے مزے کی بات ہے کہ عورت عورت پر ظلم کرتی ہے اور مرد کو مجرم بتاتی ہے۔ ذرا سوچو آشا دیوی اب کیا ہو گا۔ تم پورن کے سنگ چلی جاؤ گی کہاں؟ اس کے ماں باپ پیاروں سے دور۔ اس کی عزت دولت سب کچھ چھٹا کر ـــــ اور تم سمجھتی ہو کہ تم ایسی قیمتی ہو کہ تمہیں پا کر وہ جگ کو تیاگ دے گا۔ وہ خیر تیاگ بھی دے تو بھی تم عورت ہو۔"

آشا کے دل میں پھر ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔ وہی طوفان جس میں بہت سی کمزور ہستیاں بہہ جاتی ہیں۔

"اور تمہیں کیا ملے گا ـــــ ہ تم تو ایک دیشیا ہی کہلاؤ گی۔" آشا نے یہ تو سوچا بھی نہ تھا۔

"تمہاری حالت ایک دیشیا جیسی ہو گی۔ جس نے پورن سے سب کچھ چھٹا دیا۔" شام لال بات کو مُوٹھ پا کر اور تیز ہوا۔

آشا بولی ـــــ میں جانتا ہوں تم دیوی ہو۔ سنو میں ہوں تو اُلّو مگر دنیا کی ریت رسم سے زیادہ واقف ہوں۔"

"میں ـــــ میں کیا کروں۔"

"تم ابھی یہاں سے چل دو ـــــ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ تو پھر پورن تمہیں نہ تلاش کر سکے گا۔ اس سے کہہ دیا گیا تھا کہ تم مر گئی ہو۔ مگر اب وہ ذرا غل مچائے گا۔ لیکن اگر تم اسے نہ ملو گی تو وہ شانت ہو ہی جائے گا وہ سیدھا سادہ آدمی ہے ایسا آدمی

کیا اعتبار کے قابل ہو سکتا ہے۔ کیا عجب کہ وہ دو دن میں تم سے بھی تھک جائے۔ ہاں اور دیکھو۔ تم چلی جاؤ گی تو وہ تمہیں کیا یاد رکھے گا۔ وہ اب بھی تم کو بھول چکا تھا۔ وہ مزے سے شادی بھی کر رہا تھا اور میرا کہنا سنو۔ تم دیکھ لینا کہ چار دن میں وہ پھر تمہیں بھول جائے گا۔ ایسا ہی ہے تو آزما دیکھو۔"

آشا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں چلی جاؤں گی۔"

"ہاں دیکھو جلدی کرو۔ یہ ادھر سڑک ہے۔ پاس ہی گاؤں میں پہنچ جاؤ گی اور گاڑی کر کے اپنے گاؤں پہنچ جانا۔ تمہیں روپیہ چاہیئے؟"

شام لال نے اُسے نوٹوں میں سے کچھ دیا۔

"میری بات یاد رکھنا۔ اگر پورن تمہیں بھول نہ جائے تو میرے منہ پر سو جوتے لگانا سمجھیں۔ میں تو تمہارے ہی بھلے کو کہتا ہوں۔ لو جلدی جاؤ کوئی آ نہ جائے۔"

آشا تیزی سے جھاڑیوں میں اُلجھتی گڑھوں سے بچتی چلی۔ دور سے اس نے پورن کی آواز سنی۔ "آشا آشا!" وہ پکار رہا تھا مگر اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اور دانت بھینچ لئے۔ آگ ٹھنڈی ہو چکی تھی مگر چنگاریاں دبی سُلگ رہی تھیں۔

ایک چیز پہیں ڈالو اور اُسے میٹ کر رکھ دو تو کیا وہ واقعی مٹ جاتی ہے۔ خوب تحاب کر دیواروں پر چونا لگا دو۔ پھر چھٹ جاتا ہے۔ پیتل پر چاندی چڑھاؤ پھر گھس کر وہی پیتل کا پیتل۔ ایک زخم ہو اس پر ڈھیر سی پٹیاں باندھ دو تو کیا وہ زخم نہیں رہتا۔ ہاں زخم تو نہیں رہتا سڑ کر ناسور بن جاتا ہے۔

پورن کو جب آشا نہ ملی۔ تو وہ ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ ٹھوکر بھی ٹھیک کھائی۔ ورنہ وہ شاید اس سڑک پر دوڑ جاتا جس پر آشا گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔ آگ کی گڑبڑ

جذبات کی تھکان اور اس پر سردی میں ٹھنڈی زمین پر گرنا۔ پورن کئی دن کے لئے بیکار ہو گیا۔ وہ اس کا بخار دوران سر اور گھر بھر کی پریشانی کا بوجھ جیسے کسی نے کوئلوں کا دھواں دماغ میں بھر دیا۔ توبہ توبہ وہ کس قدر بے وقوف تھا۔ ایک مصیبت بن کر رہ گیا تھا۔ اس نے دوبارہ ذرا اپنے رویہ پر نظر ڈالی۔ اس میں اور پاگل میں فرق کیا تھا اور پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ دنیا کے اس زبردست دھارے سے کس کشمکش میں گر کر ہاتھ چھوڑ دے گا۔ اُسے خود اپنے اوپر بھروسہ نہ رہا تھا۔ دن رات کی ایکھر بازی سے بھی وہ تنگ آ گیا تھا اور اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ کر اُسے ایسا سکون ملا کہ وہ اسی میں گم ہو گیا۔ [illegible] کوئی کھلاتا وہ کھا جاتا۔ کوئی ہنساتا ہنس دیتا۔ کوئی بٹھا دیتا بیٹھ جاتا۔ اور دوسروں کے چلانے پر وہ چلنے لگتا۔ معلوم ہوا۔ پر سکون دریا میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔

"کچھ پڑھا کرو پورن" ایک دن بھیانے ملائم سی اور وہ فرمانبردار بچے کی طرح کتاب۔ کتنی باتیں لکھی تھیں۔

پھول ـــــ لال لال پھول ـــــ آگ ـــــ ٹھنڈی ٹھنڈی زمین اور اس میں کھویا ہوا سادہ سفید چہرہ ـــــ وہ ڈوبتی ہوئی آنکھیں مرگھٹ اور ٹھنڈی چتا! ۔

ہیں ـــــ پورن یہ ڈکشنری پڑھ رہے ہو بھابی حیرت سے بولی "بھیا کچھ کھیلا کرو نا۔ آؤ کیرم کھیلیں۔"

"یہ گوٹ کس مزے سے اسٹرائکر دھکا دیتا ہے اور وہ غڑاپ سے گڑھے میں جا گرتی ہے اور اسٹرائکر پھر لوٹ پوٹ کر دندنانے لگتا ہے۔ وہ گیا وہ مارا ـــــ کالی سفید گوٹیں نہیں ایک لال بھی تو ہے۔ سرخ جیسے خون کی بوند۔ لو وہ بھی گئی" وہ سوچتا ـــــ

"چل بے ڈھنگے میری گوٹیں ڈال رہا ہے" بھابی ہنسی مگر وہ پورن کا بے وقوف چہرہ دیکھ کر اداس ہو گئی۔

"وہ ـــــ خود بھی تو ایک گوٹ ہے جیسے گڑھے میں اسٹرانگر ڈال دیتا ہے اور پھر نکال کر تختہ پر جا دیتا ہے جب آدمی جل جاتا ہے تو کیا مرگھٹ سے راکھ اٹھ کر پھر آجاتی ہے اور وہ پھر اسی طرح تھکی ہوئی نظروں سے گھورتی ہے۔

اور پھر لوگ اُسے دوائی پر دوائی کیوں دیئے جا رہے تھے۔ ادہو! وہ بیمار تھا۔

ضرور ہوگا جبھی تو ـــــ آخر لوگوں کو اس کی بھلائی ہی تو منظور ہے جبھی تو اُسے بھر بھر ڈبا دوائیاں کھلائی جاتی ہیں۔ لوگ اسے کتنا چاہتے ہیں۔

اور اس کی بیوی۔ ادہو بالکل بھول ہی گیا تھا۔ اس کے سنگ اس نے اس مقدس آگ کے گرد پھیرے کھائے تھے۔ بالکل ٹھیک لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا یہ اس کا کیا کرے!

وہ بیوی تو تھی ہی اس کی۔ اب کیا انتظام ہونا چاہیئے۔ ٹھیک وہ کل اس کے پاس جائے گا۔ ضرور اور پھر ـــــ پھر وہاں جائے گا پھیرے ہوئے تھے نا۔

مگر ان پھیروں کے خیال سے اُسے چکر آنے لگا۔ آخر یہ پھیرے ہوئے کیوں ہیں؟ ایک دن وہ بھی تھا کہ اُسے پھیروں کا کتنا چاؤ تھا۔ وہ بھولا کی تائی سے پھیرے کرانے کو کہتا تھا۔ بھولا کی تائی کی سفید گوٹوں کی طرح بھتی کی گڑھے میں جا پڑی۔ اور اس کی گودڑی کے سنگ اُسے بھی پھونک دیا گیا۔ لیکن یہ روحیں پھر مرگھٹ سے آجاتی ہیں اور وہی پیار بھری آنکھیں اپنے سے قریب ہوا میں معلق ہو جاتی ہیں۔ وہی خاموش شرمیلی آنکھیں جو اپنی زبان میں چٹا چٹ بولا کرتی تھیں!

یہ رات کو کیرم کے تختہ کے پاس کیوں جا بیٹھتا تھا اور اُسے گھورا کرتا۔ غیبی ہاتھ اسٹرانگر گھما کر گوٹوں کی تھیلیوں میں ڈالتے اور وہ سمٹا ہوا دیکھا کرتا۔ اور گوٹوں کے کیسے بھولے بھولے منہ تھے۔ بھولے منہ تھے۔ بھولا کی تائی چکی اور آشا جیسے۔ آشا تھی نا وہی بنیک سے ڈرتی تھی۔ روتی سی۔ ذرا سی ڈرپوک چھوکری۔

اور وہ اپنی دراز کھولتا جس میں ابھی تک وہ لال لال پھول پڑے تھے نیچے جمے ہوئے خون کے رنگ کے، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ شعلوں کی طرح بھڑک اٹھتے اور چکی کا چہرہ وہ جو پورن نے آخر بار دیکھا تھا۔ انگارے کے رنگ کا ان میں ڈوبتے اچھلنے لگتا وہ کرسی پر گر جاتا۔ اور کرسی زمین پہ۔ پھر نا جانے کیوں سسکیاں بھر بھر کر روتی! اور اُسے پھر دوائیاں کھلائی جاتی۔ مگر سکون تھا۔ مکمل سکون۔ جیسے سڑتے ہوئے تالاب کے پانی میں سکون ہوتا ہے۔ موت کا جیسا خاموش تھکا ہوا سکون!

ہٹ

کچھ دن تو شانتا شرماتی رہی لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ اُسے دوائیں دینے لگی۔ کبھی وہ ایک باتیں بھی کر لیتی۔ "لیٹ جاؤ، اٹھو، چلو۔ کھاؤ، پیئو" بس اس سے زیادہ نہ بولتی تھی اور نہ پورن سمجھ سکتا تھا۔ وہ پاگل تو نہیں تھا۔ کھاتا پیتا اور کپڑے پہنتا تھا۔ ہاں دوسرے تیسرے دن بخار، کبھی کھانسی۔ کبھی درد سر اور کبھی پریشانی یہ تھا اس

سہرمں۔ وہ سڑی ہوتا تو کاٹ نہ کھاتا کسی کے؟ وہی پورن جو ذرا سی بات پر بادل کی طرح گرج کر طوفان ہی طوفان بن جاتا تھا۔ اب بہت ہی نیک ہوگیا تھا۔ پھر لوگوں کو اس سے کیا شکایت تھی؟ وہ کسی کا کیا بگاڑتا تھا۔ آہنسا میں کس کا زور چلتا ہے۔

"پورن ——— بہو سے کبھی بات بھی نہیں کرتے۔"

بھابی نے اُسے ایک دن ذرا تندرست دیکھ کر پوچھا یہ وہی پورن تھا اور وہی بھابی۔

"میں ——— اوہ! کرتا تو ہوں بھابی۔"

"جھوٹے ——— آخر یہ سوگ بھی کوئی مرد مناتا ہوگا عورتیں چتا میں جل جاتی ہیں۔ مگر مردوں کے لئے اگر وہ چاروں طرف سے کھلے جائیں تو بھی بے حیا کھلونے کی طرح ڈٹے رہنا لازمی ہے۔ اپنے اپنے قانون ہیں۔"

"بھابی میں کس کا سوگ مناؤں گا۔ میں نے بیاہ رچالیا۔ سب ہی کچھ تو ہوگیا ——— بات یہ ہے ذرا میری طبیعت اچھی نہیں رہتی۔"

"کچھ نہیں اس سے زیادہ تم بیمار پڑتے۔ اور اب کیا تم بیمار ہو۔ یونہی وہم سا ہوگیا۔ تمہیں تو۔ پورن دیکھو شانتا کیسی اداس رہتی ہے اس کا دل بھی توہے تم کبھی بھول کر بھی اس سے بات نہیں کرتے۔

"کون میں؟ بھابی کرتا تو ہوں۔ . . ." پورن بہو سے بات تو کرتا تھا مگر جس "بات" کا ذکر بھابی کر رہی تھی وہ اور ہی . . . آخر بہو کو دکھ کیا تھا۔ ہندوستانی عورت کو تو صرف پتی چاہیئے اور پتی موجود تھا۔ پھر اب وہ اور کیا لڈو چاہتی تھی۔ بدمعاش وہ نہیں تھا۔ راتوں کو غائب وہ نہیں رہتا۔ مارتا وہ نہیں۔ زیور بیچ کر شراب وہ نہیں پیتا۔ دوسری عورتوں سے تاک جھانک نہیں کرتا۔ پھر آخر وہ کیا روحانی دکھ دیتا تھا کہ شانتا مظلوم مجسم نظر آتی تھی۔ یہ عورت ذات بھی کس قدر ڈھکوسلہ باز ہے اور خصوصاً وہ عورتیں جو خود کو نیک اور پاک باز کہے جانے کا آبائی حق رکھتی ہیں۔ مگر ذرا میاں بیمار بوڑھا ہوا اور اس کے ساتھ وہی سلوک ہوجاتا ہے جو دودھ سوکھ جانے کے بعد قصائی گائے کے ساتھ روا رکھتا ہے۔ اور ذرا سے بہانے پر رنڈی کا پیشہ اختیار کرکے دنیا سے ہمدردی وصول کرنے لگتی ہیں۔ خوب دستور تھا کہ کم بختیں کھٹملوں کی طرح چتا میں پھونک دی جاتی تھیں۔ ورنہ آج کو نہ جانے دنیا میں کتنی طوائفیں ہوتیں۔

پورن سزا دے رہا تھا اور یہ ایسی مہاتما گاندھی قسم کی سزا تھی کہ کسی کا بس ہی نہ چلتا تھا۔ شادی تو کر دادی تھی اور اب ہنسانا، رُلانا کسی کے بس کی بات تو نہ تھی اور دراصل وہ بیمار بھی تھا شادی کی رات کو اُسے ٹھنڈی زمین پر پڑے پڑے ٹھنڈ نے جکڑ لیا تھا جو اس کے کلیجہ میں بیٹھ گئی تھی۔

"جب کسی کی طبیعت ہی ٹھیک نہ ہو تو بات بے بات کیا ہنسے اور وہ بات نہ سننے کے انداز سے چادر میں ڈھانک کر لیٹ گیا۔

"تم جانو ——— لیکن ذرا اُسے دیکھو۔ تین مہینے میکے رہ آئی۔ تم پھر۔ بھابی جانتی تھی پورن کچھ نہیں سن رہا ہے

"بہو تم ذرا پورن کا خیال رکھا کرو۔ دیکھتی ہو وہ کیسا کھویا کھویا سا رہتا ہے۔" بھابی نے دوسرا پتا چلا۔ شانتا سر جھکا کر خاموش بیٹھی رہ گئی۔ ان تلوں میں تیل تو پہلے ہی دن نہ ہونے۔

"ڈاکٹر کہتے ہیں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ذرا ضدی انسان ہے سدا ہی اپنی بات منوائی۔ کچھ دن کی بات ہے تم اس سے بات چیت تو کیا کرو۔"

بھابی جی وہ جواب کب دیتے ہیں۔ جیسے سنتے ہی نہیں! اور جو زیادہ بولتی ہوں تو منہ ڈھانک کر لیٹ رہتے

بھی۔ آپ نہیں جانتی "شانتا عورت تھی اور جو ہتھیار اس کے پاس تھے وہ سارے استعمال کر چکی تھی۔ مرد تو تھی نہیں کہ چڑھ بیٹھتی اس پر!

"ماتا جی کا خط آیا ہے۔" پورن خاموش بیٹھا ایک اخبار کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ شانتا نے اسے جگانا چاہا۔

"لکھا ہے ہولی پر آجاؤ۔"

پورن ایک بکرے کی تصویر غور سے دیکھ رہا تھا جو چاروں پیروں سے ایک ذرا سے کھونٹے پر کھڑا تھا انسان سے زیادہ تو یہ جانور دم دار ہوتے ہیں۔ "ہوں" وہ بولا نہ جانے شانتا سے یا تصویر سے۔

"آپ کو بھی بلایا ہے لکھا ہے دونوں آجاؤ۔" شانتا کا جی چلا چلا کر رونے کو چاہتا تھا۔

"کیا میں اکیلی ہی چلی جاؤں:" وہ صبر سے بولی۔

"ہوں ہوں۔" پورن نے سر ہلایا۔

"آپ ـــــ مجھے ہمیشہ ایسی ہی ـــــ آخر میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ کہ آپ میری صورت سے نفرت کرتے ہیں۔" اس کے آنسو بہہ نکلے۔

"میں ـــــ شانتا ـــــ میں ـــــ" وہ اُس کے آنسوؤں سے ڈر گیا اور گھبرا کر اخبار چھوڑ دیا۔

اس میں میرا کیا دوش ہے کہ ماتا پتا نے آپ کے پیچھے باندھ دیا۔ مگر۔" اس کی آواز گھٹنے لگی۔

"تو ـــــ تم کیا کہتی ہو ـــــ شانتا میرا جی اچھا نہیں۔" پورن نے شرمندہ ہو کر کہا۔ شانتا ایسے بے جگرے انسان کے آگے کیا اپنے آنسو بہاتی اُس کے جانے کے بعد پورن نے سر جھکا لیا اور پھر وہی بکرے کی تصویر دیکھنے لگا۔ اس کا دل بری طرح گھبرانے لگا اور وہ سر کرسی کے ہتھے پر ٹیکے نہ جانے کب تک بیٹھا رہا۔ شام کو اُسے چھینکیں آئیں اور زکام ہو گیا۔

آخر بات کیا تھی؟ ـــــ وہ باوجود غور کرنے کے نہ سمجھ سکا۔ اس نے غور کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ذرا وہ کوئی بات سوچتا اور اس کا دماغ گھوم جاتا۔ اس نے آخر سکون ہی اختیار کیا تھا۔ کتنا مزہ تھا اس سکون میں۔ ہم چپکے پڑے ہوئے ہیں اور لوگ ہیں کہ کونٹوں پر ٹوپیں لگا رہے ہیں۔

"او ہو ـــــ شانتا ہو تو کمرے ہی میں گھسی رہتی ہیں۔ جب دیکھو کمرہ میں۔ جب دیکھو کمرے میں۔" مہیش نے آکر شانتا کو چونکا دیا اور وہ جلدی سے آنسو چھپانے لگی۔

"ارے رام رام آنسو ـــــ شانتا رو رہی ہو؟ بھئی ہم نہیں بولتے۔" مہیش نے اپنا لمبا چوڑا جسم کرسی پر اُڑاتے ہوئے منہ بنایا۔

"منہ جب دیکھو تسر رویا جا رہا ہے۔ مانا کہ بھئی ـــــ مگر۔" وہ خود ہی خود بڑبڑایا۔ "جی میں آتا ہے۔ اسے پورن کو تو بس جھنجھوڑ کر پھینک دوں نہیں۔ شانتا جب تمہیں دیکھتا ہوں تو جانتی ہو کیا حال ہوتا ہے؟ خون کھول جاتا ہے خون! مہیش کے جسم میں تھا بھی گھر بھوں خون!

"میرے بھاگوں میں ہی رونا لکھا ہے۔" وہ نڈھال ہو کر جھک گئی۔

"خوب اچھے بھاگ ہوئے جن میں رونا لکھا ہو! ایسے بھاگ اٹھا کر چولھے میں جھونکو اور منش اپنے بھاگ آپ بناتا ہے۔ سنا؟"

"کوئی اپنے بھاگ بھی بنایا کرتا ہوگا۔ خوب مہیش بھیا آپ بھی۔"

"خود ہی بناتا ہے اور خود ہی بگاڑتا ہے مگر شانتا ہم سے تو تمہاری ہر وقت بسورتی شکل نہیں دیکھی جاتی۔" مہیش نے اپنی میٹھی میٹھی آنکھوں کو آدھا بند کر لیا۔

"تو نہ دیکھئے۔" شانتا نے ذرا اِتر کر کہا۔

"نہ دیکھوں! بھئی واہ خوب کہی ــــ جیسے دیکھنا نہ دیکھنا اپنے بس کی بات ہے؟"

"ہاں جب ایک چیز بُری معلوم ہو تو۔" پھر شانتا مڑ گئی۔

"شانتا ــــ تم بلنی ہو یا ــــ یا سچ ہی تم نے مجھے نہیں سمجھا" مہیش کا چہرہ رنگ بدلنے لگا۔ "شانتا تم سے کیسے کہوں۔ اوہ ــــ تم ــــ"

شانتا، شانتا سر جھکائے کشن پر پھول گنتی رہی۔

جب ایسے موقعوں پر عورتیں پھلجھڑی کی طرح ناچ پڑیں تو جا تو پھیرا الٹا پڑا۔ اور اگر خاموشی ہو تو یہ خاموشی ــــ خاموشی ہی ہے۔ شانتا میں نہ تنا پا جو وہ پھلجھڑی کی طرح چمکے اور نہ مہیش اتنا کرور بنجر زمین میں دانہ بونے لگتا۔

تو شانتا بھٹک رہی تھی! نہ جانے بھٹکنے کے کیا معنی جس دفعہ ہم بھٹک کر ٹیڑھے راستے سے سیدھے راستے پر آجاتے ہیں لیکن ہمیں احساس نہیں ہوتا۔ دنیا میں سیدھا اور ٹیڑھے میڑھے کانٹوں دار راستے سو رگ میں لے جاتے اور سیدھی سڑک پر انسان بے لاٹھی کے اندھے کی طرح بھٹکتا پھرتا ہے اور مزہ یہ کہ اُسے معلوم بھی نہیں ہوتا۔ نہ جانے لوگ سیدھے راستے کی کیوں کھوج کرتے ہیں۔ سیدھے راستے عموماً بھولے بھالے روشن اور سپاٹ ہوتے ہیں کہ گدھا بھی بنا چھیڑے چل پڑے تو پہنچ جائے مگر یہ ٹیڑھے راستے ان کی گہرائیاں، چھپے چھپے کانٹے، اونچے نیچے پتھر، ایک دُکھ، ایک ٹیس۔ یہ کہاں مل سکتا ہے؟

شانتا کے سامنے بھی دو راستے تھے۔ ایک تو وہی راستہ تھا جس پر وہ چل رہی تھی۔ پتی کی ہندوستانی بیوی بن کر جگ کی لاڈلی اور نیک اور پارسا، جہاں وہ مٹی کے ڈھیلے کی طرح لڑھک رہی تھی۔ اس سے بھی بدتر مٹی کے ڈھیلے سے کبھی کوئی گھاس پھوس کا تنکا تو اُگ آتا ہے۔ وہ بھی کبھی کسی مصرف میں آجاتا ہے۔ مگر وہ تو اور ہی کچھ تھی۔ اس ٹھنڈی چتا میں سال سے اوپر اُسے جلتے ہو گیا۔ کاش پورن کی طرح اس کو بھی کوئی روگ لگ جاتا۔ مگر روگ تو اُسے لگا ہوا تھا۔ پر یہ کیسا روگ تھا۔ جو اس کے من کو ہر وقت گدگداتا رہتا۔ اور دن بدن اُس کا جسم زیادہ لچکدار اور آنکھیں زیادہ بانونی ہوتی جا رہی تھیں۔ کیوں مہیش کے مضبوط جسم کو دیکھ کر اسے ہلکے ہلکے زلزلے جیسے ہچکولے محسوس ہونے لگتے۔ کیوں جاگتا تھا کہ وہ گوشت و پوست کا بھاری بھرکم انجن اس کی ہستی کو پیس رہا ہے۔ لیکن ایسے نہیں پیش رہا ہے کہ روح پامال ہو جائے بلکہ جیسے صندل کو سخت پتھر سے گھس دو تو وہ مہک اٹھتا ہے اسی طرح اس کی روح دل و دماغ .... پس پس کر نئے سانچوں میں ڈھل رہے تھے۔ مہیش کوئی لفنگا بدحواس اور آوارہ نہ تھا۔ اس نے کبھی کسی نیچ ترکرانی سے پریم کا ناتا نہیں جوڑا۔ اس کی بیوی موجود تھی اور دو بچے بھی۔ وہ گھر بست تھا۔ پھر یہ کون سی طاقت شانتا کو پکار پکار کر اس کی طرف کھینچے لئے جاتی تھی جیسے کھانے کی خوشبو سونگھ کر خود بخود آپ کے نتھنے جُڑے ہو جاتے ہیں۔ اور آپ لمبی لمبی سانسوں کے ذریعے لذیذ کھانوں کی خوشبو معدے میں کھینچے جاتے ہیں۔ اسی طرح مہیش کی چاپ سن کر شانتا کی روح کے دروازے چوپٹ کھل جاتے اور وہ اس کی ایک ایک بات ایک ایک آواز دل کی گہرائیوں میں جذب کر لیتی ہے۔

جس طرح رادھا جی گردھاری کی بنسری سن کر سب کچھ چھوڑ چھاڑ مکھن کی مٹکی لے کر نکل پڑتی تھیں۔ بالکل اسی طرح وہی پاک اور مقدس جذبہ شانتا کو کھینچ لاتا اور پورن کی ہستی ایک بوجھل لاش کی طرح فراموشی میں ڈوب جاتی۔

ایک بات کتنے ہولے ہولے ہوتی ہے۔ چاند کتنی خاموشی سے دبے پاؤں ننھے سے حقیر کانٹے کی شکل میں نکلتا ہے اور ذرا فوراً گھر کے کتنی جلدی بدرِ کامل بن جاتا ہے۔ کوئی اُسے بڑھتا نہیں دیکھتا۔ لیکن پورن کی آنکھیں تو چاند تو چاند دامن میں لگے ہوئے شعلوں تک کو نہ دیکھ سکتی تھیں۔ نہ جانے کتنے پاگل ہیں اُلّو بنانے کے لئے پاگل بنے۔ ہماری نادانی پر ہنستے ہوں گے۔

"جیش کوئی غنڈا تو نہ تھا جو اُسے کچھ ڈر ہوتا۔ وہ پورن کے سامنے ہی گھنٹوں شانتا سے باتیں کیا کرتا۔ مگر اس زبان میں جسے سمجھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں [illegible] دفعہ —— جب جیش شانتا کی چوڑیاں جو بہت تنگ تھیں اتار رہا تھا تو چوڑی ٹوٹ کر خون نکل آیا۔ کوئی جان بوجھ کر تو نکالا نہیں۔ مگر جب جیش نے خون چوس کر صاف کر دیا تو پورن کو تعجب ہوا۔ جب وہ اس کے ہاتھ پر جھکا ہوا تھا تو اس کی شکل بالکل بھوکے کتے جیسی تھی اور پورن کو یقین تھا کہ وہ سب خون چوس جائے گا۔ مگر شانتا بجائے زرد اور کمزور ہونے کے دوگنی سرخ ہو گئی تب جا کر پورن کو اطمینان ہوا۔

ایک دن اور اسے بہت تعجب ہوا جب اس نے دیکھا کہ ڈرائنگ روم میں شانتا صوفے پر اوندھی لیٹی تھی تو جیش نے اُسے پہلے چت کیا پھر پھول کی طرح دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ مانا کہ جیش کے ہاتھ بہت چوڑے اور لمبے تھے مگر پورن اپنے ہاتھ دیکھنے لگا۔ وہ کتنے دھبوں دار اور ٹیڑھے تھے۔ وہ یونہی آزمانے کے لئے صوفے کے پاس گیا۔ پہلے تو اس نے تکیہ کو آہستہ سے چت کیا اور پھر جلدی سے اُسے پھول کی طرح اٹھا لیا۔ اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس نے آہستہ سے تکیہ کو واپس لٹا دیا اور پیاری نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ اُسے بہت معلوم ہوا جب اس نے اپنے نوکر لچھمن کو خوفزدہ آنکھوں سے اپنی طرف دیکھتے پایا۔ پورن کی آنکھیں تو خیر چشم... ہو چکی تھیں۔ دوسروں کے تو آنکھیں تھیں اور لچھمن کی گدی میں بھی آنکھیں تھیں۔ جو چاروں طرف ناچا کرتی تھیں۔

"چھوٹے بھیا۔ کتنے دنوں سے آپ سے ایک بات کہنے کی تھی کوئی موقع نہ ملا۔ پر آج ہم نے کہا چلو کہہ ہی دیں" وہ ایک دن دروازے کی چوکھٹ پر آ بیٹھا۔

"ہوں —— کہو ——" پورن کتاب میں لائنیں گنتے ہوئے بولا۔ "کیا کہیں سرکار —— آپ کچھ نہیں دیکھت ہیں۔ کتنے کچھ جور ہت گئے ہیں یہ"

"ہاں لچھمن دوائی تو پیتا ہوں نہ"

"دوائی پیت ہو —— کا دوائی —— ہیں کہت ہوں چھوٹے بھیا ابھی ٹھیک ناہیں۔"

"کیا ——" پورن پھر لائنیں گننے لگا "کیا دوائی ٹھیک نہیں۔ تو تم ہی بتاؤ کچھ"

"اب ہم سے پوچھت ہو گی؟ کچھ گھر بار کی بھی کھبر ہے؟" لچھمن نے ذرا زور سے کہا۔

"گھر بار کی؟ ہاں لچھمن —— ہے تو —— کیوں؟"

"کھاک —— کھاک تم کا کھاک کھبر ناہیں"

"نہیں ہو گی —— مگر کیا ضروری ہے کہ مجھے خبر ہو ہی ہو۔ چلو تمہیں ہے۔ جاؤ چائے لاؤ میرے لئے —— دیکھو"

"کیوں نہیں تمہیں کا کھبر نہ ہوئے تو پھر کا —— کوئی اور تھہرے۔"

"لچھمن! چائے لاؤ —— دیکھو پتیاں کم ڈال کر۔ اس دن کی طرح کالی سیاہ نہ ہو"

"چھوٹے بھیا ——" لچھمن نے ضبط سے کہا "آپ کو معلوم ہے کسی ہے؟"

"لچھمن چائے لاؤ ——" پورن نے ضدی بچے

کی طرح کتاب میز پر پٹخ دی۔ اس کا جی چاہتا تھا زور زور سے چیخے۔ لچھمن کو اس کے دل کی خبر نہ تھی۔

"اچھا سرکار ــــ ٹھیک ــــ مگر ــــ" لچھمن بتھر میں جونک نہ لگتی دیکھ کر چل دیا۔ مگر ایک ہو۔ دو ہو تو کوئی بھگتے ــــ ایک دن ــــ"

پورن کیا کر رہے ہو" اروپ سنگھ دیر تک بیٹھنے آئے تھے۔ انھوں نے اپنا کوٹ اتار دیا۔

"میں ــــ کچھ نہیں ــــ بھیا" وہ ذرا خوش مزاج بن کر بولا۔

"پورن سنگھ ــــ تمہاری شادی کو دو سال ہونے کو آئے لیکن تمہاری حالت میں کوئی فرق نہیں۔ ڈاکٹر کہتا ہے تم بیمار ہو"

"ڈاکٹر تو گدھا ہے بھیا ــــ" پورن ذرا مسکرایا۔

"وہ کہتا ہے تم جان بوجھ کر ــــ میرا مطلب ہے یونہی وہم کرتے ہو" پورن ذرا ہوش میں آئے۔ لچھمن کہتا تھا تم خود سمجھ دار ہو" وہ ایک دم رک گئے" کیا کہتا تھا لچھمن ؟" پورن کی حالت بہتر تھی۔

"کہ ــ کہ ــ شرم کرو پورن ــــ تم مرد ہو آخر کو ــــ تم کیسے برداشت کرتے ہو"

"ہاں بھیا میں مرد ہوں ــــ کون کہتا ہے میں مرد نہیں۔ یہ ہاتھ یہ پاؤں" اس نے ذرا مذاق میں ہاتھ اٹھائے "دیکھئے۔ کھاتا ہوں، پیتا ہوں۔ دیکھئے کتنا بڑا مرد ہوں ! شادی کر کے گھر لے آیا ہے اب بھگوان نے چاہا ــــ تو"

"مجھے ــــ ہی ــــ ہی ــــ.. اوہ ــــ مجھے ــــ وہ کیوں آئے بھلا شرم کی کیا بات ہے"

"سنو ــــ اب یہ بات حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے میں جیش کا آنا جانا اور شانتا سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتا"

"وہ کیوں بھیا"

"وہ اس لئے کہ شانتا پاپ کی طرف جا رہی ہے"

"پاپ کی طرف ــــ آپ کا مطلب ہے وہ جیش سے پریم کرتی ہے اس لئے"

"کس مزے سے کہہ رہے ہو گویا کوئی بات ہی نہیں" اروپ حیرت سے بولے۔

اگر وہ جیش سے پریم کرتی ہے تو ــــ بھیا ئیے کر لینے دو۔ سنا بھیا اُسے کرنے دو" وہ بے چین ہو کر دونوں ہاتھ ملنے لگا۔

"پورن ــــ !" سنو بھیا ــــ وہ پریم کرتی ہے۔ یہی نا۔ کرنے دو اُسے" وہ جوش سے کھڑا ہو گیا۔ تم نے کبھی پریم نہیں کیا۔ تم نے کبھی ایسے پریم نہیں کیا کہ ــــ کہ ــــ تم اس میں بھسم ہو گئے ہو۔ تم نے پریم کیا کیسے ؟ بھابی سے تمہاری پر یتما تمہاری گود میں لا کر ڈال دی گئی۔ تب تم نے پریم کرنا سیکھا ــــ اور"

"اور تمہاری استری نہیں ؟ برمو شانتا تمہاری استری نہیں" وہ کچھ ہار چلے۔

"پنڈتوں کی اڑم سترم سے تو وہ میری استری ہے"

"تو پھر تم اُسے روکو" اروپ سمجھتے تھے استریاں بھی سائیکلیں ہیں کہ بریک لگا دو رک جائیں گی۔

"کیا میں روکوں ؟ نہیں بھیا۔ اُسے پریم نہیں ہو سکتا۔ تو پھر اگر وہ پریم کی بھیک کسی دوسرے سے مانگتی ہے تو کیسے روکوں ؟" آج جیسے پورن اپنی کینچلی بدل رہا تھا۔ وہ ٹھیر ٹھیر کر نہایت سلجھے ہوئے لہجہ میں وہی کچھ بول رہا تھا جو وہ سوچا کرتا تھا۔ وہ آرام لینے کے لئے کرسی پر لیٹ گیا۔

"تم پاگل ہو گئے ہو پورن !" بھیا نے غصہ سے کہا

"آج سے نہیں۔ مدت ہوئی مجھے پاگل ہوئے" پورن جیسے انتقام پر تلا ہوا تھا۔

"تمہیں خاندان کی لاج بھی پیاری نہیں"

"مجھے تو جیسا کسی قسم کی لاج اور شرم نہیں آتی۔ نہ جانے کتنے دن ہوئے میری قوت احساس ہی کچل گئی۔ مجھے اب کچھ نہیں پیدا۔" وہ تلخی سے مسکرایا اور خالی کیرم کے تختے پر ناخون بجانے لگا۔ وہ کن آنکھوں سے اروپ کو دیکھ لیتا تھا۔ جو چوٹ کھائے ہوئے ناگ کی طرح حلقہ میں بے چین تُھل رہے تھے وہ ویسے ہی تختے پر گوٹیں جما تا رہا ہے۔ اسے آج کچھ احساس فتح سے ہیکلی سی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے دکھ کا بدلہ کتنے جنون سے لے رہا تھا اور کس معصومیت سے بعض وقت چوٹ کھائی چڑیا بھی شکار کیس جاتی ہے شیر کو پھانسنے کے لئے بچھڑے کی قربانی دینا ہی ہوتی ہے۔ پورن نے جان کی بازی لگا کر یہ میدان جیتا تھا۔ بکرا تو جان سے گیا مگر شیر برا پھنسا تھا۔

مجھن نے اسی وقت اسے ایک خط لاکر دیا۔ پورن اُسے کھول کر روشنی میں دیکھنے لگا۔ "اگر ابھی ابھی آپ کو کوئی خبر دے کہ ہندوستان آزاد ہو گیا بالکل آزاد اور آپ "پریذیڈنٹ" چنے گئے ہیں یا انگریز نہیں کہ ساری جرمن فوج پر آسمان سے سورج کا ایک دہکتا ہوا ڈھما گر پڑا۔ اور وہ جل کر راکھ ہو گئے اور ہٹلر کو قطعی ریچھ نے پھاڑ کھایا تو ان کا کیا حال ہو۔ بس وہی پورن کا حال ہوا لیکن وہ اتنا چھچھورا نہ تھا وہ خاموشی سے خط پڑھ کر بولا۔

"یہ لیجئے۔" اس نے خط اروپ کے سامنے ڈال دیا اور سگریٹ سلگانے لگا۔ نہ جانے کیوں اس کے ہاتھ لرز رہے تھے مگر چہرہ پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جیسے کسی بڑے امتحان کا نتیجہ دیکھ کر دل و دماغ بے قابو ہو جائیں۔

"میں جا رہی ہوں —— میں آپ کی کوئی بھی نہیں۔ پھر بھی۔ شانتا" اروپ کے ہاتھ سے کاغذ گر پڑا پورن کو برا معلوم ہوا کہ بیوی تو اس کی بھاگے اور چھکے اروپ کے چھوٹیں!

آخر —— کو وہی ہوا —— وہ چلی گئی نا ——

جیسے!" اروپ سر سے پیر تک لرز گیا۔ ان کی اوسان کی کمیوں کی جو گت ہو گی اسے وہی محسوس کر سکتے تھے انھوں نے ایک بار پورن کو دیکھا۔ ان کے ہاتھ پیر اور کمزور ہو گئے۔ آن کی آن میں ساری کہانی فلمی زنجیر کی طرح آنکھوں کے سامنے چھن چھن گزرنے لگی۔ وہ پورن کا کھلے پھول جیسا چہرہ شرارت سے تڑپتی آنکھیں جنہیں دیکھنے کو اب وہ ترس گئے تھے۔ وہ اُسے غور سے دیکھنے لگے یہ وہی تھا، ان کو چھوٹا بھائی پورن۔ بھابی کا لاڈلا دیور، اماں کا منہ چڑھا سپوت اور بچوں کا پیارا چاچا۔ اس وقت بڑی لسی دو اکڑوا گھونٹ بنا پڑا تھا۔ وہ اگر بگاڑ نہ دیا گیا ہوتا تو اتنی ضد اس میں کہاں سے آتی؟ سچ ہے بچپن سے ہی اسے ہر بات منوانے کی عادت پڑ چکی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ آسمان کے تاروں کے لئے مچل گیا تھا

"شانتا عقل مند لڑکی تھی۔ آخر وہ کیوں خاک کے تودے میں موتی ڈھونڈنے کی کوشش کرتی۔" پورن نے خاموشی کو توڑا۔ وہ اپنی جیت کے احساس کو دبا رہا تھا۔

"پورن تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" اروپ کو خود نہیں معلوم تھا کہ وہ اور کیا کہہ سکتا تھا۔

"مر چکا —— آپ کا پورن تو کبھی کا مر چکا۔ اور اب اس مردہ پورن کی باری ہے بھیا۔ من چاہے جو کچھ کہہ لو۔ روح تو کبھی کی مر چکی۔ یہ مردہ مٹی حاضر ہے۔ یہ بھی اگر کسی کام آ سکے تو موجود ہے۔ مگر یاد رہے بھیا یہ جسم بالکل کھوکھلا ہے۔ نام کو دم نہیں۔" پورن انتقاماً مسکرایا۔

"میں نے تمہیں اپنے بچے کی طرح سمجھا پورن، اور تم ایسا کہتے ہو۔ جیسے میں نے جان کر ہی سب کچھ کیا۔"

"مگر بھیا میں نے کبھی کوئی شکایت بھی کی ہو جب ہی نا۔ جو کچھ بھی آپ نے کیا خوب کیا۔ گھر کی لاج کے لئے ایک میں کیا ہزار پورن قربان ہیں۔" طعنے دینا پورن اب بھی نہ بھولا تھا۔

پورن ـــــ میرے بچے ـــــ " رقت سے ان کا گلا گھٹنے لگا۔

وجیلا ـــــ اس میں رونے کی کیا بات ہے شکر کیجئے کہ خاندان نوزائیدہ سے بچ گیا۔ ہاں اب آپ کا بیٹا جوان ہو رہا ہے۔ بھگوان کرے وہ میری جیسی بھول میں نہ پڑے۔

کتنے ہی دان پُن کرو، یہ بھگوان کی اکڑ نہیں جاتی۔ اُدھر پُورے سے بھوانی نے بارہ راجوں کے سر مانگے تھے یہ بھگوان اتنا بھوکا کیوں رہتا ہے اس کا پیٹ ہے کہ دوزخ جو بھر ہی نہیں چکتا۔ روز ہڑپ کرتا ہے۔ ہیضہ کے مارے دق کے چبائے ہوئے، طاعون کے میلے مگر اسے کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی ملاؤ نہیں رکتی! اس کو بدہضمی بھی ہوئی۔ اب راجہ صاحب بیچارے کے چھیر رہتے تھے۔ آخر انہوں نے کس کی گئے ماری تھی۔ جوان کی بہو بھاگ پڑی۔ آخر روپ کی معصوم بیوی نے کیا گناہ کیا تھا جو اسے چار دن ہو کے گذر گئے اور روپ کی کنپٹیوں پر سفید بال پھوٹ نکلے۔

ارے سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور سارا گھر ہی سر پکڑ کر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ اب روپ کی اولاد کا کیا ہوگا؟ بہن کی سسرال میں بھی صفائی سے ناک کٹ گئی۔ جتنا جتنا اس مردود ناک کی بیوا کرو اینٹھی ہی جاتی ہے۔ کیڑے پڑیں ایسی ناک میں!

پورن اتفاقاً ایک دم زیادہ بیمار ہو گیا۔ اسے دن میں کئی کئی دفعہ خون آیا۔ اور ایک دفعہ تو سب ہی شانتا کو بھول کر پورن کو موت کے پنجوں میں سے چھیننے لگے۔ اس کا ماتھا کئی بار بھگوان کے چرنوں میں گر پڑا اور اب وہ گھر کے بیسنا پتی قلعہ کے بچاؤ میں لگ گئے۔ مگر قلعہ تو ڈھے جانے پر بے طرح تُلا ہوا تھا۔

جب میں چھوٹی سی تھی تو میں نے سڑک کے کنارے ایک ننھا سا پیڑ دیکھا: اسے اپنی کیاری میں لگاؤں گی۔ میں نے اسے پوری طاقت سے کھینچا۔ ننھی کمزور جڑیں چیخیں تنا اکڑ گیا۔ مگر میں نے اکھیڑ ہی لیا۔ ضدی جڑیں وہیں رہ گئیں۔ کیاری میں لگا کر بیرا کرنے لگی۔ دھڑ دھڑ کے پانی کے لوٹے ڈالے مگر وہ تو سوکھ ہی گیا۔ پیڑ تو پیڑ بعض وقت اچھے بھلے بوڑھے لوگ سڑ یا جاتے ہیں۔ پورن کے گھر والے بھی جڑ توڑ چکے تھے۔ مگر ضد تو دیکھو کہ پیڑ کو پھر سے لگانے اور پھل لانے کے جتن کر رہے تھے سکتے ہیں ایک پیڑ ایسا ہوتا ہے جو بغیر جڑ کے ہی لگ جاتا ہے۔ مگر پورن تو بہت ہی عام قسم کا کچا پودا تھا۔

لیجئے! کسی بوجھ بجھکڑ کو جڑ کا بھی خیال آ گیا اور وہ نئے سرے سے پیوند لگانے لگے۔ سب نے سمجھا بجھا کر روپ کو گاؤں بھیجا کہ جا کر آشا کو لے آئیں۔

آشا نے در در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اپنے ہی گاؤں میں پناہ لی۔ جب وہ ٹوٹے پھوٹے گھر میں پہنچی تو اس کا جی چاہا اس میں آگ لگا کر جل مرے۔ لیکن تھوڑی دیر میں گاؤں والوں کو پتہ چل گیا اور اس کی سہیلیاں ہجولیاں دوڑ پڑیں۔ اس پر سوالوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ اسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی لمبا سا خواب دیکھ کر جاگی ہے اور وہ جلدی جلدی اسے بھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ اُسے پورن کا خیال تو آتا تھا مگر اسی طرح جیسے بلند آسمان پر چمکتے ہوئے منور چاند کا چاندنی راتیں اس کی آنکھوں میں بری طرح کھٹکتیں۔ راموکی ماں کے لاڈ پھر سے شروع ہو گئے اور راموبھی بالوں میں چوگنا تیل ڈال کر چلنے لگا۔ وہ غور سے اس کی بھدی اداؤں کو دیکھتی اور پھر اسے پورن کا صاف ستھرا چہرہ نظر آتا۔ وہ بغیر تیل پھلیل کے چکنے، بکھرے ہوئے بالوں کے گچھے۔ وہ خوشبودار اجلے ہاتھ اور خاموش التجائیں

اور کھاد۔ بے اجاڑ کی شکل کے چپکے ہوئے بال، کھردرے، بیڑی کی بو میں بسے ہوئے ہاتھ اور ننگی بھگی خواہشیں! لیکن اگر بیٹنڈ کی بنبل سے آنکھ لڑانے لگے تو سب یہی کہیں گے کہ اسے نشہ زکام ہو گیا۔

"پورن کی طبیعت خراب ہوتی جاتی ہے" ادوپ نے اسے شانتا اور مہیش کا ڈرامہ بتلائے بغیر کہا۔ "ماتا جی اکیلی ہیں۔ تمہاری بھابی" وہ شرمائے۔

"بہو تو اچھی ہیں۔ ادوپ بھیا"

"ہاں ـــــ مگر ـــــ پورن کی تیمارداری کے لئے"

"مجھے جلتے میں تو کچھ نہیں ـــــ ماموں کی ماں کو ذرا کم دکھائی دینے لگا۔"

"آشا بہلنے کو رہی تھی۔ آخر جب بہو جی موجود تھیں اور دنیا میں نوکروں کی کمی نہیں۔ تو پھر آخر وہ کیوں یاد آئی۔ آم کھائے کوئی اور بات گننے آشا۔

"بہو تو ـــــ وہ میکے گئی ہوئی ہیں"

"اچھا؟ ـــــ کیا کوئی ـــــ اُمید ہے" آشا کے دل میں چوٹ لگی۔

"ہاں ـــــ وہ ان کی ماں بیمار ہیں" ادوپ پٹپٹایا "تم گھر چلو سب معلوم ہو جائے گا۔ آشا" وہ کچھ کہتے کہتے رک سے گئے۔

جب پورن کو معلوم ہوا کہ آشا آ رہی تو وہ جھنجلا اٹھا۔

"بھابی ـــــ یہ تم لوگ کب تک میرے سنگ کھیل کرتے رہو گے تم مجھے چین سے مرنے بھی نہ دو گے!" وہ بڑبڑایا۔ لیکن بھابی نے اُسے ایسے انداز سے دیکھا کہ وہ چپ ہو گیا۔ شام کو اس کا بخار اور بڑھ گیا وہ گھبرا گھبرا کر بڑبڑانے لگا۔ "کتنی آگ ہے ـــــ لال لال ـــــ بھابی لال پردہ ہٹا دو۔ یہ لال پھول کاٹتے ہیں دل کو۔ چمکی سے کہو میرا سر گھوم گیا اتنی جلدی جلدی نہ ناچے ـــــ

اس سے کہو میری دراز کھولے۔ وہ نہیں آئے گی۔ وہ کیوں آئے گی۔ کیا میں اُسے کھا جاؤں گا" وہ آپ ہی آپ مسکرائے "دبلی پتلی لڑکی سے اتنا کام نہ لیا کریں۔ بھابی ـــــ ماتا جی سے کہو اس سے اتنا کام نہ لیں۔

"چپ ہو جاؤ۔ پورن ڈاکٹر کہتا ہے اتنی باتیں نہیں کرنی چاہئیں" یہ بھابی ڈر جاتی ہے۔

"ڈاکٹر تو اُلو ہے، وہ کیا جانے۔ پاجی کہیں کا۔ مجھے بولنے نہیں دیتا۔ بھابی وہ مجھے دیکھ کر کیا کہے گی۔ اس سے نہ کہہ دینا بیمار ہوں۔ سنا وہ کیا کہے گی"

"آشا آ گئی ہے۔ پورن" پورن کے مردہ چہرے پر شرمانے سے سرخی دوڑ گئی۔ بھابی اُسے چھیڑ رہی تھی۔ آج اُسے آشا کے خیال سے کتنی پیاری شرم آ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا ابھرا ہوا جی ہلکی ہلکی گدگدیوں سے جی ہی اُٹھے گا۔ اس نے ایک بار اپنے سوکھے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا کتنے بدوضع ہو گئے تھے۔ مگر یہ پیر کیوں چکنے اور تندرست ہو گئے تھے۔ اسے اپنی پتلی پتلی ٹانگوں میں یہ تندرست پیر بہت برے لگے۔ ان کی تندرستی کس قدر گھناؤنی تھی۔ پیلی پیلی پیپ کے رنگ کی، جب بھابی چلی گئی۔ اس میں جان آ گئی۔ یہ بھابی بہت شریر تھی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آئینہ کے پاس پہنچا۔ لیکن اس کے اوپر جیسے چھت ٹوٹ پڑی۔ سوکھا مارا قبر کا مردہ، جیسے کسی دیوانے کی شکل نکل کھڑی ہو۔ وہ شرارت جو آشا کے خیال سے اس کے چہرے پر ناچ رہی تھی مرگھٹ کی بھتنی کی طرح اُسے اور بھی بھیانک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ غور سے قدرت کی کاریگری کو دیکھنے لگا۔

ڈرتے ڈرتے اُس نے سوکھی ہوئی کنپٹیوں اور گردن کی رگوں کو چھوا۔ میز پر کتنی سنگھار کی چیزیں رکھی تھیں! مگر ایک تو اس مردے کو سجانے کے لئے اچھی نہ تھی۔ اس نے کنگھا اٹھایا مگر وہ بالوں سے نہ لڑ سکا بال اور بھی

زیادہ وحشی اور گھنے ہو گئے تھے۔ دروازے پر کھٹکا ہوا اور وہ جلدی سے مڑا۔

آشا نے بمشکل اس بھیانک مجسمہ کو دیکھ کر خود کو روکا لیکن وہ اُسے لڑکھڑاتا ہوا دیکھ کر جلدی سے لپکی۔ اُسے سوکھے سوکھے ہاتھوں نے آسیب بھوکے درندے کی طرح جکڑ لیا۔ اور سوکھی پسلیاں گُٹھل چھڑیوں کی طرح اس کے سینے میں گھسنے لگیں۔ اس نے ایک بار اپنی ساری طاقت اُسے سنبھالنے میں لگا کر پلنگ کے قریب کیا۔ پورن سمجھا وہ اُسے الگ کر رہی ہے اور وحشیوں کی طرح اُسے بھینچنے لگا۔

یہ وہی پورن تو تھا جس کی انگلی بھی اگر آشا سے چھو جاتی تھی، تو اس کے جسم میں آگ بھڑک اٹھتی تھی اور اس آگ میں وہ تمتما جاتی تھی مگر آج جیسے کوئی برف کے کوڑوں سے اس کے سارے جسم کو دھن رہا تھا۔ مگر آج وہ سب کچھ بھول کر بے حیائی سے اس سے لپٹ گئی۔ ناز نخروں کا وقت بیت چکا تھا۔ اس نے اس کے سوکھے مرے ہاتھوں کو کلیجہ سے لگا لیا۔ اور اس کے خالی ڈھول جیسے سینے میں منہ دھنسا کر اس میں گرمی ڈھونڈھنے لگی۔ اُسے محسوس ہوا جیسے ان ہڈیوں کے پنجرے میں انجن چلنا شروع ہوا۔ دبی ہوئی گھٹی گھٹی گرمی۔ ایک خاموش شور۔ آتش فشاں پہاڑ کے دامن میں جیسے پگھلی ہوئی آگ چنگھاڑتی ہوئی زخمی بلی کی طرح اور پھر زلزلہ جیسے جھٹکے جنھوں نے تختہ اُلٹ دینے کا ارادہ کر لیا ہو! ایک جھٹکے کے ساتھ نظام درہم برہم ہو گیا اور آگ بہہ نکلی۔ وہ چونک کر اٹھی اس کا سر گھوم رہا تھا۔ جیسے کسی نے بہت سی چک پھیریاں دے کر اُسے چٹیل میدان میں چھوڑ دیا ہو۔ اس نے سہارا لینے کی کوشش نہ کی۔ جلدی سے اس نے کمرے کی کنڈی چڑھائی اور میز پر سے سینے پر مالش کرنے کی پوری شیشی حلق میں انڈیل لی۔ تھوکتی کھانستی وہ جلدی جلدی بستر کو درست کرنے لگی۔ اس نے ساری کرسیاں اور میزیں پلنگ کے چاروں طرف گھسیٹ دیں پھر جلدی جلدی الماریوں میں سے کپڑے نکال نکال کر اُن پر پھیلا دیئے۔ بیچ کی دراز میں جو اس نے ہاتھ ڈالا تو جیسے اُسے سانپ نے ڈس لیا۔ سوکھے ہوئے سرخ پھول اب بھی سفید کپڑوں میں دبے رکھے تھے۔ اس نے بڑے آہستہ سے ایک ایک پتی اٹھائی اور انہیں پورن کے سینے پر رکھ دیا کونے سے رات کو دھیمی روشنی دینے والا لیمپ اٹھا کر چاروں طرف تیل چھڑکا اور پھر وہ ایک نئی دلہن کی طرح سیج پر چڑھ گئی۔ اوہ ——— شرم کی تو فرصت بھی نہ تھی۔ اُسے اس مردہ خون کے لعاب سے گھن بھی نہ آئی جو اس کی ٹھوڑی پر بہہ آیا تھا۔ کوئی اس کا کلیجہ کانٹوں دار خونوں سے چھیل رہا تھا۔ ہاتھوں کی سکت جاری تھی۔ اس نے دیا سلائی لے کر چاروں طرف تیل میں آگ لگا دی۔ اور پورن کی آغوش میں لیٹ گئی۔ ابھی سوکھے ہوئے پھولوں کے پاس جو اس کے سینے پر لالے کے تختے طرح لہلہا رہے تھے!

"قافلہ" کا خلیل جبران نمبر
پندرہ اپریل کو شائع ہو رہا ہے

شاہکار افسانوی تحریک

اِس ادبی تحریک کے تحت **قافلہ** ڈائجسٹ ہر ماہ ایک خاص نمبر پیش کرتا ہے

---

۱ — **کرشن چندر نمبر** —— منفرد افسانہ نگار کے منفرد افسانے = ۱۰ روپے

۲ — **منٹو نمبر** —— البیلے افسانہ نگار کی البیلی کہانیاں = ۶ روپے

۳ — **عصمت چغتائی نمبر** —— چُلبلی افسانہ نگار کے چُلبلے افسانے = ۶ روپے

۴ — **شاہکار افسانہ نمبر** —— ۱۹۷۹ء کی بہترین پاکستانی کہانیاں = ۶ روپے

۵ — **خلیل جبرانؒ نمبر** —— عرب ادیب و دانشور کی منتخب تحریریں = ۱۰ روپے

۶ — **اُردو کا عظیم افسانہ نمبر** (حصہ اوّل) —— آزادی سے پہلے = ۱۰ روپے

۷ — **اُردو کا عظیم افسانہ نمبر** (حصہ دوم) —— آزادی کے بعد = ۱۰ روپے

پیش کش : **مکتبہ شاہکار**، پوسٹ بکس ۱۷۵۴، لاہور

سرورق : ایشین آرٹ پریس، ۱۲۔ میکلوڈ روڈ، لاہور

نمبر ۱۳۰/۸ — واقعہ — دنیا کی ہر زبان، ہر ادب اور ہر عہد کی کہانیوں کا نمبر